بھارت کے
فرعون
فوجی کیمپ سے فرار
اے حمید
50

دروازے پر زور زور سے دستک ہو رہی تھی۔
باہر سے کسی نے چلا کر کہا۔
"اردلی! دروازہ کھولو۔ جلدی کرو"
سیکرٹ فائل میں نے الماری میں بند کر کے تالا لگا دیا تھا۔ میں نے دوڑ کر دروازہ کھولا۔ باہر ایک سکھ صوبیدار اور دو گورکھا فوجی کھڑے تھے۔ سکھ صوبیدار کو معلوم تھا کہ میں میجر شرت کا چھوٹا بھائی ہوں۔ اس نے کہا۔
"سر! آپ کے باتھ روم سے دھواں نکل رہا ہے"
اور تینوں فوجی بڑی تیزی سے باتھ روم کی طرف دوڑ پڑے۔ ایک گورکھا فوجی کے ہاتھ میں آگ بجھانے والا سپرے سلنڈر بھی تھا۔ میں بھی ان کے پیچھے دوڑا۔ معلوم ہوا باتھ روم کی بتی میجر شرت جلتی چھوڑ گیا تھا اور کسی وجہ سے بجلی کے تار شارٹ ہو گئے اور انہیں آگ لگ گئی تھی۔ ابھی صرف دھواں ہی نکل رہا تھا۔ فوراً آگ بجھا دی گئی۔ سکھ صوبیدار بولا۔
"سر! ہمارے لانس نائیک نے باہر سے دھواں نکلتا دیکھا تو رپورٹ کی۔ صبح الیکٹریشن آ کر نئی تاریں لگا دے گا۔"
جب تینوں بھارتی فوجی چلے گئے تو میں کچھ دیر وہیں کمرے میں رہا۔ اس کے بعد خاموشی سے باہر نکل کر کمرے کو تالا لگایا اور ہاتھ پتلون کی جیبوں میں دے کر اپنے فوجی کینٹین والے کمرے کی طرف چل پڑا۔

کمانڈو اورنگ زیب بے چینی سے میرا انتظار کر رہا تھا۔ میں نے اسے جا کر ٹاپ سیکرٹ فائل سے نقل کئے ہوئے پوائنٹس دکھائے تو وہ بولا۔

"یہ بڑی کار آمد معلومات ہیں ۔ خاص طور پر کھاڑی کے چٹان پر مارٹر توپوں اور جہازوں کے گرد لگے فولادی تاروں کا معلوم ہو جانا ہمارے لئے بہت مفید ثابت ہو گا"

میں نے کہا۔

"ایک جہاز پر ایسی گنیں بھی لگی ہیں جو خطرے کے وقت سمندر میں پھٹنے والی بارودی سرنگیں فائر کرتی ہیں"

کمانڈو اورنگ زیب بولا۔

"ہمیں یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ ان جہازوں کے اردگرد جن فولادی تاروں کا جال پھیلایا گیا ہے ان کی نوعیت کیسی ہے۔"

میں نے کہا۔

"چاہے جیسی بھی ہو۔ ہمیں بہرحال سمندر کے اندر جا کر ان تاروں کو کٹروں سے کاٹنا ہو گا۔"

"وہاں انڈین نیوی کی کوسٹ گارڈز بھی ہو گی۔ اس کمانڈو مشن پر ہمیں کسی اندھیری رات کو جانا ہو گا۔ لیکن آکسیجن ماسک کے بغیر ہم اپنے ٹارگٹ پر نہیں پہنچ سکیں گے کیا اس کے بارے میں بھی تم نے غور کیا ہے؟"

میں غور کر چکا تھا۔ میں ایک تربیت یافتہ کمانڈو کی حیثیت سے اپنے مشن پر روانہ ہو رہا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ ہمیں پانڈی چری کی کھاڑی جیا گامی میں کھڑے اسرائیل کے ان دو بحری جہازوں کو سمندر میں ڈبونا ہے جو امریکہ اور اسرائیل کی حکومت کی طرف سے پاکستان پر حملہ کرنے کے لئے بھارت کو دیا گیا بھاری مقدار اور تعداد میں خطرناک اسلحہ لے کر آئے ہیں ۔ میں نے کمانڈو اورنگ زیب سے کہا۔

"اس کا انتظام ہمیں ترچناپلی کی بندرگاہ پر جا کر خود کرنا ہو گا"

کمانڈو اورنگ زیب کو اتنے بڑے کمانڈو مشن کا پہلے کوئی تجربہ نہیں تھا۔ اگرچہ اس

میں جذبہ موجود تھا اور وہ پاکستان' آزادی کشمیر اور اسلام کی خاطر ہر وقت جان قربان کرنے کو تیار تھا مگر اتنا بڑا بحری کمانڈو مشن اس کے لئے بالکل نیا تھا۔ میں اس سے پہلے دوارکا کا فوجی قلعہ بھوپال ریلوے لائن پر بھارتی ملٹری کی ایمونیشن ٹرین کو اڑا چکا تھا۔

کمانڈو اورنگ زیب کچھ دیر میری طرف دیکھتا رہا۔ پھر بولا۔

"یہاں سے نکلنے کا ہمارا کیا پروگرام ہے؟"

یہ پروگرام بھی میں نے سوچ لیا ہوا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ جب پانڈی چری کی بندرگاہ پر اسلحہ سے لدے ہوئے جہاز سمندر کی تہہ میں غرق ہو جائیں گے تو بھارتی فوجی ہائی کمانڈ میں بھونچال آجائے گا اور اس کی رپورٹ اسی وقت ناگ پور کے فوجی ہیڈ کوارٹر میں ملٹری انٹیلی جینس کے میجر شرت دیوان کو مل جائے گی اور میری اس وقت عدم موجودگی اس کو شک میں مبتلا کر سکتی تھی۔ اگرچہ اس کا امکان بہت ہی کم تھا۔ کیونکہ میجر شرت کبھی سوچ بھی نہیں سکتا کہ میں جو کہ ایک عام سا سویلین نوجوان ہوں انڈیا کے نیول سیکورٹی کو تہس نہس کرتا ہوا دو اتنے بڑے جہازوں کو سمندر میں غرق کر سکتا ہوں لیکن مجھے اسی طرح سوچنا چاہئے تھا۔ اس کی پیش بندی مین نے یوں کر لی تھی کہ میجر شرت کو کہہ دیا تھا کہ میرا بھائی ورنگل کی کسی فیکٹری میں کام کرتا ہے۔ اور میں اسے چھوڑنے اس کے ساتھ ہی ورنگل جا رہا ہوں اور کچھ دن ورنگل کی سیر کرنے کے بعد واپس آؤں گا۔ چنانچہ میں نے اورنگ زیب سے کہا۔

"ہم کل صبح یہاں سے چل پڑیں گے۔"

کمانڈو اورنگ زیب کی شکل بتا رہی تھی کہ وہ اس اہم ترین کمانڈو مشن کے انتظامات سے مطمئن نہیں ہے۔ اسے مطمئن ہونا بھی نہیں چاہیے تھا۔ کیونکہ ہمارے پاس کوئی انتظام نہیں تھا۔ صرف بارہ بارہ چھوٹے مگر انتہائی طاقتور چاکلیٹ سائیز کے میگنٹ بم تھے جنہیں ہم نے سمندر کے اندر سے ہو کر بحری جہازوں تک جا کر ان کے پیندے کی فولادی چادروں سے چپکانا تھا۔ کہنے کو تو یہ بڑا سیدھا سا کام تھا مگر جہاں سمندر میں آس پاس بھارتی نیوی کے جنگی جہاز کھڑے ہوں ۔ کوسٹ گارڈز کی مشین گنوں سے

لیس بوٹیں چکر لگا رہی ہوں۔ جہازوں کے اوپر گارڈز دن رات پہرہ دے رہے ہوں جہازوں پر بارودی سرنگیں فائر کرنے والی گنیں لگی ہوں اور جہازوں کی حفاظت کے لئے چٹانوں پر مارٹر گنوں اور مشین گنوں کی پوسٹیں ہوں اور جہازوں کے اردگرد فولادی تاروں کا جال بچھا ہو اور ہمارے پاس معمولی استعمال کے آکسیجن ماسک بھی نہ ہوں تو یہ ٹارگٹ ناممکن لگتا تھا۔ لیکن وہی بات میں پھر دہراؤں گا کہ اگر دل میں جذبہ ہو اور ٹارگٹ مارنے کا یقین ہو تو قدرت سارے وسائل پیدا کر دیتی ہے۔

جب کمانڈو اورنگ زیب نے وسائل کی کمی کا اظہار کیا تو میں نے اس سے کہا۔

"وسائل صفر ہیں۔ یہاں سے ہم کوئی چیز حاصل نہیں کر سکتے۔ ہمارے پاس میگنٹ بم اور کمانڈو چاقو کے سوا اور کچھ نہیں۔ اس کے باوجود ہمیں اس مشن کو ہر حالت میں اور اپنی جان کی بازی لگا کر کامیاب بنانا ہے۔ ہم کل صبح ناگ پور سے جو ٹرین بھی ملی اس میں سوار ہو کر پانڈی چری کی طرف روانہ ہو جائیں گے۔ آگے اللہ مالک ہے۔ اب تم بھی سو جاؤ میں بھی سوتا ہوں۔"

صبح ہم جلدی اٹھے۔ میں نے کیپٹن کے اسسٹنٹ جگدیش کو شام کو ہی بتا دیا تھا کہ میں اپنے بھائی کے ساتھ ورنگل جا رہا ہوں۔ میجر شرت دیوان کو پہلے ہی میں بتا چکا تھا۔ چنانچہ ہم فوجی ہیڈ کوارٹر سے نکل کر سٹیشن کی طرف چل پڑے۔ ابھی صبح نہیں ہوئی تھی۔ پو پھٹ رہی تھی۔ ایک جگہ سے ٹیکسی مل گئی۔ اس نے ہمیں سٹیشن پر پہنچا دیا۔ ناگ پور وسطی بھارت کا بہت بڑا ریلوے جنکشن ہے۔ وہاں سے کئی طرف کو گاڑیاں جاتی رہتی ہیں۔ معلوم ہوا کہ پانڈی چری کی گاڑی دن کے نو بجے روانہ ہو گی۔ اتنی دیر ہم پلیٹ فارم پر ہی ایک طرف بیٹھے اپنے مشن کے بارے میں باتیں کرتے رہے۔ تھرڈ کلاس کمپارٹمنٹ کے دو ٹکٹ ہم نے لے لئے تھے۔ کمانڈو چاقو اور خطرناک میگنٹ بم چھ میری پتلون کی پچھلی جیب میں تھے اور چھ بم کمانڈو اورنگ زیب نے اپنی جیکٹ میں چھپا کر رکھے ہوئے تھے۔

گاڑی ساڑھے نو بجے پانڈی چری کی طرف روانہ ہوئی۔ یہ بڑا طویل سفر تھا۔ آپ

بھارت کا نقشہ اٹھا کر دیکھیں۔ آپ کو معلوم ہو گا کہ ناگ پور انڈیا کے بالکل وسط میں ہے اور وہاں سے نیچے پانڈی چری طویل فاصلے پر انڈیا کی مشرقی گھاٹ پر مدراس سے بھی نیچے ایک بندرگاہ ہے۔ یہ سفر دو دن اور دو راتوں میں طے ہوا۔ ہم پہلے بھارت کے صوبہ آندھرا پردیش سے گزرے۔ پھر تامل ناڈو کے صوبے میں داخل ہو گئے۔ ناگ پور سے آگے جو بڑے بڑے شہر آئے وہ اس طرح تھے۔ ناگ پور سے چلے تو بڑا شہر چندرا پور آیا۔ وہاں سے ورنگل شہر آیا۔ یہ آندھرا پردیش کا مشہور شہر ہے۔ ورنگل سے نکلے تو آندھرا پردیش کا شہر گنٹور آیا۔ یہاں سے ٹرین نیلور پہنچی یہ بھی تامل ناڈو کا مشہور شہر ہے۔ نیلور کے آگے تامل ناڈو صوبے کا صدر مقام مدراس آگیا۔

مدراس اس سے پہلے میں دیکھ چکا تھا۔ ہم سٹیشن پر ہی رہے۔ مدراس سے دوسری ٹرین پکڑی اور کانچی پورم شہر سے ہوتے ہوئے پانڈی چری پہنچ گئے۔ پانڈی چری جس وقت ٹرین پہنچی تو دن کے چار بجے کا ٹائم تھا۔ یہاں موسم گرم تھا۔ دھوپ نکلی ہوئی تھی۔ ہماری جیکٹیں ٹھنڈے کپڑے کی تھیں۔ پھر بھی ہم نے اس کے بٹن کھول دیئے تھے۔ ہوا چل رہی تھی جس کی وجہ سے گرمی کا زیادہ احساس نہیں ہو رہا تھا۔ کمانڈو اورنگ زیب بھارت کے دور جنوبی علاقے میں پہلی بار آیا تھا۔ کہنے لگا۔

"ہمارے کشمیر میں تو سخت سردی پڑ رہی ہے اور یہاں لوگ گلے میں صرف بنیانیں پہن کر پھر رہے ہیں"

میں نے کہا۔

"یہ جنوبی بھارت کا علاقہ ہے۔ یہاں دسمبر کے مہینے میں بھی دن کو موسم گرم رہتا ہے۔ صرف رات کو ہلکی سی خنکی ہو جاتی ہے وہ بھی برائے نام"

"اسی لئے یہاں کے لوگوں کے رنگ کالے ہیں"

جنوبی بھارت میں آپ کو کوئی آدمی کوئی عورت گورے رنگ کی نہیں ملے گی۔ سب کے رنگ کالے ہوتے ہیں۔ یا پھر گہرے سانولے رنگ ہوتے ہیں۔ گورا رنگ ناگ پور سے اوپر ہی رہ جاتا ہے۔ یہاں کا موسم گرم مرطوب ہوتا ہے۔ بارشیں خوب ہوتی ہیں۔

لوگوں کی خوراک چاول ہے۔ روٹی بھی چاول کے آٹے کی کھاتے ہیں۔ اس روٹی کو وہ چلہ کہتے ہیں۔ سرخ مرچیں بہت زیادہ کھاتے ہیں۔ ہوٹلوں اور ریستورانوں میں چاول کے ساتھ سرخ مرچیں پانی میں گھول کر ساتھ رکھ دی جاتی ہیں۔ چھوٹے ریستورانوں میں چاول پلیٹوں کی بجائے کیلے کے پتوں پر ڈال کر رکھ دیئے جاتے ہیں۔ ہمیں بھوک لگ رہی تھی۔ ہم ایک چھوٹے سے ہوٹل میں جا کر بیٹھ گئے۔

ہوٹل کا کالا کالا لڑکا ہمارے لئے چاول کا برتن لے کر آگیا۔ اس نے پہلے کیلے کے پتے ہمارے سامنے میز پر بچھائے۔ پھر اس کے اوپر ایک طرف چاول ڈالے۔ ایک طرف سبزی دال اور ایک چھوٹی پیالی میں گھلی ہوئی سرخ مرچوں کی لا کر رکھ دی۔ ہم نے سرخ مرچوں کو ہاتھ بھی نہ لگایا اور سبزی کے ساتھ چاول کھا کر ہوٹل سے باہر آگئے۔ ہوٹل میں اگر بتیاں سلگ رہی تھیں اور ویشنوں اور گنپتی دیوتا کی تصویروں کے آگے لوبان بھی سلگ رہا تھا۔ جس کی وجہ سے فضا بہت بوجھل تھی۔ جنوبی ہند کے شہروں میں مسلمانوں کی بھی بھاری تعداد آباد ہے اور یہ مدراسی مسلمان ہیں جن کو موپلے بھی کہا جاتا ہے۔ ان شہروں میں بڑی بڑی مسجدیں ہیں۔ ان بزرگان دین کے مزار بھی ہیں جو ابتدائی ایام میں مسلمان عرب تاجروں کے ساتھ یہاں آئے اور انہوں نے اسلام کی تبلیغ کی اور بتوں کی پوجا کرنے والے ہندوؤں کو مشرف بہ اسلام کیا۔ ابتدائی دور کے عرب تاجروں کی آمدورفت کی وجہ سے یہاں پر مسلمانوں کی کلچر کی نشانیاں بھی عام ملتی ہیں۔ ان کی زبان میں عربی کے الفاظ بھی ہیں اور یہ لوگ بریانی بالکل شمالی ہند کے مسلمانوں کی طرح بناتے ہیں۔ دوسری اہم بات یہ ہے کہ جنوبی ہند میں شمالی بھارت کی نسبت تعلیم کا معیار بہت بلند ہے۔ انگریزی ہر سکول میں پہلی جماعت سے پڑھائی جاتی ہے۔ تامل تلیگو زبانوں کے ساتھ ہندوستانی اور اردو بھی بولی جاتی ہے۔ یہاں کے لوگ انگریزی عام بول لیتے ہیں۔ اگر کوئی مدراسی اردو نہیں جانتا تو وہ آپ سے انگریزی میں بات کرے گا۔

کھانا کھانے کے بعد ہم پانڈی چری کے بازاروں میں ادھر ادھر پھرتے رہے۔ میں نے کمانڈو اورنگ زیب سے کہا۔

"ہمیں ٹھہرنے کے لئے یہاں کوئی ایسی جگہ تلاش کرنی ہوگی جو بندرگاہ کے قریب ہو اور جہاں ہمیں دیکھنے والے زیادہ لوگ نہ ہوں"

کمانڈو اورنگ زیب نے پوچھا۔

"ایسی کونسی جگہ ہو سکتی ہے؟"

مجھے معلوم تھا کہ مدراس میں مدراسی مسلمانوں کی تین چار سرائیں ہیں جہاں مسافر آکر ٹھہرتے ہیں۔ ان علاقوں میں ابھی تک سراؤں کا وجود باقی تھا۔ شاید یہ قدیم عرب تاجروں کی وجہ سے تھا جو بصرہ بغداد سے آکر یہاں سراؤں میں آکر ٹھہرا کرتے تھے۔ مدراس میں ایک سرائے تھی جس کا نام سراج سرائے تھا۔ میں نے اس سرائے میں تین دن گزارے تھے۔ یہ سستی بھی ہوتی ہیں اور یہاں عام طور پر مزدور پیشہ مسافر لوگ آکر دو تین دن ٹھہرتے ہیں اور پھر چلے جاتے ہیں۔ میں نے کمانڈو اورنگ زیب سے جب سرائے کا ذکر کیا تو وہ حیران ہو کر کہنے لگا۔

"یہ شہر تو بڑا ماڈرن شہر لگ رہا ہے یہاں سرائے ہمیں کہاں ملے گی"

میں نے اسے ساری بات سمجھائی تو وہ کہنے لگا۔

"کیا یہاں ہمیں کوئی ایسی سرائے مل جائے گی جو شہر سے باہر بھی ہو اور بندرگاہ کے قریب بھی ہو؟"

میں نے کہا۔

"اگر مل گئی تو بہتر ہے۔ تلاش کر لیتے ہیں۔ اگر نہ ملی تو دو ایک دنوں کے لئے شہر کے اندر کسی سرائے میں ٹھہر جائیں گے"

سرائے پر میں اس لئے زور دے رہا تھا کہ وہاں کرایہ سستا ہوتا ہے۔ ہوٹل ان شہروں میں بڑے مہنگے ہوتے ہیں اور ہوٹلوں میں عام طور پر خفیہ پولیس کے آدمی ضرور منڈلا رہے ہوتے ہیں۔ پانڈی چری شہر ہمارے لئے بالکل اجنبی تھا۔ جنوبی ہند کی فضا اور لوگ ان کی زبان میرے لئے اجنبی نہیں تھے۔ بازار اجنبی تھے۔ ہم چلتے چلتے ایک چوک میں آکر کھڑے ہو گئے۔ بازاروں میں رکشا ٹیکسیوں کے علاوہ بیل گاڑیاں بھی چل رہی

تھیں۔ ان بیل گاڑیوں میں رکشا ٹیکسی کی طرح سواریاں بیٹھتی تھیں۔ میں نے کمانڈو اورنگ زیب سے کہا۔

"تم یہیں ایک منٹ ٹھہرو"

سامنے پان سگریٹ کی ایک چھوٹی سی دکان تھی۔ وہاں کھمبے کے پاس ایک دبلا پتلا نوجوان سفید قمیض پتلون پہنے کھڑا شاید کسی کا انتظار کر رہا تھا۔ میں نے اس کے پاس جا کر یونہی السلام وعلیکم کہہ دیا کہ اگر مسلمان نکل آیا تو اچھا ہے۔ اتفاق سے وہ مسلمان تھا۔ اس نے وعلیکم السلام کہہ کر میری طرف دیکھا۔ میں نے اس سے انگریزی میں پوچھا۔

"یہاں کوئی سرائے مل جائے گی جہاں رات گزار سکوں؟"

اس نے انگریزی میں پوچھا۔

"تم کہاں سے آئے ہو؟"

میں نے کہا۔

"پنجاب سے پانڈی چری شہر کی سیروسیاحت کرنے آیا ہوں۔ میرے پاس اتنے پیسے نہیں ہیں کہ کسی ہوٹل میں ٹھہر سکوں۔ مجھے جالندھر میں کسی نے بتایا تھا کہ مدراس اور پانڈی چری میں ایسی سرائیں مل جاتی ہیں جن کا کرایہ سستا ہوتا ہے۔"

وہ لڑکا بولا۔

"پانڈی چری میں تین سرائے ہیں۔ ان تینوں کو مسلمان چلاتے ہیں۔"

میں نے کہا۔

"اگر کوئی سرائے سمندر کے قریب مل جائے تو بڑا اچھا ہے۔ سمندر کی سیر بھی ہو جائے گی"

وہ لڑکا کہنے لگا۔

"اچھا۔ تو پھر ایسا ہے کہ یہاں سے تم پانڈی چری جیٹی کو جانے والی بس میں سوار ہو جاؤ۔ کنڈکٹر سے کہنا تمہیں رائل سینما کے سٹاپ پر اتار دے رائل سینما کے پیچھے ناریل کے درختوں والا ایک بازار ہے۔ وہاں اشرفیہ سرائے ہے۔ یہ سرائے سمندر کے قریب

بھی ہے اور وہاں کرایہ بھی بہت کم لیتے ہیں۔"

میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور ساری بات کمانڈو اورنگ زیب کو جا کر بتائی اور ہم وہیں سے ایک بس میں سوار ہو گئے۔ میں نے بس کنڈکٹر کو بتا دیا کہ ہمیں رائل سینما والے سٹاپ پر اتار دے۔ ہم رائل سینما کے بس سٹاپ پر اتر گئے۔ اس کے پیچھے آئے تو ایک کشادہ بازار تھا جس کے فٹ پاتھ کے ساتھ ساتھ اونچی اونچی چھتریوں والے ناریل کے درخت ہوا میں لہرا رہے تھے۔ یہ شام کی ہوا تھی جو سمندر کی طرف سے چل رہی تھی۔ ہوا میں سمندر کی نمی خاص طور پر محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے کمانڈو اورنگ زیب سے کہا۔

"ہم سمندر کے قریب آ گئے ہیں۔ اب اشرفیہ سرائے تلاش کرتے ہیں"

بازار میں دکانیں کھلی تھیں۔ شاپنگ سٹور بھی۔ بید اور بانس کے فرنیچر کی بڑی بڑی دکانیں بھی تھیں۔ ریستوران بھی تھے جن میں بتیاں روشن ہو گئی تھیں اور تامل فلموں کے گانوں کی ریکارڈنگ ہو رہی تھی۔ سانولی، گہری سانولی، کالی لڑکیاں اور عورتیں ساڑھیوں میں ملبوس آ جا رہی تھیں۔ پتلون قمیض والے آدمی بھی تھے۔ اور ایسے مزدور ٹائپ آدمی بھی تھے جنہوں نے صرف بنیان پہنے ہوئے تھے اور دھوتیاں جنہیں یہاں لنگی کہا جاتا ہے۔ نیچے سے اٹھا کر گھٹنوں پر کر رکھی تھیں۔ کافی آگے جا کر میں نے ایک ویڈیو کی دکان سے اشرفیہ سرائے کا پوچھا۔ یہ سرائے وہاں سے قریب ایک گلی میں تھی۔ گلی کافی کشادہ تھی۔ ایک بوسیدہ سی پرانی بلڈنگ کے باہر اردو اور تامل زبان میں اشرفیہ سرائے کا چھوٹا سا بورڈ لٹک رہا تھا۔ ڈیوڑھی میں تخت پوش پر ایک سفید خشخشی ڈاڑھی والا گہرے سانولے رنگ کا بوڑھا دھوتی اور بنیان پہنے چھوٹی سی صندوقچی کے پاس بیٹھا بیڑی پی رہا تھا۔ میں نے جا کر سلام کیا تو اس نے خوش ہو کر وعلیکم السلام کہا اور تامل زبان میں کچھ پوچھا۔ میں نے شکستہ ہندوستانی میں کہا کہ میں تامل زبان نہیں جانتا۔ وہ مسکرا کر اردو میں بولا۔

"تو پھر اردو میں بات کرو۔ ہم اردو زبان بھی جانتا ہے بابا۔"

میں نے کہا۔

"جی ہم دو دوست پنجاب کے شہر مالیر کوٹلہ سے آئے ہیں۔ ہم مسلمان ہیں۔ پانڈی چری کی سیر کرنے کا ارادہ لے کر نکلے تھے۔ آپ کی سرائے میں کوئی سستا سا کمرہ مل جائے گا؟"

بوڑھا مدراسی کہنے لگا۔

"بابا! یہاں سب کمروں کا ایک ہی کرایہ ہے۔ تم بولو۔ ایک کمرہ لو گے یا دو کمرے لو گے۔"

میں نے کہا۔

"ہمیں ایک کمرہ ہی کافی رہے گا۔ صرف اس میں ایک فالتو چارپائی کی ضرورت پڑے گی۔"

وہ بولا۔

"وہ ہم ڈال دیں گے۔"

پھر اس نے صندوقچی میں سے ایک کاپی پنسل نکالی اور بولا۔

"نام بتاؤ۔"

میں نے اپنے اور کمانڈو اورنگ زیب کے مسلمانوں والے فرضی نام بتائے۔ اس نے کاپی پر لکھ لئے اور کاپی بند کر کے کہنے لگا۔

"ایک کمرے کا دن رات کا کرایہ پانچ روپے ہو گا۔ تم کتنے روز ٹھہرنا چاہتے ہو؟"

میں نے کہا۔

"ایک ہفتہ ضرور ٹھہریں گے۔ پانڈی چری بڑا شہر ہے۔ اس کی سیر کرنے میں اتنے دن تو ضرور لگ جائیں گے۔"

"تو پھر ایسا کرو کہ ایک ہفتے کا کرایہ ادا کر دو۔ میں تمہیں صاف ستھرا بستر بھی دوں گا اور نہانے کے لئے اچھا صابن تولیہ بھی دوں گا۔"

وہ ہنس رہا تھا۔ میں نے جیب سے تیس روپے نکال کر اسے دیئے اور کہا۔

"یہ تیس روپے آپ اپنے پاس رکھیں۔ اگر ہم اس سے پہلے بھی چلے گئے تو آپ سے کچھ واپس نہیں لیں گے۔"

بوڑھے نے روپے صندوقچی میں ڈال کر اسے تالا لگایا اور اٹھ کر ہمارے ساتھ ہو گیا۔ وہ ہمیں بلڈنگ کی دوسری منزل کے ایک چھوٹے سے کمرے میں لے آیا جس کی دیوار کا پلستر جگہ جگہ سے اکھڑ چکا تھا۔ وہاں پہلے سے ایک چارپائی پڑی تھی۔ بوڑھا جو سرائے کا مالک ہی تھا اور بعد میں جس نے اپنا نام حاجی عبدالرزاق بتایا کہنے لگا۔

"میں ابھی دوسری چارپائی ڈلوا دیتا ہوں غسل خانہ نیچے اندر والے صحن میں ہے میں تمہیں الگ تولیہ صابن بھی بھجوا دیتا ہوں۔ ہم اپنے مسلمان بھائیوں کا بڑا خیال رکھتے ہیں۔"

سرائے کا مالک حاجی رزاق جب چلا گیا تو کمانڈو اورنگ زیب نے کھڑکی میں سے دوسری طرف جھانک کر دیکھا۔ کہنے لگا۔

"ادھر تو گلی میں کوڑے کرکٹ کے ڈھیر لگے ہیں۔"

میں نے کہا۔

"یہ کچرا گلی ہو گی۔ لوگ مکانوں کا کوڑا کچرا کھڑکیوں میں سے گلی میں پھینک دیتے ہیں۔ کارپوریشن کا ٹرک آ کر لے جاتا ہے۔"

کمانڈو اورنگ زیب اور میں اس کھڑکی پر آ گئے جو سرائے کے دروازے کی جانب کھلی تھی۔ نیچے کشادہ گلی میں لڑکے بانس کے بنے ہوئے بال سے فٹ بال کھیل رہے تھے۔ حاجی صاحب کی ہدایت پر ملازم چارپائی لے کر اوپر آ گیا۔ اس کے ساتھ صاف ستھرے دو بستر بھی تھے۔ ہم نے چارپائیوں پر بستر بچھا دیئے۔ اس دوران رات ہو گئی۔ اورنگ زیب کہنے لگا۔

"ٹھکانہ تو ہمیں مناسب مل گیا ہے۔ اب ہمیں یہ معلوم کرنا ہے کہ بندرگاہ کہاں ہے اور بندرگاہ سے جیا گامی کی وہ کھاڑی کتنی دور ہے جہاں جہاز کھڑے ہیں۔"

میں نے کہا۔

"یہ کام اگر ہم دن کی روشنی کے وقت کریں تو زیادہ بہتر ہو گا۔ رات کو ہم کسی بھ پوزیشن کو واضح طور پر نہیں دیکھ سکیں گے۔"

چنانچہ ہم نے صبح سورج نکلنے کے وقت اپنے ٹارگٹ کا سروے کرنے کا پروگرام بنا اور اپنی اپنی چارپائیوں پر بیٹھ کر اپنے مشن کے بارے میں آہستہ آہستہ باتیں کرنے لگے۔ کھانا ہم نے بازار کے ریستوران سے کھا لیا تھا۔ دس بجے رات تک ہم اپنے مشن کے امکانات اور اندیشوں پر غور و فکر کرتے رہے۔ اس کے بعد سو گئے۔

صبح اس وقت بیدار ہوئے جب گلی میں سے ایک ٹرک شور مچاتا ہوا گزرا۔ پہلے میری آنکھ کھلی۔ اس کے ساتھ ہی کمانڈو اورنگ زیب بھی اٹھ کر بیٹھ گیا۔

"یہ ٹرک تھا؟"

"ہاں"

میں نے کہا۔

میں نے اٹھ کر کھڑکی میں سے جھانک کر دیکھا۔ شاید کچرا اٹھانے والا ٹرک تھا۔ گلی میں کھمبوں کی بتیاں روشن تھیں۔ ان کی روشنی میں مجھے ٹرک کا پچھلا حصہ بازار کی طرف گھومتے نظر آیا۔ میں نے اورنگ زیب سے کہا۔

"جلدی سے تیار ہو جاؤ۔ ہمیں سورج نکلنے سے پہلے پہلے سمندر پر پہنچ جانا چاہیئے۔"

رات کو ہم نے پانڈی چری کی بندرگاہ کی سمت معلوم کر لی تھی۔ پانچ منٹ بعد میں اور کمانڈو اورنگ زیب رات کے لحہ بہ لحہ غائب ہوتے اندھیرے اور دم بدم بڑھتی ہوئی دن کی روشنی میں سرائے کی ڈیوڑھی میں سے نکل کر بندرگاہ کو جاتی سڑک پر روانہ ہو گئے۔

کوئی تین ایک فرلانگ چلنے کے بعد ہمیں کچھ فاصلے پر پانی کی سیاہ چادر دور تک پھیلی ہوئی دکھائی دی۔ اس کی ایک جانب کنارے پر دور تک روشنیاں چلی گئی تھیں۔ ان روشنیوں کا عکس پانی میں جھلملا رہا تھا۔ کمانڈو اورنگ زیب کہنے لگا۔

"ہمیں یہاں رک کر دن نکلنے کا انتظار کرنا چاہیئے۔ اندھیرے میں ہم کسی غلط جگہ

بھی جا سکتے ہیں۔ فوجی اسلحہ سے لدے ہوئے جہازوں کی وجہ سے سیکورٹی کے انتظامات کافی سخت ہوں گے۔"

ہم ایک جگہ ناریل کے درختوں کے نیچے بیٹھ گئے۔ تھوڑی دیر بعد آسمان پر روشنی کے دھارے پھوٹنے لگے۔ یہ سورج طلوع ہونے کے پہلے کی روشنی تھی۔ سمندر میں اس سنہری روشنی نے آگ سی لگا دی۔ آہستہ آہستہ یہ ملگجی روشنی سورج کے طلوع ہونے کے بعد دن کے اجالے میں تبدیل ہو گئی۔ اب ہمارے سامنے سارا منظر واضح تھا۔

ہم نے دیکھا کہ جس طرف رات کو روشنیاں نظر آ رہی تھیں اس طرف دس بارہ بڑے بڑے سمندری جہاز کھڑے تھے۔ ان کے آگے سمندر کا کنارا ناریل کے جھنڈوں کے ساتھ دور تک چلا گیا تھا۔ دائیں جانب بھی چھوٹے بڑے جہاز کھڑے تھے جن کے قریب سے ہو کر سٹیمر گزر رہے تھے۔ ایک جگہ چھوٹی سی عمارت تھی جس کے اوپر کوئی جھنڈا لہرا رہا تھا۔

کمانڈو اورنگ زیب نے کہا۔

"میرا خیال ہے یہ بندرگاہ کی عمارت ہے ہمیں یہ معلوم کرنا ہے کہ جیاگامی کی کھاڑی کس طرف ہے"

"وہاں دو چٹانیں سب سے بڑی نشانی ہے یہاں سے اٹھ کر اس طرف چلتے ہیں۔"

جہاں ہم بیٹھے تھے وہاں کوئی انسان نہیں تھا۔ ذرا آگے سمندر کے ریتلے کنارے پر چلتے چلے گئے تو کچھ جھونپڑے نظر آئے۔ ان کے سامنے سمندر کے پانیوں میں چھوٹی چھوٹی کشتیاں بلیوں سے بندھی ہوئی تھیں۔ کالے کالے چند ایک ماہی گیر بھی بیٹھے آپس میں بیڑیاں پیتے ہوئے باتیں کر رہے تھے۔ میں نے کمانڈو اورنگ زیب سے کہا۔

"میرا خیال ہے یہ ملاح ہیں۔ ان سے ایک کشتی لے کر سمندر کی سیر کرتے ہیں۔ اس طرح ہمیں زیادہ دور تک جانے کا موقع مل سکے گا۔"

ہم نے ملاحوں سے ایک کشتی کرائے پر لے لی۔ ملاح نے کہا کہ وہ کشتی خود چلائے گا۔ ہم نے کوئی اعتراض نہ کیا ہم کشتی میں بیٹھ گئے۔ تامل ملاح جس نے صرف گھٹنوں پر

لنگی پہن رکھی تھی کشتی میں بیٹھ کر چپو چلاتے ہوئے کشتی کو کنارے سے نکال کر سمندر میں لے آیا وہ کنارے سے کچھ فاصلے پر کشتی کو آہستہ آہستہ ایک جانب چلانے لگا۔ اسے معلوم تھا کہ جو لوگ سمندر کی سیر کو وہاں آتے ہیں انہیں کس طرف لے جانا ہوتا ہے ہم آپس میں پنجابی زبان میں باتیں کرنے لگے۔ تاکہ یہ تامل مدراسی ملاح ہماری گفتگو سمجھ سکے۔ میں نے ملاح سے ہندوستانی اردو میں کہا۔

"ادھر والا جو جہاز باجو میں کھڑے ہیں اس طرف جانے کو مانگتا۔"

مجھے یاد ہے میں نے اس سے بھی زیادہ غلط سلط اردو میں تامل ملاح سے بات کی تھی۔ وہ بولا۔ اس کی اردو مجھے یاد نہیں رہی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ میں اس طرف نہیں جا سکتا۔ اس طرف جانے کی اجازت نہیں ہے۔ ہم سمجھ گئے کہ وہ سیکورٹی کا ایریا ہے۔ میں نے ملاح سے کہا۔

"اچھا تو پھر تم ان درختوں کی طرف ہی ہمیں لے جاؤ۔ ہم ذرا دور تک سیر کرنا چاہتے ہیں۔ ہم بنگلور سے یہاں سیر کرنے ہی آئے ہیں۔"

اس کے ساتھ ہی میں نے پانچ روپے کا نوٹ نکال کر اسے دے دیا۔ پانچ روپے نوٹ لے کر وہ بہت خوش ہوا۔ کہنے لگا۔

"ٹھیک ہے صاحب ہم تم کو ادھر کی سیر کرا دے گا۔"

معلوم ہوا کہ اس طرف جانے کی بھی ممانعت تھی مگر ملاح ہمیں سمندر میں ایک چکر کاٹ کر کنارے کے ناریل کے جھنڈوں کے پاس لے آیا۔ یہاں ہم کنارے پر اتر کر بیٹھ گئے۔ میں نے سگریٹ سلگا لیا۔ ایک سگریٹ تامل ملاح کو بھی دیا۔ چھ سات بڑے بڑے سمندری جہاز ہماری دائیں جانب کچھ فاصلے پر سمندر میں لنگر انداز تھے۔ ان کے مستولوں پر اپنے اپنے ملکوں کے جھنڈے لہرا رہے تھے۔ کئی جہازوں پر وائرلیس کے انٹینے بھی نصب تھے۔ ان میں سے ایک جہاز آئل ٹینکر تھا جس پر بڑی بڑی کرینوں کی طرح کے دو اونچے آہنی دروازے سے بنے ہوئے تھے۔ ان جہازوں کے پیچھے پانڈی چری کی بندرگاہ کی عمارت کا اوپر والا حصہ نظر آ رہا تھا جس پر بھارت کا ترنگا جھنڈا لہرا رہا تھا۔

کمانڈو اورنگ زیب کہنے لگا۔

"وہ جہاز کہاں ہیں جن کی ہمیں تلاش ہے؟"

میں نے اپنے عقب کی طرف دیکھا۔ ادھر سمندر کا کنارہ کچھ دور آگے جا کر بائیں جانب گھوم گیا تھا۔ میں نے پنجابی میں اسے کہا۔

"میرا خیال ہے وہ جہاز اس طرف ہوں گے۔"

اورنگ زیب بھی ادھر دیکھنے لگا۔ ہم کشتی میں بیٹھ گئے اور ملاح سے دوسری طرف چلنے کو کہا۔ وہ بولا۔

"صاحب! ادھر کو جانا نہیں مانگتا"

اس کا مطلب تھا کہ اس طرف جانے کی اجازت نہیں ہے۔ میں نے تامل ملاح کو جیب سے پانچ روپے کا ایک اور نوٹ نکال کر دیتے ہوئے کہا کہ وہ ہمیں دور دور رہ کر ہی اس طرف سمندر کی سیر کرا دے وہ تیار ہو گیا۔ اس نے کشتی کو سمندر میں اس طرف موڑ دیا جس طرف سمندر ناریل کے جھنڈوں کے عقب کی طرف مڑ جاتا تھا۔

جیسے ہی ہماری کشتی ذرا آگے سمندر میں آکر ایک جانب مڑی تو ہمیں کچھ دور سمندر میں دو بڑی بڑی چٹانیں نکلی ہوئی نظر آئیں۔ ان چٹانوں کی دوسری جانب دو بحری جہاز کھڑے تھے جن کے کچھ حصے ہمیں نظر آ رہے تھے۔ میں نے اورنگ زیب سے پنجابی میں کہا۔

"مجھے یقین ہے اورنگ زیب یہی ہمارا ٹارگٹ ہے۔"

کمانڈو اورنگ زیب بھی ان چٹانوں اور ان کے عقب میں کھڑے جہازوں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ کہنے لگا۔

"اب اس کی تصدیق کیسے ہو کہ یہی اسرائیلی جہاز ہیں۔ اس سے پوچھو کہ اس طرف جیا گامی کی کھاڑی کہاں ہے؟"

جب میں نے ملاح سے جیا گامی کی کھاڑی کے بارے میں پوچھا تو اس نے چٹانوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بتایا کہ جیا گامی کی کھاڑی اس چٹان کے پیچھے ہے۔ میں نے اس

سے پوچھا۔

"یہ جہاز کس ملک کے ہیں ؟"

وہ بولا۔

"معلوم نہیں صاحب۔ پر ہمیں اس طرف جانا نہیں مانگتا۔ بس آگے ہم نہیں جائے گا۔ ہم واپس جانا مانگتا۔"

اور اس نے کشتی موڑ دی۔ اس اثنا میں ہم نے ایک سٹیمر کو دیکھا جو چٹانوں کے عقب سے نکل کر دوسری طرف تیز رفتاری سے جا رہا تھا۔ اورنگ زیب نے کہا۔

"میرا خیال ہے یہ کوسٹ گارڈز کی بوٹ ہے۔ ہمیں یہاں سے نکل جانا چاہیئے۔ اگر یہ لوگ ادھر آ گئے اور ہماری چیکنگ ہوئی تو تم جانتے ہو کہ ہمارے پاس کمانڈو ثابت ہونے کے سارے ثبوت موجود ہیں"

اورنگ زیب نے بالکل ٹھیک کہا تھا۔ اس وقت ہم دونوں کی جیکٹوں کی جیبوں میں چھ چھ انتہائی طاقتور بم اور ایک ایک کمانڈو چاقو موجود تھا۔ ہم یہ چیزیں اس لئے اپنے ساتھ لے آئے تھے کہ سرائے کے کمرے میں انہیں چھپانے کی کوئی قابل اعتبار جگہ نہیں تھی۔ کمرے کی ایک چابی سرائے کے مالک کے پاس بھی تھی اور ممکن تھا کہ ہمارے جانے کے بعد وہ کمرے کی تلاشی لیتا۔ ان قیمتی چیزوں کے معاملے میں کسی پر بھروسہ نہیں کر سکتے تھے۔ لیکن انہیں جیب میں رکھ کر سمندر میں جہازوں کے قریب جانا بھی بے حد خطرناک بات تھی۔ چنانچہ ہم وہیں سے واپس آ گئے۔

سرائے میں آ کر ہم غور و فکر میں ڈوب گئے۔ یہ غور و فکر میں ڈوبنے والی بات ہی تھی۔ کیونکہ ہمارے سامنے ایک بہت بڑا ٹارگٹ تھا جس تک پہنچنے کے واسطے ہمارے پاس اگرچہ حقیقت کی نظر سے دیکھا جائے تو کوئی سامان نہیں تھا۔ بظاہر کوئی وسیلہ بھی دکھائی نہیں دیتا تھا۔ سب سے اہم چیز جس کی ہمیں ضرورت تھی وہ دو آکسیجن ماسک تھے جنہیں منہ پر چڑھائے بغیر ہم سمندر کی تہہ میں نہیں اتر سکتے تھے۔ ہمارے سانس اتنے لمبے کبھی بھی نہیں ہو سکتے تھے کہ ہم سمندر کے نیچے ہی نیچے تیرتے ہوئے جہازوں کے گرد لگی

فولادی تار کو کاٹیں اور پھر ان تاروں میں سے نکل کر سمندر کے اندر ہی اندر تیرتے ہوئے جہازوں تک پہنچیں اور باری باری جہازوں کے پیندوں کے ساتھ میگنٹ بم چسپاں کریں۔ اس کے لئے ضروری تھا کہ ہمارے پاس اگر آکسیجن سلنڈر نہیں تو کم از کم پندرہ بیس منٹ تک سمندر کے اندر رہنے کے لئے آکسیجن موجود ہو اور جدید آکسیجن ماسک میں اتنی گنجائش ہوتی ہے۔ ہم اسی مسئلے پر غور کر رہے تھے کہ کمانڈو اورنگ زیب کو ایک بڑا اچھا خیال سوجھا۔ کہنے لگا۔

"یہاں سمندر ہے تو ایسی بیچ یعنی ایسا ساحل سمندر بھی ضرور ہو گا جہاں ملکی اور غیر ملکی لوگ آ کر سمندر میں تیراکی کرتے ہوں گے۔ مجھے یقین ہے کہ اگر یہاں کوئی ایسی جگہ ہے تو وہاں کوئی نہ کوئی سوئمنگ یا ڈائیونگ کلب بھی ضرور ہو گی۔ اگر کوئی ڈائیونگ کلب ہو گی تو اس کلب میں آکسیجن ماسک بھی ضرور ہوں گے تمہارا کیا خیال ہے؟"

مجھے روشنی کی ایک کرن نظر آ گئی تھی۔ میں نے کہا۔

"اگر کوئی ڈائیونگ کلب ہوئی تو یقین کرو وہاں سے آکسیجن ماسک حاصل کرنا ہمارے لئے مشکل نہیں ہو گا۔ یہ معلومات میں اکیلا جا کر حاصل کرتا ہوں"

کمانڈو اورنگ زیب بولا۔

"تم اس مشن پر جاؤ۔ میں کسی مارکیٹ میں جا کر ایسا پلاس یا کٹر حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہوں جو فولادی تار کو بھی کاٹ دے۔"

اس کے فوراً بعد کمانڈو اورنگ زیب اپنے مشن پر اور میں اپنے مشن پر روانہ ہو گیا۔ سب سے پہلے میں پانڈی چری کی بندرگاہ پر گیا۔ خاصی بڑی بندرگاہ تھی۔ انگریزوں کے زمانے کی بڑی شاندار عمارت تھی۔ بڑے بڑے محرابی ستون تھے۔ باہر ایک طرف کاریں ٹرک اور دوسری گاڑیاں کھڑی تھیں۔ ایک جانب چھوٹا سا ریستوران بنا ہوا تھا۔ مجھے معلوم تھا جس قسم کی معلومات مجھے چاہئیں وہ کہاں سے حاصل ہو سکتی ہیں۔ میں ریستوران میں آ کر ایک طرف بیٹھ گیا۔ دن کا وقت تھا۔ ریستوران میں کافی لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک طرف ایک غیر ملکی جوڑا بھی بیٹھا کافی پی رہا تھا۔ آدمی کی عمر زیادہ تھی۔

عورت نوجوان تھی۔ اس کے بال سنہری گھنگھریالے تھے۔ برطانیہ کی عورت لگ رہی تھی۔ ڈائیونگ اور سوئمنگ کا شوق ان لوگوں کو زیادہ ہوتا ہے چنانچہ یہ لوگ جس ملک کے ساحل سمندر کی سیر کو جاتے ہیں تو اس قسم کی سوئمنگ کلبوں یا ڈائیونگ کلبوں کے بارے میں ضرور پوچھتے ہیں۔

میں اٹھ کر ان لوگوں کے پاس آگیا۔ میں نے جاتے ہی انگریزی میں کہا۔

"آپ لوگ مجھے برطانیہ سے آئے ہوئے لگتے ہو۔"

بوڑھا انگریز مجھے غور سے دیکھنے لگا۔ لڑکی مسکرا رہی تھی۔ لڑکی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"ہاں۔ ہم یارک شائر کے رہنے والے ہیں انڈیا کی سیاحت کو آئے ہیں۔"

میں ان سے اجازت لے کر ان کے پاس کرسی پر بیٹھ گیا اور انڈیا کے مشرقی گھاٹ کے سمندر اور سمندری طوفانوں کا ذکر چھیڑ دیا۔ بوڑھے انگریز نے پوچھا۔

"کیا تم گائیڈ ہو؟"

میں نے ہنس کر کہا۔

"نہیں جناب۔ میں بھی آپ کی طرح کا ایک سیاح ہی ہوں۔ انڈیا کا رہنے والا ہوں مگر شمال میں ہمالیہ کے دامن میں رہتا ہوں۔ پہلی بار پانڈی چری کی سیاحت کرنے آیا ہوں۔ مصیبت یہ ہے کہ مجھے سوئمنگ اور خاص طور پر سمندر میں غوطہ خوری کا بڑا شوق ہے۔ لیکن یہاں مجھے کوئی گائیڈ نہیں کر رہا کہ میں اپنا غوطہ خوری کا شوق کیسے اور کہاں پورا کر سکتا ہوں"

بوڑھا انگریز ہنسنے اور جیب سے پائپ نکال کر سلگانے لگا۔ ساتھ ہی انگریز لڑکی کی طرف دیکھ کر بولا۔

"الزبتھ تم اس مقامی سیاح کو سمجھاؤ"

انگریز لڑکی کا نام الزبتھ تھا۔ اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"مجھے خود غوطہ خوری کا شوق ہے۔ بلکہ میں تو کل سارا دن سمندر میں ڈائیونگ

کرتی رہی ہوں۔"

مجھے گوہر مراد مل گیا تھا۔ میں نے بڑی منت کرنے کے انداز میں لڑکی سے کہا۔

"پلیز! مجھے بتاؤ کہ یہاں ایسی کون سی کلب ہے جہاں میں اپنا غوطہ خوری کا شوق پورا کر سکتا ہوں۔ میں اس کی خاطر ایک سو روپے تک فیس بھی ادا کروں گا۔"

وہ انگریز باپ بیٹی بڑے اچھے لوگ تھے اور پھر سیاح تھے اور سیاح عام طور پر اپنے ملک سے باہر جانے کے بعد بڑے خوش اخلاق ہو جاتے ہیں۔ بوڑھا انگریز پائپ کا دھواں چھوڑتے ہوئے بولا۔

"نو نو ینگ مین! تمہیں فیس دینے کی کوئی ضرورت نہیں۔ ہم نے پانڈی چری ڈائیونگ کلب کی ایک ماہ کی ممبر شپ لے رکھی ہے اور ہمیں اختیار ہے کہ ہم اپنے ایک مہمان کو غوطہ خوری کے لئے ساتھ لے جا سکتے ہیں تم کہاں رہتے ہو؟"

میں نے یونہی ایک ہوٹل کا نام لے دیا۔ بوڑھا انگریز بولا۔

"او کے۔ ابھی ہمیں پانڈی چری کا قلعہ دیکھنے جانا ہے۔ تم ایسا کرو اب دن کے دس بجے ہیں۔ تم ٹھیک ایک بجے یہاں اسی ریستوران میں آجانا۔ ہم تمہیں اپنے ساتھ ڈائیونگ کلب میں لے چلے گا۔ تم اپنا شوق پورا کر لینا۔"

مجھے یہ پوچھنے کی ضرورت نہیں تھی کہ ان لوگوں کے پاس آکسیجن ماسک ہیں یا نہیں۔ کیونکہ آکسیجن ماسک کے بغیر ڈائیونگ یا غوطہ خوری کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ میں نے اٹھ کر ان سے ہاتھ ملایا اور ٹھیک ایک بجے وہاں آنے کا کہہ کر چلا آیا۔

سرائے میں پہنچا تو کمانڈو اورنگ زیب پہلے سے موجود تھا۔ مجھے دیکھتے ہی کہنے لگا۔

"میں تو اپنا مشن مکمل کر آیا ہوں۔ تم سناؤ کچھ سراغ ملا؟"

میں نے اسے ساری کہانی بیان کردی۔ وہ کہنے لگا۔

"آکسیجن ماسک تو ڈائیونگ کلب والوں کے پاس ہوں گے۔"

میں نے کہا۔

"بالکل ان کے پاس ہوں گے اور وہاں سے انہیں اڑا کر لانا بھی میرا ہی کام ہے۔ تم

بتاؤ۔ اس لفافے میں کیا ہے؟"

اورنگ زیب نے لفافے میں سے مجھے دو پلاس نکال کر دکھائے۔ یہ فولاد کے بڑے مضبوط پلاس تھے۔ وہ بولا۔

"میں نے انہیں استعمال کر کے دیکھ لیا ہے۔ یہ فولاد کی موٹی سے موٹی تار کو کاٹنے کی طاقت رکھتے ہیں۔"

میں نے کہا۔

"ٹھیک ہے۔ اب ایسا ہے کہ ان کو چارپائی پر بستر کے نیچے رکھ دو۔ میگنٹ بم اور کمانڈو چاقو ہم اپنے پاس ہی رکھیں گے۔ اس شہر میں ہمیں ایسا کوئی خطرہ نہیں ہے کہ پولیس بازار میں روک کر ہماری تلاشی لے۔"

اورنگ زیب نے دونوں پلاس اپنے بستر کے نیچے اچھی طرح سے چھپا دیئے۔ جب بارہ بج کر پینتالیس منٹ ہوئے تو میں نے اورنگ زیب کو سرائے میں ہی چھوڑا اور خود بس میں بیٹھ کر بندرگاہ کی طرف چل دیا۔ ٹھیک ایک بجے میں بندرگاہ والے ریستوران میں تھا۔ کوئی دس منٹ بعد بوڑھا انگریز اور اس کی بیٹی الزبتھ بھی آگئی۔ ہم نے وہیں تھوڑا بہت کھانا کھایا۔ کھانے کا بل آیا تو میں نے بوڑھے انگریز کو ادا نہ کرنے دیا اور خود ادا کیا۔ وہ میری اس بات سے بڑا متاثر ہوا۔ ان لوگوں کو متاثر کرنا ہی میرا کام تھا۔ وہ مجھے اپنی کھٹارا سی گاڑی میں ڈائیونگ کلب لے گئے جو ساحل سمندر پر ناریل اور تاڑ کے اونچے اونچے درختوں کے درمیان ایک لمبے کیبن کی طرح بنی ہوئی تھی۔ یہ ایک ریٹائرڈ مدراسی نیول آفیسر نے بنائی تھی جسے ڈائیونگ کا وسیع تجربہ تھا۔ بوڑھے انگریز نے میرا اس سے اپنے مہمان کی حیثیت سے تعارف کرایا اور کہا یہ ہمارا دوست بھی آج ہمارے ساتھ غوطہ خوری کرے گا۔

ڈائیونگ کلب کے مدراسی مالک کا نام راما کٹی تھا۔ راما کٹی نے اپنے سفید دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے کہا۔

"ضرور ضرور۔ آف کورس۔ آف کورس"

میں بڑا اچھا تیراک اور غوطہ خور ضرور تھا مگر ماسک لگا کر غوطہ خوری کبھی نہیں کی تھی۔ میں اس کے نشیب و فراز سے بھی آگاہ ہونا چاہتا تھا۔ ہم تینوں نے ڈائیونگ سوٹ پہنے اور آکسیجن ماسک لے کر ایک کشتی میں بیٹھ گئے۔ تیراکی تو سمندر کے کنارے پر بھی ہوتی ہے مگر غوطہ خوری کے لئے ذرا کھلے سمندر میں جانا پڑتا ہے۔ کشتی سمندر میں جا رہی تھی اور میں آکسیجن ماسک کا معائنہ کر رہا تھا۔ میں یہ ظاہر کر رہا تھا جیسے مجھے اس کی تکنیک کا علم ہے۔ میں نے کہا۔

"میں نے کاٹھیاواڑ کے ساحل پر بھی بہت غوطہ خوری کی ہے۔ مگر وہاں جو کلب تھی اس کے پاس ذرا مختلف آکسیجن ماسک تھے۔ اس ماسک کی ڈیوریشن کتنی ہو گی؟"

اصل میں میں یہی معلوم کرنا چاہتا تھا جو مجھے معلوم نہیں تھا کہ اسے پہن کر آدمی سمندر کے اندر کتنی دیر تک رہ سکتا ہے۔ بوڑھے انگریز نے بتایا کہ اس کی ڈیوریشن صرف پندرہ منٹ ہے۔ اس کی بیٹی الزبتھ نے کہا۔

"لیکن اس کلب میں دوسرے قسم کے آکسیجن ماسک بھی ہیں۔ ان کی ڈیوریشن آدھ گھنٹہ ہے۔ اس میں آکسیجن کا ایک فالتو چھوٹا سلنڈر ساتھ لگا ہوتا ہے"

مجھے اسی آکسیجن ماسک کی ضرورت تھی۔ میں نے سوچ لیا کہ واپسی پر اس آکسیجن ماسک کا معائنہ بھی کروں گا اور یہ بھی دیکھوں گا کہ اسے کلب میں کس جگہ پر رکھا جاتا ہے۔ سمندر میں کچھ دور جا کر کشتی روک دی گئی۔ یہ موٹر بوٹ تھی۔ ہم نے آکسیجن ماسک پہنے۔ پاؤں میں مچھلی کی دم کی طرح کے فلیپر بھی چڑھا لئے اور میں اس انتظار میں یونہی اپنے پاؤں کے فلیپرز کو درست کرنے لگ گیا کہ یہ لوگ سمندر میں کیسے اترتے ہیں۔ میں نے دیکھا کہ پہلے لڑکی موٹر بوٹ کے کنارے پر ہماری طرف منہ کر کے بیٹھ گئی پھر اس نے پیچھے کی طرف قلابازی لگا کر اپنے آپ کو سمندر میں گرا دیا۔ بوڑھے انگریز نے بھی ایسا ہی کیا۔ اس کا مطلب تھا کہ غوطہ خور اسی طرح سمندر میں اترتے تھے۔ چنانچہ میں نے بھی اسی طرح الٹی قلابازی لگا کر سمندر میں چھلانگ لگا دی۔ الٹی قلابازی لگانے سے یہ ہوا کہ جب میں سمندر میں اترا تو اپنے آپ میرا رخ سیدھا ہو گیا۔ سمندر کے اوپر

لہروں میں ہوا کی وجہ سے تموج تھا مگر سمندر کے نیچے بڑا سکون تھا۔ میری آنکھوں پر آکسیجن ماسک کا گول شیشہ چڑھا ہوا تھا۔ منہ میں نالی تھی جس میں سے میرے پھیپھڑوں میں آکسیجن داخل ہوتی اور اسی نالی کے ذریعے میرے پھیپھڑوں کی کاربن ڈائی آکسائیڈ بلبلوں کی شکل میں خارج ہو رہی تھی۔ سمندر میں تیرتے ہوئے مجھے دباؤ محسوس ہو رہا تھا مگر آکسیجن کی وجہ سے میں بڑے آرام کے ساتھ پاؤں کے فلیپر ہلاتا بوڑھے انگریز اور اس کی بیٹی کے پیچھے پیچھے مچھلی کی طرح تیرتا چلا جا رہا تھا۔ دس منٹ تک ہم سمندر کے اندر ادھر ادھر تیرتے رہے پھر باہر نکل آئے۔

دو تین بار غوطہ خوری کرنے کے بعد ہم موٹر بوٹ لے کر واپس کلب میں آ گئے۔ وہاں ہم نے ربڑ کے بنے ہوئے اور جسم کے بالکل ساتھ چمٹ جانے والے ڈائیونگ سوٹ اور آکسیجن ماسک اتار کر لوہے کی الماری میں رکھ دیئے جہاں دوسرے ڈائیونگ سوٹ اور آکسیجن ماسک بھی لٹک رہے تھے۔ یہاں مجھے الزبتھ نے وہ آکسیجن ماسک دکھایا جسے پہن کر غوطہ خور سمندر کے نیچے آدھے گھنٹے تک رہ سکتا تھا۔ اس آکسیجن ماسک کے پیچھے کی جانب ایک پلاسٹک کی چھوٹی ٹیوب کی شکل کا فالتو آکسیجن سلنڈر بھی لگا ہوا تھا۔ میں نے دیکھا کہ اس قسم کے سات آٹھ آکسیجن ماسک ہی الماری کے دوسرے خانے میں لٹکے ہوئے تھے۔ میں نے اس لوکیشن کو ذہن میں بٹھا لیا۔

ہم نے شاور میں غسل کیا۔ اپنے اپنے کپڑے پہنے اور ساحل سمندر پر ایک کینوپی کے نیچے بیٹھ کر کافی پینے لگے۔ میں نے وہیں معلوم کر لیا تھا کہ کلب شام ہوتے ہی بند کر دی جاتی ہے۔ شام کا اندھیرا ہو جانے کے بعد وہاں کوئی تیراکی اور سمندری غوطہ خوری نہیں ہوتی۔ وہاں کچھ دیر بیٹھنے کے بعد میں نے کہا۔

"اب میں اجازت چاہوں گا۔ مجھے مارکیٹ میں ایک دوست سے ملنا ہے"

بوڑھے انگریز نے کہا۔

"ہم تمہیں وہاں ڈراپ کر دیں گے۔ ہم بھی اب جا رہے ہیں۔"

انہوں نے مجھے اپنی گاڑی میں بٹھایا اور میں انہیں ان سڑکوں پر سے گزارتا ہوا اپنی

سرائے والے چوک میں لے آیا۔ یہ راستہ میں نے اپنے ذہن میں پکا کر لیا تھا۔ کیونکہ آدھی رات کے بعد مجھے کمانڈو اورنگ زیب کو لے کر اسی راستے سے ڈائیونگ کلب کی طرف جانا تھا۔ میں چوک میں اتر گیا۔ بوڑھے انگریز نے کہا۔

"ینگ مین! ہم کل بھی دوپہر کے بعد کلب آئیں گے۔ اگر تم بھی آجاؤ تو ہمیں خوشی ہوگی۔"

میں نے دونوں باپ بیٹی سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔

"میں پوری کوشش کروں گا۔"

گاڑی آگے نکل گئی۔ میں سرائے میں آگیا۔ کمرے میں اورنگ زیب موجود تھا۔ میں نے اسے سارے واقعات سنائے اور کہا۔

"ہمیں آج رات کلب کا تالا توڑ کر آکسیجن ماسک اور ڈائیونگ سوٹ اڑا کر لانے ہوں گے۔"

وہ کہنے لگا۔

"تم نے راستہ دیکھ لیا ہے؟"

میں نے کہا۔

"راستہ بھی یاد کر لیا ہے اور کلب کی لوکیشن بھی دیکھ لی ہے۔"

ہم شام تک اپنے میں ہی رہے۔ رات کو تھوڑا سا کھانا کھایا۔ میگنٹ بم اپنے پاس ہی رکھے۔ کمانڈو چاقو نکال کر چیک کئے۔ اگرچہ ہمیں کسی کا خون نہیں کرنا تھا۔ وہاں چوکیدار کی مزاحمت کی ہمیں پوری توقع تھی۔ ایسی صورت میں ہمیں چوکیدار وہاں جو کوئی گارڈز وغیرہ بھی تھے انہیں کمانڈو ایکشن کے بعد صرف اتنی ضرب لگانی تھی کہ کچھ وقت کے لئے بے ہوش ہو جائیں۔ یاد رکھیں۔ کمانڈو کبھی ناحق خون نہیں بہاتا وہ صرف اپنے دشمن پر کاری وار کرتا ہے اور ایک کمانڈو کے وار سے کوئی زندہ نہیں بچ سکتا۔ ہمارے پاس کمانڈو کا خاص سیاہ لباس نہیں تھا۔ ہمیں اس لباس کی وہاں ضرورت بھی نہیں تھی۔ بس صرف ہمیں رات کا گہرا اندھیرا ہونے کا انتظار تھا۔

ہم رات کے ٹھیک ایک بجے سرائے سے نکلے۔ اس وقت سب لوگ سو رہے تھے۔ وہاں سے ساحل سمندر والی ڈائیونگ کلب زیادہ دور نہیں تھی۔ راستہ مجھے یاد تھا۔ ہم سڑک کے کنارے کنارے جہاں اندھیرا تھا چلے جا رہے تھے۔ سڑک خالی تھی۔ کسی کسی وقت کوئی گاڑی ہم پر اپنی ہیڈ لائیٹس کی روشنیاں ڈالتی گزر جاتی۔ یہ سمندر کے قریب کا علاقہ تھا اور گنجان نہیں تھا۔ دو تین سڑکوں پر سے گزرنے کے بعد ہم اس بڑی سڑک پر آگئے جو سیدھی ساحل سمندر کو جاتی تھی۔ وہیں کلب کا کیبن بھی تھا۔ میں نے دن کے وقت سارا محل وقوع دیکھ رکھا تھا۔ ہمیں وہاں تک پہنچنے میں کوئی آدھا گھنٹہ لگا۔ سیدھے راستے کی طرف جانے کی بجائے میں اورنگ زیب کو لے کر اوپر کی طرف والے درختوں کے جھنڈ کی طرف سے ہوتا ہوا ڈائیونگ کلب ک عقب میں آگیا۔ یہاں آکر ہم اندھیرے میں ایک جگہ بیٹھ گئے۔ کلب کا کیبن ہم سے کوئی دو سو گز دور ہو گا۔ کلب کی عقبی دیوار پر بجلی کا بلب جل رہا تھا۔ ہر طرف گہری خاموشی تھی۔ اردگرد بھی اندھیرا تھا۔ سمندر کی جانب سے ہوا چل رہی تھی اور کسی کسی وقت سمندر کی ان لہروں کی ہلکی ہلکی آواز آجاتی تھی جو ساحل سمندر پڑ آکر واپس پلٹ جاتی تھیں۔

اورنگ زیب نے پوچھا۔

"کلب کا کوئی بیک ڈور بھی ہے؟"

میں نے آہستہ سے کہا۔

"نہیں اس کا ایک ہی دروازہ ہے ہمیں اس دروازے سے اندر داخل ہونا ہو گا۔ میرے پیچھے پیچھے چلے آؤ"

میں آگے آگے چل پڑا۔ کلب کا کیبن جب ہم سے کوئی بیس پچیس گز دور رہ گیا تو میں رک گیا۔ یہاں لوہے کا ایک بڑا ٹریش کین پڑا تھا۔ ہم اس کے پیچھے چھپ کر بیٹھ گئے۔ میں نے کہا۔

"اگر یہاں کوئی چوکیدار ہوا تو وہ دوسری طرف دروازے کے باہر کہیں بیٹھا ہو گا"

کمانڈو اورنگ زیب نے کہا۔

"میں جا کر معلوم کرتا ہوں۔"

میں نے اسے روکتے ہوئے کہا۔

"نہیں۔ تم۔ یہیں بیٹھو۔ میں جاتا ہوں۔ میں نے کلب کا دروازہ دیکھا ہوا ہے۔ راستہ صاف ہوا تو میں تمہیں کوئل کی ہلکی آواز میں سگنل دوں گا"

اور اس کے ساتھ ہی میں اٹھا اور ٹریش کین کے پیچھے سے نکل کر جھک کر کلب کی عمارت کی بائیں جانب چلنے لگا۔ زمین پر گھاس بھی تھی اور سنگ ریزے بھی بکھرے ہوئے تھے۔ ان سنگ ریزوں پر چلنے سے آو پیدا ہو رہی تھی جس کو دبانے کی میں ہر ممکن کوشش کرزہا تھا۔ میں کلب کی دیوار کے پاس بچ کر اس کے ساتھ سیدھا ہو کر لگ گیا۔ یہاں اندھیرا تھا۔ میں دبے پاؤں دیوار کے ساتھ لگ کر آگے بڑھنے لگا۔ دیوار ختم ہوئی تو میں نے بڑی احتیاط کے ساتھ سر ذرا سا آگے نکال کر دیکھا۔ کلب کے دروازے کے آگے کوئی آدمی بنچ پر پہلو کے بل لیٹا ہوا تھا۔ وہ جس طرح بے حس وحرکت تھا علوم ہوتا تھا کہ وہ سو رہا ہے۔ مگر مجھے اسے ہرحالت میں بے ہوش کرنا تھا۔ میں نے ایک لمحے کے لئے تینوں جانب دیکھا۔ وہاں سناٹا اور اندھیرا تھا۔ کوئی آواز نہیں آرہی تھی۔ کوئی دوسرا پہرے دار بھی نظر نہیں آرہا تھا۔ میں نے کمانڈو چاقو نہیں نکالا تھا۔ اس کی ضرورت نہیں تھی۔ میرے بائیں بازو کے پٹھے ضرور پھڑکنے لگے تھے اسی بازو سے میں نے سارا کام لینا تھا۔

میں پہلو والی دیوار سے نکل کر کلب کی سامنے والی دیوار کے ساتھ لگ کر آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگا۔ اب میں روشنی میں تھا۔ کلب کے دروازے کے اوپر جو بلب جل رہا تھا اس کی روشنی باقاعدہ مجھ پر پڑ رہی تھی۔ مگر اب میں اس روشنی سے بے نیاز تھا۔ اب میری نظریں اپنے ٹارگٹ پر تھیں۔ اس وقت میرا ٹارگٹ دروازے کے آگے بنچ پر سویا ہوا آدمی تھا۔ یہ آدمی یقیناً چوکیدار تھا جس کو سمندر کی طرف سے آنے والی ٹھنڈی ہوا نے تھپک تھپک کر سلا دیا تھا۔ میں پاؤں سکیڑ سکیڑ کر چل رہا تھا۔ بڑی آہستگی کے ساتھ میں چوکیدار کے سر کی جانب آگیا۔ اب مجھے زیادہ انتظار نہیں کرنا تھا۔ یہ دبلا پتلا سا کالا

مدراسی چوکیدار تھا جو دنیا مافیا سے بے خبر ہو کر سو رہا تھا۔ یہ میرے لئے بڑا ہی آسان شکار تھا۔ بس صرف اتنی احتیاط کی ضرورت تھی کہ اس کے حلق سے کوئی اونچی آواز نہ نکلے۔ چوکیدار کے سر کی طرف پہنچ کر میں نے زیادہ دیر نہ لگائی۔ یہ دیر لگانے کا موقع بھی نہیں تھا۔ میرا خیال ہے صرف دو سیکنڈ لگے ہوں گے۔ کمزور سا مدراسی آدمی تھا۔ میں نے ایک ہی جنبش میں اپنا سیدھا ہاتھ اس کے منہ پر رکھ کر سر کو ذرا سا اٹھایا۔ اس کے ساتھ ہی اس کی پتلی سی گردن میرے بائیں بازو کے آہنی شکنجے میں تھی۔ میں نے اسے جھٹکا بالکل نہیں دیا۔ اس طرح اس کی گردن ٹوٹ سکتی تھی اور میں اسے مارنا نہیں چاہتا تھا۔ بس اتنی دیر اسے بازو کے شکنجے میں رکھا جب تک کہ وہ بے ہوش نہ ہو گیا۔

میں نے منہ سے کوئل کی ہلکی آواز نکالی

دوسرے لمحے کمانڈو اورنگ زیب میرے پاس موجود تھا۔ ہم نے چوکیدار کی آدھی دھوتی پھاڑی۔ پھر اس کے دو ٹکڑے کئے۔ ایک ٹکڑا اس کے منہ میں ٹھونس دیا اور دوسرے ٹکڑے سے اسے بنچ پر اس طرح جکڑ دیا کہ وہ ہوش میں آنے کے بعد نہ تو کوئی آواز نکال سکتا تھا اور نہ اٹھ کر بھاگ سکتا تھا۔ اس کام سے فارغ ہوتے ہی میں نے جیب سے لوہے کی ہک نکالی اور کلب کے دروازے کا تالا کھول ڈالا۔ ہم کمرے میں داخل ہو گئے۔ دروازہ بند کر دیا۔ اندر اندھیرا تھا۔ کمانڈو اورنگ زیب نے ماچس جلائی۔ میں سیدھا لوہے کی الماری کے پاس آ گیا۔ اس کو کھولا۔ اس کے اندر سے آدھے آدھے گھنٹے کی ڈیوریشن والے دو آکسیجن ماسک نکالے۔ مزید ایک ایک فالتو آکسیجن سلنڈر دوسرے ماسکوں پر سے اتار لیا۔ ربڑ کے دو ڈائیونگ سوٹ نکال لئے۔ انہیں اچھی طرح سے تہہ کر کے وہیں سے چمڑے کا ایک تھیلا اٹھا کر انہیں اس میں ڈالا اور جس خاموشی سے اندر آئے تھے اسی خاموشی سے باہر نکل کر درختوں کے اندھیرے کی طرف دوڑ پڑے۔ سارا کام مختصر وقت میں کامیابی کے ساتھ ہو گیا تھا۔

ہم جس طرف سے آئے تھے اسی طرف سے واپس سرائے کی طرف روانہ ہو گئے۔ رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی۔ سڑک خالی پڑی تھی۔ ہم درمیان میں پندرہ سولہ قدموں کا فاصلہ ڈال کر چل رہے تھے۔ میں آگے آگے تھا۔ تھیلا کمانڈو اورنگ زیب کے پاس تھا جو میرے پیچھے آ رہا تھا۔ جب ہم اس چوک میں آئے جہاں سے ہمیں سرائے والی

گلی کی طرف مڑتا تھا تو سامنے سے ایک آدمی آتا دکھائی دیا۔ میں سگریٹ پیتا بڑے سکون کے ساتھ چلا جا رہا تھا۔ جب آدمی میرے قریب آیا تو میں نے دیکھا کہ وہ کوئی بھکاری ٹائپ کا آدمی تھا۔ اس نے تامل زبان میں ہاتھ جوڑ کر مجھے کچھ کہا۔ پھر اس نے ہاتھ منہ کے پاس لے جا کر ایسا اشارہ کیا جیسے سگریٹ پی رہا ہو۔ میں نے جیب سے سگریٹ نکال کر سلگایا اور اسے دے دیا۔ وہ سگریٹ لے کر بہت خوش ہوا اور سگریٹ کے کش لگاتا پیچھے نکل گیا جدھر سے کمانڈو اورنگ زیب آ رہا تھا۔ میں نے رک کر پیچھے دیکھا۔ بھکاری نے کمانڈو اورنگ زیب سے کوئی بات نہ کی اور اس کے قریب سے ہو کر گزر گیا۔

ہم سرائے میں آ گئے۔ ڈیوڑھی کے تخت پر چوکیدار سو رہا تھا۔ ہم احتیاط سے قدم اٹھاتے اپنے کمرے میں پہنچ گئے۔ کمرے کی بتی جلا کر گئے تھے۔ چارپائی پر تھیلا رکھ کر اسے کھولا اور ہم آکسیجن ماسکوں کا معائنہ کرنے لگے۔ کمانڈو اورنگ زیب نے فالتو سلنڈر کو چیک کرتے ہوئے کہا۔

"میرا خیال ہے ہمیں اس کی ضرورت پڑ سکتی ہے۔ تم نے اچھا کیا جو اسے لے آئے"

ہم نے ریہرسل کی غرض سے اسی وقت ربڑ کے ڈائیونگ سوٹ پہنے اور چہروں آکسیجن ماسک چڑھا کر دیکھے۔ سب کچھ مناسب اور ٹھیک تھا۔ ہم نے سوٹ اتار دیئے گیس ماسک بھی اتار دیئے اور دونوں چیزیں چمڑے کے تھیلے میں سنبھال کر رکھ لیں کمانڈو اورنگ زیب کہنے لگا۔

"اب ہماری حکمت عملی کیا ہو گی؟"

میں نے کہا۔

"لوکیشن ہم نے دیکھ لی ہے۔ ہم جنوب مشرق جو ملاحوں کی جھونپڑیاں ہیں ان طرف سے سمندر میں داخل ہوں گے اور چٹانوں کے عقب میں جہازوں تک پہنچ گے۔"

"مگر یہ فاصلہ کافی طویل ہے۔ ہماری آکسیجن تو راستے میں ہی ختم ہو جائے گی"

اورنگ زیب کے اس اعتراض پر میں نے کہا۔

"ہم سمندر میں دور تک ماسک پہنے بغیر تیرتے ہوئے جائیں گے۔ آکسیجن ماسک صرف وہاں پہنیں گے جہاں اس کی ضرورت محسوس کریں گے۔ تم سمندر میں تیر لو گے ناں؟"

کمانڈو اورنگ زیب بولا۔

"کیوں نہیں۔ میں نے اس کی باقاعدہ تربیت حاصل کی ہوئی ہے۔ تم فکر نہ کرو"

"ٹھیک ہے۔ ہم کل رات کو اپنے ٹارگٹ کی طرف روانہ ہوں گے۔"

دوسرے روز ہم ایک مرتبہ پھر اپنے ٹارگٹ کو دیکھنے کے لئے گئے۔ ہم نے اسی ملاح کی کشتی کرائے پر لی۔ اسے مزدوری دس روپے دیئے اور سمندر میں دور سے ایک چکر کاٹ کر چٹانوں کی اوٹ میں کھڑے جہازوں کو غور سے دیکھا۔ ان کی پوزیشن کو نوٹ کیا۔ جس زاویے سے اور جس مقام سے ہمیں سمندر میں غوطہ لگانا تھا اس کا اندازہ لگایا۔ مقام طے کیا۔ اور پھر واپس آ گئے۔ دن کا باقی کا وقت ہم نے اپنے سرائے والے کمرے میں گزارا اور اپنے کمانڈو ایکشن کی تفصیلات پر غور و فکر کرتے رہے۔

کمانڈو اورنگ زیب کا خیال تھا کہ ہمیں سمندر میں دور تک تیرتے جانے کی بجائے کشتی پر یہ فاصلہ طے کرنا چاہئے۔

"رات کے وقت ماہی گیروں کی کشتیاں ساحل سمندر پر ہی ہوتی ہوں گی۔ ہم بڑی آسانی سے ایک کشتی حاصل کر سکتے ہیں"

کمانڈو اورنگ زیب کی تجویز قابل عمل تھی۔ اس طرح ہم سمندر میں دور تک تیرتے جانے کی مشقت سے بچ سکتے تھے۔ رات کے اندھیرے میں ماہی گیروں کی کسی ایک کشتی کو اڑا کر لے جانا کوئی دشوار کام نہیں تھا۔ یہ لوگ رات کو عام طور پر تاڑی شراب میں دھت ہو کر پڑ جاتے ہیں۔ میں نے کہا۔

"ٹھیک ہے۔ ہم ایسا ہی کریں گے۔"

اسی رات ہمارا اصل اور خطرناک کمانڈو مشن شروع ہونے والا تھا۔ یہ کمانڈو مشن

اہم بھی تھا اور اس میں ہر قسم کے جان لیوا خطرات بھی تھے۔ لیکن ہمیں ان خطرات کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے' ان کا مقابلہ کرتے ہوئے اپنے ٹارگٹ کو مارنا تھا۔ یہی ہمارا عزم اور یہی ہمارا نصب العین تھا اور اس کام میں ہم پوری طرح تربیت یافتہ تھے۔ ایک ماہر کمانڈو کو تربیت تو ضرور ملی ہوتی ہے اور وہ پورے جذبے اور مورال کے ساتھ ٹارگٹ پر حملہ کرتا ہے لیکن کبھی کبھی ایسا بھی ہو جاتا ہے کہ بالکل نئے قسم کے حالات سامنے آجاتے ہیں جن کے بارے میں کچھ قیاس اور گمان بھی نہیں ہوتا۔ ایک تجربہ کار کمانڈو ان حالات میں بھی حوصلہ نہیں ہارتا اور اپنی جان کی بازی لگا دیتا ہے۔ اس اہم ترین اور خطرناک کمانڈو مشن کے بارے میں مجھے بھی اندیشہ تھا کہ صورت حال ہمیں ویسی نہیں ملے گی جیسی کہ ہم نے سوچ رکھی ہے اور جس کا ہم پورا انتظام کر کے اور سوچ سمجھ کر چلے ہیں۔ لیکن میں نے دل میں یہ عہد بھی کر رکھا تھا کہ چاہے میری جان چلی جائے لیکن میں پاکستان اور نہتے کشمیریوں کے خلاف استعمال ہونے والا اسلحہ اور فوجی سازو سامان سے بھرے ہوئے بحری جہازوں کو سمندر میں غرق کر کے ہی رہیں گے۔ چاہے ان جہازوں کے ساتھ میرے اپنے پرخچے کیوں نہ اڑ جائیں۔

یہ بات بھی یاد رکھیں کہ کمانڈو جس مشن پر بھی جاتا ہے وہ واپس آنے کا خیال دل سے نکال کر جاتا ہے۔ دن آہستہ آہستہ گزرتا جا رہا تھا۔ دوپہر گزر گئی۔ پھر شام اور پھر رات کا پہلا پہر شروع ہو گیا۔ ہم نے تھوڑا بہت کھانا کھایا اور کمرے میں ہی دروازہ بند کر کے بیٹھے اپنی کمانڈو حکمت عملی کے تمام پہلوؤں پر غور کرتے رہے۔ ہم نے رات کے پورے ایک بجے نکلنے کا پروگرام طے کیا تھا۔ ایسی بات نہیں تھی کہ اس وقت نیول کوسٹ گارڈ کے آدمی غافل ہوں گے یا سو رہے ہوں گے۔ نہیں۔ ہمیں معلوم تھا کہ جہازوں کے اردگرد سیکورٹی گارڈز اور جہازوں کے اوپر گارڈ ڈیوٹی پر کھڑے بحریہ کے جوان پوری طرح چوکس ہوں گے۔ ہمیں ان سب خطرات میں سے انتہائی ہوشیاری اور چالاکی سے گزر کر جہازوں تک پہنچنا تھا۔

ہم نے اپنی اپنی گھڑیاں ملالیں۔ جب ہماری گھڑیوں نے رات کا ٹھیک پونا ایک بجایا

تو ہم نے آخری بار چمڑے کے تھیلے میں رکھے ہوئے غوطہ خوری کے لباس آکسیجن ماسک وغیرہ چیک کئے۔ اپنے اپنے میگنٹ بم نکال کر انہیں چیک کیا۔ ان کے وہ بٹن دیکھے جنہیں نیچے کرنے سے بموں نے ٹھیک آدھے گھنٹے بعد قیامت خیز دھماکے سے پھٹ کر جہازوں کو سمندر میں غرق کر دینا تھا۔ ہم نے اپنے اپنے کمانڈو چاقو بھی ساتھ رکھ لئے تھے۔ ہمارے پاس کوئی پستول نہیں تھا۔ ایمرجنسی کی حالت میں ہمیں ان چاقوؤں سے ہی کام لینا تھا۔ ٹھیک ایک بجے ہم سرائے سے نکلے اور ساحل سمندر کی جانب چل پڑے۔ چمڑے کا تھیلا میرے پاس تھا۔ میں آگے آگے جا رہا تھا۔ کمانڈو اورنگ زیب چھ سات قدموں کا فاصلہ ڈال کر میرے پیچھے پیچھے آرہا تھا۔ وہ مجھے کور دے رہا تھا۔ اگر راستے میں کوئی پولیس کا آدمی مجھے چیک کرتا ہے تو اورنگ زیب میری مدد کر سکتا تھا۔

میں اس طرف جا رہا تھا جدھر ماہی گیروں کی جھونپڑیاں تھیں۔ یہ جگہ میں دو بار دن کی روشنی میں دیکھ چکا تھا۔ وہاں تک پہنچنے میں ہمیں کسی قسم کی مشکل کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ جب ہم سمندر کے پاس آئے اور جھونپڑیاں رات کے اندھیرے میں چھوٹے چھوٹے سیاہ ٹبوں کی طرح نظر آنے لگیں تو کمانڈو اورنگ زیب دوڑ کر میرے قریب آگیا۔ اب ہم دونوں چاروں طرف سے چوکس ہو کر ماہی گیروں کی کشتیوں کی طرف بڑھ رہے تھے۔ جھونپڑیوں پر سناٹا چھایا ہوا تھا۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔ سمندر کے ساحل پر چھوٹی بڑی کشتیاں زمین میں گڑھے ہوئے بانسوں سے بندھی تھیں۔ ہم نے ایک چھوٹی کشتی کو کھولا اور اسے ریت پر گھسیٹتے ہوئے سمندر میں لے آئے۔ سمندر پر سکون تھا۔ اس کی لمبی لمبی لہریں بڑے سکون کے ساتھ دور سے آکر ساحل کی ریت پر چڑھ جاتیں اور پھر آہستگی سے واپس چلی جاتیں۔ جب ہماری کشتی سمندر میں پہنچ گئی تو ہم اس میں سوار ہو گئے۔ میں نے چپو تھام لئے۔ میں جھک کر کشتی کو سمندر میں آگے لے جانے لگا۔ اورنگ زیب بھی سمٹ کر بیٹھا ہوا تھا۔ سمندر پر اندھیرا چھایا تھا۔ آسمان پر بادل ہونے کی وجہ سے ستاروں کی پھیکی روشنی بھی سمندر پر نہیں پڑ رہی تھی۔ ہمارے کمانڈو ایکشن کے لئے فضا بڑی سازگار تھی۔

میں کشتی کو سمندر میں کچھ دور تک چلاتا گیا۔ اس کے بعد میں بائیں جانب ہونے لگا۔ میرا مقصد دور درختوں کے جھنڈوں والے ساحل تک پہنچنا تھا۔ کمانڈو اورنگ زیب نے کہا۔

"تم ٹھیک سمت کو جا رہے ہو کیا؟"

میں نے کہا۔

"بالکل ٹھیک جارہا ہوں۔ تم خاموشی سے بیٹھے رہو"

میں کشتی کو درختوں کی طرف لے جا رہا تھا۔ درختوں کے سیاہ جھنڈوں والا کنارا نزدیک آرہا تھا۔ اس دوران ہمیں کچھ فاصلے پر چٹان اور اس کی اوٹ میں کھڑے بحری جہازوں کی روشنیاں صاف نظر آرہی تھیں۔ ان روشنیوں کا عکس سمندر میں بھی پڑ رہا تھا۔ یہ بات ہمارے لئے خطرناک ثابت ہو سکتی تھی۔ اگر ہم جہازوں کے قریب جا کر سر پانی سے باہر نکالتے ہیں تو ہمیں بڑی آسانی سے دیکھا جا سکتا تھا۔ یہ ہماری خوش قسمتی تھی اور مجھے حیرت بھی تھی کہ وہاں کوئی سرچ لائٹ نصب نہیں تھی۔ چٹان کے اوپر بھی بتیاں روشن تھیں۔ درختوں کے جھنڈوں والا ساحل ریتلا نہیں تھا۔ پانی کنارے تک چڑھا ہوا تھا۔ اس سے مجھے یقین ہو گیا کہ ہماری کشتی جیا گامی نامی سمندری کھاڑی میں داخل ہو چکی ہے۔ میں بے آواز چپو چلا رہا تھا۔ کشتی کو ہم نے ساحل کے بالکل ساتھ لگا دیا اور اوپر کنارے پر چڑھ گئے۔ کشتی رسی سے ہم نے ایک جھاڑی کی شاخوں سے باندھ دی۔ سمندر کا پانی یہاں رات کے اندھیرے میں اوپر نیچے ہو رہا تھا۔

ہم چمڑے کا تھیلا لے کر درختوں کے نیچے اندھیرے میں بیٹھ گئے۔ ہماری نظر دور چٹانوں کے سائے میں کھڑے سمندری جہازوں پر جمی ہوئی تھی۔ یہ فاصلہ میرے اندازے کے مطابق ہم سمندر میں غوطہ لگا کر پانچ منٹ میں طے کر سکتے تھے۔ ہم نے فوراً کپڑے اتار کر غوطہ خوری کے سوٹ پہن لئے۔ پاؤں میں ربڑ کے مچھلی کی دم کی طرح کے فلیپر چڑھائے۔ چہرے پر آکسیجن ماسک پہنے اور کنارے پر آ گئے۔ چھ میگنٹ بم کمانڈو اورنگ زیب نے کپڑے میں لپیٹ کر اپنی کمر کے گرد باندھ رکھے تھے اور چھ بم اسی طرح میں نے

کپڑے میں ڈال کر اپنی کمر کے ساتھ باندھ لئے تھے۔ ایک پلاس میرے ڈائیونگ سوٹ کی بیلٹ میں اور ایک پلاس کمانڈو اورنگ زیب کے ڈائیونگ سوٹ کی بیلٹ میں لگا ہوا تھا۔ کمانڈو چاقو ہم نے اپنی پنڈلیوں کے ساتھ باندھ لئے تھے۔ ہر طرح سے تیار ہونے کے بعد ہم نے ایک دوسرے سے ہاتھ ملایا۔ دل میں کلمہ شریف پڑھا۔ اللہ سے فتح کی دعا مانگی اور سمندر میں اتر گئے۔

سمندر میں اترنے کے بعد ہم آہستہ آہستہ سر پانی کی سطح سے باہر نکالے تیرنے لگے۔ ہم چاہتے تھے کہ جہاں تک خطرے سے بچ کر سمندر میں تیر سکتے ہیں تیرتے چلے جائیں اس طرح سے ہم اپنے آکسیجن ماسک کی آکسیجن بچا کر اسے ٹارگٹ پر جا کر استعمال کرنا چاہتے تھے۔ کیونکہ کچھ پتہ نہیں تھا کہ ہمیں سمندر کے اندر کتنی دیر لگے گی۔ دور ہمیں ایک بوٹ جہازوں کی طرف جاتی نظر آئی۔ اس کی ہیڈ لائٹ روشن تھی اور جہازوں کے قریب سمندر پر پڑ رہی تھی۔ کمانڈو اورنگ زیب میرے پہلو میں تیرتا ہوا میرے ساتھ ہی آگے بڑھ رہا تھا۔ کہنے لگا۔

"یہ کوسٹ گارڈز کی بوٹ ہو گی میرا خیال ہے ہمیں غوطہ لگا دینا چاہئے۔

اس وقت آکسیجن ماسک ہم نے چہروں سے اوپر کئے ہوئے تھے۔ میری آنکھیں بھی بوٹ کی روشنی کو دیکھ رہی تھیں۔ میں نے کہا۔

"جتنی دیر تیر سکتے ہیں ہمیں تیرتے جانا چاہئے۔ یہاں تک کوسٹ گارڈ کے بوٹ کی روشنی نہیں آرہی"

ہم سمندر میں آہستہ آہستہ تیرتے تیرتے جہازوں کے اتنے قریب پہنچ گئے کہ ہمیں ایک جہاز کے ڈیک پر جنگلے کے پاس کھڑا سپاہی کا ہیولا نظر آنے لگا۔ میں نے تیرتے تیرتے اورنگ زیب کو اشارہ کیا۔ اس کے ساتھ ہی ہم نے چہروں پر آکسیجن ماسک چڑھائے اور سمندر میں غوطہ لگا گئے۔ ہمارے سر نیچے تھے اور ٹانگیں اوپر تھیں اور پاؤں کے فلیپر اوپر نیچے حرکت کر رہے تھے۔ کافی نیچے گہرائی میں جانے کے بعد ہم سیدھے ہو گئے اور ہم نے اپنا رخ جہازوں کی طرف کر لیا۔ ہمارے پاس جتنی آکسیجن تھی اس کی الٹی گنتی شروع ہو

گئی تھی۔ ہم زیادہ سے زیادہ آدھے گھنٹے تک سمندر کے اندر رہ سکتے تھے۔ اس کے بعد ہمیں آکسیجن کا دوسرا سلنڈر تبدیل کرنا تھا۔ پلاس کٹر ہمارے ہاتھوں میں تھے۔ ہمیں جہازوں کے اردگرد فولادی جال کی تلاش تھی۔ ہمیں زیادہ انتظار نہ کرنا پڑا۔ سمندر کے اندر اندھیرا ضرور تھا مگر جہازوں اور چٹانوں کی روشنیوں کا جو عکس پانی میں پڑ رہا تھا ان کی وجہ سے سمندر کے اندر ہمیں تھوڑا تھوڑا نظر آرہا تھا۔ کئی مچھلیوں کے قافلے ہمیں دیکھ کر جلدی سے دوسری طرف مڑ گئے تھے۔

آخر وہ فولادی جال آگیا جس کی ہمیں تلاش تھی۔ ہم نے ایک سیکنڈ ضائع کئے بغیر پلاس کے تاروں کو کاٹنے کی کوشش شروع کر دی۔ تار بہت مضبوط تھے۔ انہیں کاٹنے میں دقت پیش آرہی تھی۔ مگر ہم نے ہمت نہ ہاری۔ آخر ہم نے تاروں کو کاٹ کر جال میں ایک جگہ اتنا سوراخ بنا لیا کہ ہم اس میں سے گزر گئے۔ یہاں بحریہ کی سیکورٹی فورس کی جانب سے سمندری آبدوز سرنگیں اس لئے نہیں بچھائی گئی تھیں کہ ان کے پھٹنے سے جہازوں کو نقصان پہنچنے کا خطرہ تھا۔ یہ بات ہمارے حق میں بے حد فائدہ مند ثابت ہوئی۔ ہم پانی کے اندر ہی اندر آہستہ آہستہ تیرتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے۔ کچھ دور تیرنے کے بعد ہمیں سامنے ایک بہت بڑی دیوار نظر پڑی۔ یہ ایک جہاز کا پیندا تھا۔ میں نے کمانڈو اورنگ زیب کو اشارہ کر کے بتایا کہ تم اس جہاز کو سنبھالو۔ میں دوسرے جہاز کی طرف جاتا ہوں۔ اور اس کے ساتھ ہی میں جہاز کے پیندے کے ساتھ ساتھ تیرتا آگے نکل گیا۔ آگے بہت موٹا آہنی سنگل سمندر میں اترتا چلا گیا تھا۔ یہ جہاز کا لنگر تھا۔ کچھ فاصلے پر دوسرے جہاز کا سامنے والا تکونی سرا آگیا۔ میں اس کے پہلو کی طرف نکل گیا۔ یہاں میں نے سب سے پہلا میگنٹ بم پیندے سے لگا دیا۔ یہ کام بے حد احتیاط کے ساتھ کیا گیا تھا کہ بم کے پیندے کے ساتھ چپکنے کی کم سے کم آواز پیدا ہو۔ اس طرح پانی کی گہرائی میں اس جہاز کے دونوں طرف تیر کر میں نے چھ کے چھ بم چپکا دیئے۔ مگر ان کے بٹن اون نہ کئے۔ میں تیزی سے تیرتا ہوا کمانڈو اورنگ زیب والے جہاز کی طرف بڑھا۔ میں نے دیکھا۔ وہ جہاز کی عقبی دیوار کے ساتھ میگنٹ بم چپکا رہا تھا۔ میں نے اس کے

قریب جا کر اس کے کندھے پر دو بار آہستہ سے ہاتھ مارا۔ اس کا مطلب تھا کہ میں اپنا کام مکمل کر آیا ہوں۔ کمانڈو اورنگ زیب نے میرے کندھے پر بھی اسی طرح دو بار ہاتھ لگایا۔ اس کا مطلب تھا کہ اس نے بھی چھ کے چھ بم لگا دیئے ہیں۔ اس کے بعد ہم اپنا اپنا ہاتھ ماتھوں پر لے گئے۔ اس کا مطلب تھا کہ اب ہمیں فوراً اپنے لگائے ہوئے میگنٹ بموں کے بٹن اون کر دینے ہیں۔ چنانچہ ہم تیزی سے اپنے اپنے جہازوں کی طرف گھوم گئے۔ میں نے اپنے اور کمانڈو اورنگ زیب نے اپنے لگائے ہوئے بموں کے بٹن دبا دیئے۔ اب ہمیں جتنی جلدی ہو سکے وہاں سے واپس فرار ہونا تھا۔ قدرت ہمارا ساتھ دے رہی تھی۔ سارا کام وقت سے چھ سات منٹ پہلے ہی ختم ہو گیا تھا۔ ہم ایک دوسرے کے پیچھے مچھلیوں کی طرح جتنی تیز سمندر کے اندر تیر سکتے تھے تیرتے ہوئے فولادی جال کے سوراخ میں سے نکل گئے۔

کچھ دور جا کر مجھے محسوس ہوا کہ مجھے سانس لینے میں دقت پیش آرہی ہے۔ میں نے گھوم کر اورنگ زیب کو دیکھا اور اوپر کی طرف اشارہ کیا۔ اس نے بھی اوپر کی طرف اشارہ کیا۔ ہم دونوں کے آکسیجن سلنڈروں کی آکسیجن آخری مرحلوں پر تھی اور ختم ہونے والی تھی۔ ہم پانی کے اندر بالکل سیدھے کھڑے ہو گئے۔ پھر پاؤں پر چڑھے ہوئے فلیپر اور اپنے بازوؤں کو چلاتے اوپر اٹھنے لگے۔ ہمارے سر پانی سے باہر آگئے۔ ہم نے فوراً آکسیجن ماسک چہروں سے ہٹا کر اوپر چڑھا لئے۔ ہم نے گردن موڑ کر دیکھا۔ ہم جہازوں سے زیادہ دور نہیں تھے۔ اوپر ڈیک پر سے کسی فوجی کے کسی دوسرے فوجی کو آواز دینے اور پھر دوسرے فوجی کے قہقہے کی آواز سنائی دی۔ خطرے کی کوئی بات نہیں تھی۔ ہم بڑی احتیاط سے آواز پیدا کئے بغیر واپس تیرتے چلے جا رہے تھے۔ ہم بڑے خوش تھے کہ ہمارے مشن کا سب سے اہم اور خطرناک مرحلہ بغیر کسی دشواری کے آسانی سے طے ہو گیا تھا۔ جب ہم جہازوں سے کافی فاصلے پر آگئے تو ہم جلدی جلدی تیرنے لگے۔

کیونکہ جہازوں کے غرق ہونے میں زیادہ دیر باقی نہیں تھی۔ اگر ہمارے لگائے ہوئے بم پھٹ جاتے ہیں تو اوپر تلے دھماکے ہونے تھے۔ جہازوں کے پیندوں میں بموں کے پھٹنے

کے بعد بڑے بڑے سوراخ بلکہ شگاف پڑ جاتے تھے جن میں سے سمندر کا پانی قیامت خیز ریلوں کی طرح جہازوں میں بھرنا شروع ہو جاتا تھا اور پھر جہازوں کو تمام اسلحہ اور فوجی سازو سامان کے ساتھ سمندر میں غرق ہونے سے کوئی نہیں بچا سکتا تھا۔ ہم سمندر میں ٹھیک اس جگہ آکر کنارے پر آگئے جہاں ہماری کشتی بندھی ہوئی تھی۔ ہم نے جلدی جلدی ڈائیونگ سوٹ اتار کر چمڑے کے تھیلے میں رکھے ہوئے اپنے کپڑے پہنے۔ آکسیجن ماسک اور ربڑ کے ڈائیونگ سوٹ اور پلاس چمڑے کے تھیلے میں ڈال کر تھیلے کو وہیں سمندر میں پھینکا۔ اور کشتی کو تیزی سے چلاتے ہوئے جہازوں سے جس قدر دور ہو سکتے تھے سمندر میں دور ہوتے چلے گئے۔ کمانڈو اورنگ زیب نے اپنی کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی کی چمکیلی سوئیوں کو دیکھ کر مجھے کہا۔

"بموں کے پھٹنے میں بہت تھوڑا وقت رہ گیا ہے۔ ہمیں ماہی گیروں کی جھونپڑیوں کی طرف جانے کا خطرہ مول نہیں لینا چاہیئے۔ جہازوں کے دھماکوں اور ان کے غرق ہونے کے ساتھ ہی اس سارے علاقے کو بحریہ کی سیکورٹی گارڈ اور فوجی گھیرے میں لے سکتے ہیں۔"

کمانڈو اورنگ زیب کا خیال درست تھا۔ میں نے وہیں سے کشتی کو دوسری طرف ڈال دیا۔ اب ہماری کشتی تیزی سے ان درختوں کے عقب میں ساحل کی طرف جا رہی تھی۔ جہاں سے ہم کشتی کو لے کر چلے تھے۔ کنارے پر پہنچ کر ہم نے کشتی کو سمندر میں ہی چھوڑ دیا اور خود دوڑتے ہوئے سامنے درختوں کے اندھیرے میں گھس گئے۔ ہماری بائیں جانب سمندری کھاڑی میں کھڑے جہازوں کی روشنیاں ہمیں درختوں کے درمیان سے دور جھلملاتی نظر آجاتی تھیں۔ ایک جگہ آگے ندی آگئی۔ یہ سمندر ہی کی کوئی شاخ تھی۔ ہم وہاں رک گئے۔

اورنگ زیب نے گھڑی پر نگاہ ڈالی اور کہا۔

"بموں کے بلاسٹ ہونے میں بمشکل پندرہ منٹ رہ گئے ہیں ہمیں اتنی دیر میں اس علاقے سے جتنی دور نکل سکتے ہیں نکل جانا چاہیئے۔"

ہم ندی کے کنارے کنارے جہازوں کے مخالف رخ کو تیز تیز چلنے لگے۔ یہاں کوئی جنگل تو تھا نہیں۔ کہیں کہیں جھاڑیاں تھیں اور کہیں جھونپڑی نما کوارٹر بنے ہوئے تھے۔ ہم جتنی تیز چل سکتے تھے چل رہے تھے۔ آخر ہم ایک چھوٹی سی سڑک پر نکل آئے۔ یہ سڑک پانڈی چری کی بندرگاہ کی طرف ہی جاتی ہو گی۔ ہم سڑک پار کر کے سامنے والے کوارٹروں کی قطاروں میں داخل ہو گئے۔ یہاں سے ایک راستہ ایک چھوٹے سے میدان میں نکل گیا تھا۔ یہاں میدان کی طرف کنارے پر کھمبوں پر بتیاں روشن تھیں۔ ہم ان بتیوں کی طرف جانے کی بجائے دوسری طرف چلنے لگے۔ کمانڈو اورنگ زیب نے گھڑی پر نگاہ ڈالی اور بولا۔

"صرف دس منٹ باقی رہ گئے ہیں"

ہمیں اس بات کی خوشی بھی بہت تھی کہ ہمارا مشن آدھے سے زیادہ مکمل ہو گیا تھا اور ہم نے بڑی کامیابی سے دونوں جہازوں کے نیچے طاقتور بم لگا دیئے تھے۔ ان بموں کا سراغ لگا کر انہیں ناکارہ کرنا اب تقریباً ناممکن تھا۔ اول تو ان کا سراغ ہی نہیں لگ سکتا تھا۔ میں نے اورنگ زیب سے کہا۔

"آگے چلتے ہیں۔ ہو سکتا ہے آگے کوئی ایسی سڑک مل جائے جو ہمارے علاقے کی طرف جاتی ہو۔"

وہ کہنے لگا۔

"ہمیں تو معلوم ہی نہیں کہ یہاں کون سی سڑک کس طرف جاتی ہے۔ ہم اس شہر میں اجنبی ہیں اور سڑکوں راستوں سے ناواقف ہیں۔ ہمیں تو صرف بندرگاہ والے علاقے سے دور ہو جانا ہے۔"

میں نے کہا۔

"تم چلو تو سہی"

کوارٹروں پر اندھیرا اور خاموشی طاری تھی۔ ہم ان کے پیچھے سے ہو کر جا رہے تھے۔ کوارٹروں کا علاقہ ختم ہوا تو آبادی شروع ہو گئی۔ یہاں رات کے وقت بھی کافی روشنی

کے بعد بڑے بڑے سوراخ بلکہ شگاف پڑ جاتے تھے جن میں سے سمندر کا پانی قیامت خیز ریلوں کی طرح جہازوں میں بھرنا شروع ہو جاتا تھا اور پھر جہازوں کو تمام اسلحہ اور فوجی سازو سامان کے ساتھ سمندر میں غرق ہونے سے کوئی نہیں بچا سکتا تھا۔ ہم سمندر میں ٹھیک اس جگہ آکر کنارے پر آگئے جہاں ہماری کشتی بندھی ہوئی تھی۔ ہم نے جلدی جلدی ڈائیونگ سوٹ اتار کر چمڑے کے تھیلے میں رکھے ہوئے اپنے کپڑے پہنے۔ آکسیجن ماسک اور ربڑ کے ڈائیونگ سوٹ اور پلاس چمڑے کے تھیلے میں ڈال کر تھیلے کو وہیں سمندر میں پھینکا۔ اور کشتی کو تیزی سے چلاتے ہوئے جہازوں سے جس قدر دور ہو سکتے تھے سمندر میں دور ہوتے چلے گئے۔ کمانڈو اورنگ زیب نے اپنی کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی کی چمکیلی سوئیوں کو دیکھ کر مجھے کہا۔

"بموں کے پھٹنے میں بہت تھوڑا وقت رہ گیا ہے۔ ہمیں ماہی گیروں کی جھونپڑیوں کی طرف جانے کا خطرہ مول نہیں لینا چاہئے۔ جہازوں کے دھماکوں اور ان کے غرق ہونے کے ساتھ ہی اس سارے علاقے کو بحریہ کی سیکورٹی گارڈ اور فوجی گھیرے میں لے سکتے ہیں۔"

کمانڈو اورنگ زیب کا خیال درست تھا۔ میں نے وہیں سے کشتی کو دوسری طرف ڈال دیا۔ اب ہماری کشتی تیزی سے ان درختوں کے عقب میں ساحل کی طرف جا رہی تھی۔ جہاں سے ہم کشتی کو لے کر چلے تھے۔ کنارے پر پہنچ کر ہم نے کشتی کو سمندر میں ہی چھوڑ دیا اور خود دوڑتے ہوئے سامنے درختوں کے اندھیرے میں گھس گئے۔ ہماری بائیں جانب سمندری کھاڑی میں کھڑے جہازوں کی روشنیاں ہمیں درختوں کے درمیان سے دور جھلملاتی نظر آجاتی تھیں۔ ایک جگہ آگے ندی آگئی۔ یہ سمندر ہی کی کوئی شاخ تھی۔ ہم وہاں رک گئے۔

اورنگ زیب نے گھڑی پر نگاہ ڈالی اور کہا۔

"بموں کے بلاسٹ ہونے میں بمشکل پندرہ منٹ رہ گئے ہیں ہمیں اتنی دیر میں اس علاقے سے جتنی دور نکل سکتے ہیں نکل جانا چاہئے۔"

ہم ندی کے کنارے کنارے جہازوں کے مخالف رخ کو تیز تیز چلنے لگے۔ یہاں کوئی جنگل تو تھا نہیں۔ کہیں کہیں جھاڑیاں تھیں اور کہیں جھونپڑی نما کوارٹر بنے ہوئے تھے۔ ہم جتنی تیز چل سکتے تھے چل رہے تھے۔ آخر ہم ایک چھوٹی سی سڑک پر نکل آئے۔ یہ سڑک پانڈی چری کی بندرگاہ کی طرف ہی جاتی ہو گی۔ ہم سڑک پار کر کے سامنے والے کوارٹروں کی قطاروں میں داخل ہو گئے۔ یہاں سے ایک راستہ ایک چھوٹے سے میدان میں نکل گیا تھا۔ یہاں میدان کی طرف کنارے پر کھمبوں پر بتیاں روشن تھیں۔ ہم ان بتیوں کی طرف جانے کی بجائے دوسری طرف چلنے لگے۔ کمانڈو اورنگ زیب نے گھڑی پر نگاہ ڈالی اور بولا۔

"صرف دس منٹ باقی رہ گئے ہیں"

ہمیں اس بات کی خوشی بھی بہت تھی کہ ہمارا مشن آدھے سے زیادہ مکمل ہو گیا تھا اور ہم نے بڑی کامیابی سے دونوں جہازوں کے نیچے طاقتور بم لگا دیئے تھے۔ ان بموں کا سراغ لگا کر انہیں ناکارہ کرنا اب تقریباً ناممکن تھا۔ اول تو ان کا سراغ ہی نہیں لگ سکتا تھا۔ میں نے اورنگ زیب سے کہا۔

"آگے چلتے ہیں۔ ہو سکتا ہے آگے کوئی ایسی سڑک مل جائے جو ہمارے علاقے کی طرف جاتی ہو۔"

وہ کہنے لگا۔

"ہمیں تو معلوم ہی نہیں کہ یہاں کون سی سڑک کس طرف جاتی ہے۔ ہم اس شہر میں اجنبی ہیں اور سڑکوں راستوں سے ناواقف ہیں۔ ہمیں تو صرف بندرگاہ والے علاقے سے دور ہو جانا ہے۔"

میں نے کہا۔

"تم چلو تو سہی"

کوارٹروں پر اندھیرا اور خاموشی طاری تھی۔ ہم ان کے پیچھے سے ہو کر جا رہے تھے۔ کوارٹروں کا علاقہ ختم ہوا تو آبادی شروع ہو گئی۔ یہاں رات کے وقت بھی کافی روشنی

تھی۔ ہم ان سے بچتے بچاتے مزید آگے چلے گئے۔ آگے ایک بڑی سڑک تھی۔ یہاں سے ایک فوجی ٹرک فراٹے بھرتے گزر گیا۔

کمانڈو اورنگ زیب کہنے لگا۔

"میرا خیال ہے ہم خطرے کے مقام سے نکل آئے ہیں۔ اب ہمیں کسی جگہ رک کر بموں کے دھماکوں کا انتظار کرنا چاہئے۔ اگر دونوں جہازوں میں بارود کا ذخیرہ بھی ہوا تو دھماکے قیامت خیز ہوں گے اگر بارود کا ذخیرہ نہ بھی ہوا تب بھی ان میگنٹ بموں کی اس قدر طاقت ہے کہ ان کے دھماکے سارے شہر میں سنے جائیں گے۔"

ہم وہیں سڑک پر سے اتر کر ایک جگہ درختوں کے نیچے چھپ کر بیٹھ گئے۔ ہمارے کان دھماکوں پر لگے تھے۔ کمانڈو اورنگ زیب کی نگاہ گھڑی کی سوئیوں پر تھی۔ پھر میں بھی اپنی گھڑی کو دیکھنے لگا۔ ہماری گھڑیاں ملی ہوئی تھیں۔ ہمارے اندازے اور حساب کے مطابق بموں کے پھٹنے میں صرف دو منٹ رہ گئے تھے۔ میں نے شک کا اظہار کرتے ہوئے اورنگ زیب سے کہا۔

"کیا تمہیں یقین ہے کہ یہ بم کسی ماہر نے تیار کئے تھے اور وقت پر دغا نہیں دیں گے؟"

وہ کہنے لگا۔

"تمہیں ابھی معلوم ہو جائے گا کہ یہ بم جس نے تیار کئے تھے دھماکہ خیز مواد تیار کرنے میں کس قدر ماہر ہے"

جب میگنٹ بموں کی ڈیوریشن ختم ہونے میں صرف پچاس سیکنڈ رہ گئے تو ہم بالکل خاموش ہو گئے۔ ہماری نظریں اپنی اپنی گھڑیوں پر جمی ہوئی تھیں۔ کمانڈو اورنگ زیب کچھ لمحوں کی خاموشی کے بعد بولا۔

"صرف دس سیکنڈ رہ گئے ہیں۔ ہم نے تھوڑے تھوڑے وقفے سے بموں کے فیوز اون کئے تھے۔ وہ سکتا ہے دھماکے یکے بعد دیگرے نہ ہوں۔"

ابھی یہ جملہ اس نے ختم ہی کیا تھا کہ رات کا سناٹا ایک خوفناک دھماکے کی گونج سے

لرز اٹھا۔ اس کے ساتھ ہی دوسرا دھماکہ ہوا۔ پھر تیسرا' پھر چوتھا اور دھماکوں کا سلسلہ بارہ میگنٹ بموں کے دو دو سیکنڈ کے وقفے کے بعد پھٹنے تک جاری رہا۔ اس کے ساتھ ہی ہمیں دور سے فائر بریگیڈ کے انجنوں کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ ہم اٹھ کھڑے ہوئے۔

کمانڈو اورنگ زیب نے مسکراتے ہوئے میرا ہاتھ گرمجوشی سے دباتے ہوئے کہا۔

"اب ہمارے تیار کئے ہوئے بموں کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟"

میں نے کہا۔

"میں تمہارے مجاہدوں کی کیمیکل انجینئرنگ کا قائل ہو گیا ہوں۔ اب یہاں سے بھاگو۔"

ہم سڑک پر جلدی جلدی چلنے لگے۔ جس طرف ہم جا رہے تھے اس طرف شہر کی عمارتوں اور مکانوں' کوٹھیوں کی جھلملاتی روشنیاں نظر آ رہی تھیں۔ مجھے کچھ معلوم نہیں تھا کہ ہم شہر پانڈی چری کے کون سے علاقے میں آ گئے تھے اور یہاں سے کون سا راستہ ہمیں ہماری سرائے والے چوک کی طرف لے جائے گا۔ اس چوک کا نام مجھے یاد تھا۔ وہاں کوئی ٹیکسی رکشا بھی نہیں تھا۔ ہم ایک چوراہے میں آئے تو سامنے سے ایک ٹیکسی چلی آ رہی تھی۔ وہ خالی تھی۔ اس کی سرخ بتی روشن تھی۔ میں نے سڑک کے بیچ میں کھڑے ہو کر اسے ہاتھ دے دیا۔ ٹیکسی رک گئی۔ میں نے چوک کا نام لے کر کہا کہ ہمیں وہاں جانا ہے۔ ٹیکسی ڈرائیور مدراسی تھا۔ بولا۔

"بیٹھو"

ہم ٹیکسی میں بیٹھ گئے۔ اس نے ٹیکسی وہیں سے واپس موڑی اور خالی سڑک پر مخالف سمت کو ڈال دی۔ معلوم ہوا کہ ہم اپنی سرائے والے علاقے سے کافی دور نکل آئے تھے۔ میں نے کمانڈو اورنگ زیب کے کان کے قریب منہ لے جا کر کہا۔

"ہمیں چوک سے ذرا پہلے ہی اتر جانا چاہئے"

وہ بولا۔

"ٹھیک ہے"

ٹیکسی نہ جانے کون کون سے علاقے سے گزرتی ہوئی ایک کشادہ سڑک پر آئی تو میں نے ٹیکسی ڈرائیور سے کہا۔

"ابھی ہمارا چوک کتنی دور ہے؟"

وہ بولا۔

"اگلے بازار میں ہے۔"

میں نے کہا۔

"ٹھیک ہے ہمیں یہیں اتار دو"

ہم نے وہیں ٹیکسی چھوڑ دی اور فٹ پاتھ پر پیدل چلنے لگے۔ ایک بازار ختم ہو گیا دوسرے بازار میں آئے تو میں نے اپنے بازار کو پہچان لیا۔ سامنے اس چوک کی ٹریفک لائیٹس روشن تھیں جس کے قریب ہی ہماری سرائے تھی۔ ہم چوک میں سے گزر کر اس بازار کی طرف مڑ گئے جہاں سے ایک گلی ہماری سرائے کی طرف جاتی تھی تو اچانک وہ تامل مدراسی نہ جانے کہاں سے نکل آیا جسے ہم نے ایک رات پہلے دیکھا تھا جب ہم ڈائیونگ کلب سے واپس آرہے تھے اور اس بھکاری نے مجھ سے سگریٹ مانگا تھا۔ ہم نے اسے پہچان لیا۔ یہ وہی بھکاری تھا۔ اس نے قریب آکر ہنس کر تامل زبان میں کچھ کہا اور پہلے کی طرح ہاتھ منہ پر رکھ کر اندر کی طرف سانس کھینچا جیسے سگریٹ کا کش لگا رہا ہو۔

"صاحب سگریٹ!"

اس نے سگریٹ مانگا۔ میرے پاس سگریٹ تھا مگر میں نے کہا۔

"نو سگریٹ"

اور ہم دونوں آگے نکل کر اپنے بازار میں داخل ہو گئے۔ کمانڈو اورنگ زیب نے مڑ کر دیکھا اور کہنے لگا۔

"یہ آدمی مجھے مشکوک لگتا ہے۔ یہ اس روز بھی ہمیں اسی جگہ رات کو ملا تھا۔ آج بھی اسی جگہ ملا ہے۔"

میں نے کہا۔

"یہ اس علاقے کا کوئی نیم پاگل بھکاری ہے۔ ایسی شک شبے والی کوئی بات نہیں ہے۔ ہندوستان میں اس قسم کے بھکاری اکثر سڑکوں پر مل جاتے ہیں"

کمانڈو اورنگ زیب خاموش ہو گیا۔ ہم گلی میں آگئے۔ گلی خالی تھی اور سنسان تھی۔ سرائے کی ڈیوڑھی میں چوکیدار تخت پر اسی طرح گہری نیند سو رہا تھا۔ ہم دبے دبے قدم اٹھاتے اس کے قریب سے ہو کر گزر گئے۔ کمرے میں آتے ہی ہم نے دروازے کی اندر سے کنڈی لگائی اور اپنی اپنی چارپائی پر یوں بیٹھ گئے جیسے کسی نے ہمارے سروں پر سے تین تین من کا بوجھ اٹھا دیا ہو۔

کمانڈو اورنگ زیب کہنے لگا۔

"میرا تو خیال ہے کہ ہمیں ابھی یہاں سے سیدھا ریلوے سٹیشن پہنچ جانا چاہئے اور دلی کی طرف جاتی جو بھی گاڑی ملے اس میں سوار ہو کر نکل جانا چاہئے۔"

کمانڈو اورنگ زیب ایک دلیر کمانڈو ضرور تھا مگر ابھی اسے کمانڈو آپریشنز کا اتنا وسیع تجربہ نہیں تھا۔ میں نے اسے کہا۔

"اس وقت ریلوے سٹیشن پر جانا اپنے آپ کو خود ہی دشمن کے حوالے کرنے کے برابر ہو گا۔ تم جانتے ہو ہم بھارتی بحریہ کی ہائی کمانڈ کو کس قدر تباہ کن نقصان پہنچا کر آرہے ہیں۔ ہم نے ان کے اسلحہ اور فوجی ساز وسامان سے لدے ہوئے دو بہت بڑے بڑے جہاز سمندر میں غرق کر دیئے ہیں۔ اب تک تو پانڈی چری کی سول اور ملٹری کی انٹیلی جینس شہر کے کونے کونے میں پہنچ چکی ہو گی اور اس کے علاوہ پولیس نے بھی سارے شہر کی ناکہ بندی کر دی ہو گی۔ شہر سے باہر نکلنے والے چوہے کی بھی تلاشی لی جا رہی ہو گی۔"

"تو پھر تم کیا رائے دیتے ہو؟ کیا اسی جگہ پڑے رہیں؟ یہ جگہ بھی تو محفوظ نہیں ہے۔ یہاں باہر سے آکر مسافر ٹھہرتے ہیں۔ پولیس یہاں بھی چھاپا مار سکتی ہے۔"

میں نے کہا۔

"یہ سرائے ایک غیر معروف جگہ ہے۔ یہاں مزدور پیشہ لوگ آکر ٹھہرتے ہیں۔ پولیس شہر کے بڑے بڑے ہوٹلوں کی تو ضرور چیکنگ کرے گی مگر یہاں تک نہیں آئے گی۔"

کاش اس وقت میں کمانڈو اورنگ زیب کی بات مان لیتا اور اسے ناتجربہ کاری کا طعنہ دے کر اس کی تجویز کو رد نہ کرتا بعد میں جس قسم کے سنگین حالات پیش آئے انہوں نے ثابت کر دیا کہ انسان کو اپنے تجربے اور علم پر کبھی ناز نہیں کرنا چاہئے اور دوسرے کی رائے پر ضرور غور کر لینا چاہئے۔ میں نے یہی فیصلہ کیا کہ ہم کم از کم دو تین روز تک اسی سرائے میں رہیں گے۔ جب شہر میں پولیس کی چیکنگ نرم پڑ جائے گی۔ پھر ہم یہاں سے نکل جائیں گے۔

اس کے بعد ہم بتی بجھا کر سو گئے۔

دوسرے دن دیر تک ہم سوئے رہے۔ کافی دن چڑھے اٹھے نیچے گلی میں جا کر چائے کی دکان پر ناشتہ کیا۔ وہاں ہر کوئی اپنی اپنی زبان پر اسی موضوع پر گفتگو کر رہا تھا۔ میں نے چائے کی دکان والے سے پوچھا کہ کیا بات ہو گئی ہے؟ یہ دکان دار ہمارا واقف بن گیا تھا اور بمبئی کا رہنے والا تھا۔ اردو اچھی طرح سے بول لیتا تھا۔ کہنے لگا۔

"تمہیں نہیں معلوم؟ بابو رات کو بندرگاہ پر پاکستانی دہشت گردوں نے ہمارے دو جہازوں کو بموں سے اڑا دیا۔ کہتے ہیں دونوں جہازوں میں ہماری فوج کے لئے اسلحہ بھرا ہوا تھا۔ ادھر بندرگاہ کی طرف تو کرفیو لگا ہوا ہے۔ کسی کو وہاں جانے اور وہاں سے نکلنے کی اجازت نہیں ہے۔"

شام کے اخباروں میں یہ خبر جلی سرخیوں کے ساتھ چھپ کر بازاروں میں آ گئی۔ پانڈی چری میں دو تین اخبار انگریزی زبان میں بھی چھپتے تھے۔ ہم نے انگریزی کا ایک اخبار خرید لیا اور کمرے میں آکر اسے غور سے پڑھنے لگے۔ پہلے صفحے پر جہازوں کی تباہی کی خبر شہ سرخیوں کے ساتھ چھپی ہوئی تھی۔ خبر میں لکھا تھا کہ بھارتی بحریہ کے دو جہاز جن میں بھارتی مقدار میں گولہ بارود اور فوجی سازو سامان لدا ہوا تھا کشمیری کمانڈو نے

سمندر میں غرق کر دیئے ہیں۔ جہازوں میں باری باری دھماکے ہوئے۔ جہازوں کے ٹکڑے اڑ گئے اور چند سیکنڈ میں دونوں جہاز سمندر میں ڈوب گئے۔ خبر میں یہ بھی بتایا گیا تھا کہ بھارتی بحریہ کے پندرہ جوان اور دونوں جہازوں کے عملے کے گیارہ آدمی اس حادثے میں ہلاک ہو گئے ہیں۔ خبر کے آخر میں لکھا تھا کہ فوج اور شہری پولیس نے شہر کی ناکہ بندی کر دی ہے۔ بندرگاہ کے سارے علاقے میں کرفیو لگا دیا گیا ہے اور پولیس کشمیری کمانڈوز کو گرفتار کرنے کے لئے جگہ جگہ چھاپے مار رہی ہے۔

کمانڈو اورنگ زیب کہنے لگا۔

"اب تم کیا رائے دیتے ہو؟ ہمیں یہاں سے نکلنا چاہئے یا نہیں؟ میرا خیال ہے اگر ہم اس وقت سٹیشن پر چلے جاتے تو اس شہر سے فرار ہونے میں کامیاب ہو سکتے تھے۔ اب معاملہ مشکل لگتا ہے۔"

میں نے اسے کہا۔

"کوئی مشکل نہیں ہے۔"

ہم چائے کی دکان کے کونے میں بیٹھے چائے پیتے ہوئے دبی آواز میں پنجابی میں گفتگو کر رہے تھے۔ ہمارے آس پاس کوئی گاہک نہیں بیٹھا تھا۔ پھر بھی میں نے احتیاط سے کام لیتے ہوئے اورنگ زیب سے کہا۔

"چلو کمرے میں چل کر باتیں کرتے ہیں"

ہم اٹھ کر اپنے کمرے کی طرف چلے۔ سرائے کی ڈیوڑھی میں سرائے کے مالک حاجی صاحب بیٹھے تھے۔ کہنے لگے۔

"تم نے کچھ سنا بھائی؟"

انہوں نے بڑی راز داری سے ہمیں اپنے پاس بلا کر کہا۔

"رات انڈیا کے دو جہاز کشمیری کمانڈو نے تباہ کر دیئے ہیں۔ بھائی جب تک بھارت مظلوم کشمیریوں کی آزادی کا حق دبا کر وہاں بیٹھا رہے گا اور کشمیریوں پر ظلم کرتا رہے گا اور پھر تو یہی کچھ ہو گا"

میں نے کہا۔

"حاجی صاحب ہم نے ابھی ابھی یہ خبر سنی ہے افسوس ہوا ہے ہمیں تو۔ آخر ہمارے اپنے دیش ہی کا نقصان ہوا ہے"

حاجی صاحب چپ ہو گئے۔ دبی زبان میں صرف اتنا کہا۔

"لیکن ہماری حکومت کو بھی تو کچھ سوچنا چاہئے بھائی۔"

ہم ہوں ہاں کرتے اوپر اپنے کمرے میں آگئے۔ ہمارے پاس ہمارے کمانڈو ہونے کا ثبوت ایک ایک کمانڈو چاقو ہی تھا۔ میں نے اورنگ زیب سے کہا۔

"کچھ پتہ نہیں آگے چل کر حالات کیا صورت اختیار کر لیں۔ اس لئے ہمیں کچھ باتیں ابھی سے طے کر لینی چاہئیں۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ کل سے ہم یہاں اکٹھے نہیں رہیں گے۔ یا میں یہاں رہوں گا یا تم یہاں رہنا اور میں شہر کی کسی دوسری سرائے میں چلا جاؤں گا۔ دوسری بات یہ ہے کہ اب ہمیں موقع ملتے ہی الگ الگ اس شہر سے فرار ہونا ہو گا۔ تم ایک تربیت یافتہ کمانڈو ہو۔ تم خفیہ پولیس والوں کو پہچان لینے کی صلاحیت رکھتے ہو۔ تم اکیلے موقع محل دیکھ کر ریلوے سٹیشن پر جاؤ گے اور وہاں سے دلی اور دلی سے سری نگر پہنچنے کی کوشش کرو گے۔ میں اپنے طور پر اس شہر سے کسی نہ کسی طرح نکلوں گا اور واپس ناگ پور میجر شرت دیوان کے ہاں پہنچنے کی کوشش کروں گا۔ میں ابھی کچھ دیر میجر شرت کے پاس رہنا چاہتا ہوں۔ وہ ملٹری انٹیلی جینس کی ڈیفنس برانچ کا میجر ہے۔ حالات نازک صورت اختیار کرتے جا رہے ہیں بھارت نے پاکستان پر بھرپور حملے کا ناپاک منصوبہ تیار کر لیا ہوا ہے۔ میں اس فوجی منصوبے کے مزید خفیہ راز معلوم کرنا چاہتا ہوں۔ یہ راز مجھے میجر شرت دیوان کے ساتھ رہ کر ہی حاصل ہو سکتے ہیں۔ تیسری بات یہ ہے کہ ہمیں اپنے اپنے کمانڈو چاقو کہیں پھینک دینے چاہئیں۔ اگر کسی جگہ ہماری تلاشی لی گئی یا ہماری چیکنگ ہوئی تو یہ چاقو ہمارا کمانڈو ہونا ثابت کر دیں گے تمہارا کیا خیال ہے؟"

کمانڈو اورنگ زیب کہنے لگا۔

"تم ٹھیک کہتے ہو۔ ہم ایسا ہی کریں گے میں اسی سرائے میں رہوں گا۔ تم کسی

دوسری سرائے میں چلے جانا۔ میں حالات کے معمول پر آتے ہی سری نگر کی طرف نکل جاؤں گا۔ تم ناگ پور چلے جانا۔ باقی کمانڈو چاقو ہم آج ہی کہیں غائب کر دیتے ہیں۔ ذرا شام ہو جانے دو۔ میں انہیں لے جا کر کسی نالے میں پھینک آؤں گا۔"

میں نے اپنا چاقو نکال کر کمانڈو اورنگ زیب کو دے دیا۔ اس نے اپنا چاقو بھی نکالا اور دونوں کو اخبار میں اچھی طرح سے لپیٹ کر چارپائی کے نیچے رکھ دیا۔ دوپہر کو ہم بازار میں کھانا کھانے گئے تو ہمیں فوج اور پولیس کی دو تین گاڑیاں چوک میں کھڑی نظر آئیں۔ کچھ فوجی بھی وہاں کھڑے تھے۔ ہم خاموشی سے اس چھوٹے سے ہوٹل میں داخل ہو گئے۔ جہاں سے ہم اکثر کھانا کھایا کرتے تھے۔ یہ مدراسی ہوٹل تھا۔ ہم نے کھانا کھایا اور وہاں بیٹھنے رہنے کی بجائے واپس اپنے کمرے میں آگئے۔ آتی دفعہ ہم نے چوک کی طرف نگاہ اٹھا کر دیکھا۔ فوجی اور پولیس کی گاڑیاں ابھی تک وہیں کھڑی تھیں۔ اورنگ زیب کہنے لگا۔

"کہیں فوج اور پولیس اس علاقے کی ناکہ بندی تو نہیں کر رہی؟"

میں نے کہا۔

"اس علاقے میں کوئی ایسی خاص بات نہیں ہے۔ یہاں کوئی ہوٹل وغیرہ بھی نہیں۔ صرف یہی ایک سرائے ہے۔ پولیس اور فوج ویسے ہی اپنی سرگرمیاں دکھا رہی ہے۔"

ہم کمرے میں آکر چارپائیوں پر لیٹ گئے اور باتیں کرنے لگے۔ تھوڑی دیر بعد جب سورج غروب ہونے لگا تو اورنگ زیب بولا۔

"میرا خیال ہے ہم چاقوؤں کو یہاں سے کہیں باہر لے جانے کی بجائے کیوں نہ پیچھے جو کوڑا کرکٹ والی گلی ہے وہاں پھینک دیں؟"

میں نے کہا۔

"چونکہ میرے جانے کے بعد تمہیں اسی سرائے میں رہنا ہے۔ اگر کوڑا اٹھانے والے نے چاقو دیکھ لئے تو تم پر کوئی آفت نازل ہو سکتی ہے۔ اس لئے بہتر یہی ہے کہ اسے یہاں سے دور کسی گندے نالے میں پھینک آؤ۔ اگر تمہیں خطرہ محسوس ہوتا ہے تو

میں انہیں لے جا کر پھینک آتا ہوں۔"

کمانڈو اورنگ زیب نے بڑے پختہ عزم کے ساتھ کہا۔

"میں ہر خطرے سے نمٹنا جانتا ہوں۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ میں ابھی انہیں پھینک آتا ہوں۔"

یہ کہہ کر اورنگ زیب نے چارپائی کے نیچے چاقوؤں والا بنڈل اٹھا کر بغل میں دبا لیا۔ میں نے کہا۔

"کچھ دیر ٹھہر جاؤ۔ شام کا اندھیرا ہو جانے دو"

وہ دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔

"تم کنڈی لگا لو۔ میں ابھی گیا۔ ابھی آیا۔"

وہ کمرے سے نکل گیا۔ میں نے اٹھ کر کنڈی لگا دی۔ گلی کی طرف جو کھڑکی کھلتی تھی اس میں سے جھانک کر دیکھا۔ اورنگ زیب بغل میں اخبار کا بنڈل دبائے سر جھکائے باہر نکلا اور گلی میں خاموشی سے شریفانہ چال چلتا چوک میں جا کر ایک طرف مڑ گیا۔ میں چارپائی پر بیٹھ گیا اور سوچنے لگا کہ کل کمانڈو اورنگ زیب تو اسی سرائے میں رہے گا۔ میں شہر کی کسی دوسری سرائے میں چلا جاؤں گا۔ سرائے کے مالک حاجی صاحب سے کہہ دوں گا کہ میں ایک ضروری کام سے مدراس جا رہا ہوں۔ میرا ساتھی یہیں رہے گا۔ دو ایک دن میں میں بھی واپس آ جاؤں گا۔ میں چارپائی پر لیٹ گیا۔ جیکٹ کی جیب سے سگریٹ کا پیکٹ نکال کر سگریٹ سلگایا اور سوچنے لگا کہ خدا کا شکر ہے ہم نے بڑی کامیابی سے اپنے مشن کو انجام تک پہنچا دیا۔ اور یوں اس اسلحہ کو سمندر کی تہہ میں ہمیشہ کے لئے غرق کر دیا جو کشمیر کے محاذ پر اور پاکستان کے خلاف استعمال کیا جانے والا تھا۔ اب مجھے سب سے زیادہ فکر اس بات کی لگی تھی کہ کسی طرح مجھے یہ فوجی راز معلوم ہو جائے کہ بھارت پاکستان پر کب حملہ کرنے والا ہے تا کہ میں اپنے پاکستانی بھائیوں کو خبردار کر دوں کہ دشمن فلاں تاریخ کو حملہ کر رہا ہے۔ یہ ٹاپ سیکرٹ فوجی راز تھا۔ عام طور پر اس کی خبر فوجی ہائی کمانڈ کے دو ایک ٹاپ رینک کے افسروں کے سوا اور کسی کو نہیں ہوتی۔ میرا نہیں خیال

تھا کہ ملٹری انٹیلی جنس کے میجر شرت دیوان کو اس راز کا علم ہو۔ پھر بھی مجھے اگر کہیں کوئی سراغ مل سکتا تھا تو میجر شرت دیوان سے ہی مل سکتا تھا۔ کیونکہ وہ بھارتی فوج کی ڈیفنس برانچ کی ملٹری انٹیلی جنس کا آفیسر تھا۔ اسے ضرور معلوم ہو گا کہ بھارت نے کس مہینے کی کون سی تاریخ کو پاکستان پر حملہ کرنے کا پروگرام طے کیا ہے۔ یہ تو یقینی بات تھی اور میں نے خود اسے سیکرٹ فائل میں بھی دیکھ لیا تھا اور میجر شرت دیوان اور اس کے سکھ فوجی افسر کی زبان سے بھی سن لیا تھا کہ بھارت پاکستان پر بھرپور حملہ کرنے والا ہے اور یہ حملہ پاکستان کی کئی ایک سرحدوں پر بیک وقت کیا جائے گا۔

جب سے یہ راز مجھے معلوم ہوا تھا۔ میرے اندر ایک بے چینی سی لگی ہوئی تھی۔ یہ میرے وطن پاکستان کی سلامتی کا سوال تھا۔ میں ہر قیمت پر اور ہر حالت میں اس ٹاپ سیکرٹ جارحانہ منصوبے کی تفصیلات اور خاص طور پر پاکستان پر حملے کی تاریخ معلوم کرنا چاہتا تھا اور یہ معلومات مجھے میجر شرت دیوان کے پاس رہ کر ہی معلوم ہو سکتی تھیں یہی کچھ سوچتے سوچتے میرا سگریٹ ختم ہو گیا۔ میں نے سگریٹ نیچے فرش پر پھینک دیا۔ اس دوران نیچے گلی سے کسی نے چائے والے کو آواز دے کر چائے کے لئے کہا۔ میرا دل چائے پینے کو چاہا۔ کمانڈو اورنگ زیب ابھی تک نہیں آیا تھا۔ میں نے سوچا اتنی دیر کیوں نہ سامنے والے ہوٹل یعنی چائے کی دکان میں بیٹھ کر چائے پی جائے۔ یہ سوچ کر میں اٹھا۔ کمرے کو باہر سے بند کیا۔ تالا لگانے کی ضرورت نہیں تھی۔ کیونکہ اب کمرے میں کوئی قابل اعتراض شے نہیں رہ گئی تھی۔ میں سیڑھیاں اتر کر سرائے کی ڈیوڑھی میں سے نکل کر جیسے ہی گلی میں آیا ایک بند گاڑی ایک دم سے سٹارٹ ہو کر چیختی ہوئی تیزی سے میرے آگے آ کر رک گئی۔ اس سے پہلے میں سنبھلتا اور کچھ سوچ سکتا گاڑی میں سے چار فوجی جوان چھلانگیں لگا کر نکلے اور انہوں نے مجھے قابو کر لیا۔

یہ سب کچھ ایک یا دو سیکنڈ کے اندر اندر ہو گیا۔ میرے ہاتھ پیچھے کر کے ہتھکڑی لگا دی گئی اور گن پوائنٹ پر یہ لوگ مجھے دھکیلتے ہوئے گاڑی کے اندر لے گئے۔ چاروں فوجی بھی گاڑی کے اندر آ گئے اور اس کے ساتھ ہی گاڑی جس کا انجن چل رہا تھا چل

پڑی۔ یہ فوجی گاڑی تھی۔ سٹیشن ویگن کی طرز کی تھی۔ اندر چھت کے ساتھ چھوٹی سی بتی جل رہی تھی۔ میں سمجھ گیا کہ میری مخبری ہوئی ہے۔ مجھے فوراً اس مدراسی بھکاری کا خیال آگیا جو رات کے وقت ہمیں دو بار ملا تھا اور جس نے مجھ سے سگریٹ لئے تھے۔ وہ یقیناً پولیس کا مخبر تھا۔ میں نے دو باتوں کے لئے خدا کا شکر ادا کیا۔ ایک تو یہ کہ کمانڈو اورنگ زیب اس وقت میرے ساتھ نہیں تھا۔ دوسرے یہ کہ میرے پاس کمانڈو چاقو نہیں تھا جسے میں ہمیشہ اپنی پتلون کے اندر چھپائے رکھتا تھا۔

میرے ذہن نے تیزی سے کام کرنا شروع کر دیا تھا۔ ایک بات بالکل واضح تھی کہ ان لوگوں نے مجھے محض شک شبے کی بناء پر پکڑا ہے۔ مخبر نے انہیں خبر کر دی تھی کہ دو آدمی جو کسی دوسرے شہر کے رہنے والے ہیں سرائے میں ٹھہرے ہوئے ہیں اور رات کو انہیں دو بار بندرگاہ کے علاقے سے آتے دیکھا گیا ہے۔ میں نے دیکھا تھا کہ جب مجھے فوجی گاڑی میں دھکیلا جا رہا تھا تو تین فوجی جوان سرائے کے اندر گھس گئے تھے۔ وہ یقیناً مخبر کی اطلاع کے مطابق کمانڈو اورنگ زیب کو پکڑنے اوپر گئے ہوں گے۔ مگر انہیں وہاں اورنگ زیب نہیں مل سکتا تھا اور کمرے میں میرے کشمیری کمانڈو یا دہشت گرد ہونے کا کوئی ثبوت بھی موجود نہیں تھا۔ اس اعتبار سے وہ مجھ پر کوئی جرم ثابت نہیں کر سکتے تھے۔ میں نے انہی حقائق کی روشنی میں ایک کہانی دماغ میں بنالی کہ پوچھ گچھ کے وقت میں یہی کہانی بیان کروں گا۔ یہ تو یقینی بات تھی کہ ملٹری انٹیلی جینس والے مجھے اپنے وحشیانہ تشدد کا نشانہ ضرور بنائیں گے۔ میں دل میں یہی دعا مانگ رہا تھا کہ کمانڈو اورنگ زیب چاقو نالے میں پھینکنے کے بعد جلدی واپس نہ آجائے۔

میں نے اپنے ساتھ بیٹھے ہوئے فوجیوں سے ٹوٹی پھوٹی اردو میں پوچھا۔

"تم لوگوں نے مجھے کس لئے پکڑا ہے؟"

یہ چار فوجی تھے۔ ان کے پاس سٹین گنیں بھی تھیں۔ یہ معمولی قد کاٹھ کے مدراسی فوجی لگتے تھے۔ ان میں سے ایک نے مجھے گردن سے پکڑ کر زور سے جھٹکا دیا اور ہندوستانی میں مدراسی لہجے میں کہا کہ تمہیں ابھی معلوم ہو جائے گا کہ تمہیں کیوں پکڑا گیا ہے۔ ابھی

تمہارا دوسرا ساتھی بھی پکڑا گیا ہو گا۔ میں نے کچھ کہنا چاہا تو ایک فوجی نے زور سے اپنی کہنی میری پسلیوں میں ماری اور کہا۔

"بولے گا نہیں۔"

اور اس نے انگریزی میں مجھے گالی بھی دی۔ میں خاموش ہو کر بیٹھا رہا۔ گاڑی خدا جانے کہاں کہاں سے گزرتی رہی شام گہری ہو گئی تھی۔ گاڑی کی اگلی کھڑکی میں سے فوجی ڈرائیور اور اس کے ساتھ بیٹھا ہوا دوسرا فوجی مجھے نظر آرہے تھے۔ باہر اندھیرا گہرا ہونے لگا تھا۔ گاڑی ایک گیٹ کے سامنے آکر آہستہ ہو گئی۔ میں نے کنکھیوں سے اگلی سیٹ کے شیشے میں سے دیکھا۔ گیٹ کے باہر ایک مسلح فوجی پہرہ دے رہا تھا۔ یہ کوئی فوجی ہیڈ کوارٹر وغیرہ تھا۔ گاڑی گیٹ کے اندر جا کر ایک طرف رک گئی۔ مجھے کھینچ کر باہر نکالا گیا اور دو فوجی مجھے لے کر سامنے والی بارک کی طرف چلے۔ ایک بارک کے باہر فوجی گارڈ کھڑا تھا۔ اس نے سلیوٹ مار کر سلاخوں والا دروازہ کھول دیا۔ یہ ظاہر ہے فوجی حوالات یعنی کوارٹر گارڈ تھی۔ مجھے اس میں بند کر کے دروازے کو باہر سے تالا لگا دیا گیا۔ جو فوجی مجھے لائے تھے وہ چلے گئے۔ باہر ایک کالے رنگ کا فوجی سٹین گن لئے پہرہ دے رہا تھا۔ میں حوالات کے فرش پر ایک طرف ہو کر بیٹھ گیا۔ پوچھ گچھ کے وقت مجھے جو کہانی بیان کرنی تھی وہ میں نے شروع سے آخر تک سوچ لی تھی۔ کوئی ایک گھنٹے بعد مجھے وہاں سے نکال کر ایک دوسرے بارک کے کمرے میں لے جایا گیا۔

وہاں دیوار کے ساتھ ایک طرف تین چار کرسیاں پڑی تھیں۔ ایک سٹریچر بھی بچھا ہوا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ یہ اذیت گاہ ہے۔ ٹارچر سیل ہے۔ یہاں مجھ پر تشدد کیا جائے گا اور مجھے وہ راز معلوم کرنے کی کوشش کی جائے گی جو میں کبھی زبان پر نہیں لاؤں گا۔ مجھے اس بات میں اپنی شکست محسوس ہو رہی تھی کہ میں اتنی آسانی سے پکڑ لیا گیا تھا۔ کمانڈو اتنی آسانی سے نہیں پکڑا جاتا۔ لیکن ہماری مخبری ہو گئی تھی اور جو بھکاری ہمیں رات کے وقت ملا تھا وہ خفیہ پولیس کا آدمی تھا۔ اس نے ہماری اطلاع سول پولیس کو کر دی تھی اور سول پولیس نے ملٹری انٹیلی جینس کو اطلاع دے دی تھی۔ کیونکہ یہ کیس فوجی تھا۔ اور

یقیناً ملٹری انٹیلی جنیس نے بھی شہری پولیس کو ہدایت کر دی ہو گی کہ کہیں کسی مشکوک شخص کی خبر ملے فوراً ہمیں اطلاع کی جائے۔

سٹریچر کے آگے ایک لکڑی کا سٹول پڑا تھا۔ میں اس پر بیٹھ گیا۔ تین فوجی افسر اندر داخل ہوئے۔ ان میں سے ایک کیپٹن کی وردی میں تھا اور اس کا رنگ دوسرے فوجیوں کے مقابلے میں گورا تھا۔ وہ پنجابی یا شمالی بھارت کے کسی شہر کا لگتا تھا۔ دوسرے فوجی ایک طرف کھڑے ہو گئے۔ کیپٹن کرسی کھینچ کر میرے سامنے لے آیا اور میری طرف گھور کر دیکھنے لگا۔ اس نے بڑی صاف اردو میں کہا۔

"تم پاکستان کے کس شہر کے رہنے والے ہو؟ تمہارا رنگ روپ بتا رہا ہے کہ تم پنجابی ہو اور لاہور یا گوجرانوالہ کے ہو۔"

میں نے اس فوجی کیپٹن کی انٹیروگیشن کا جس طرح سے جواب دینا تھا وہ میں نے پہلے سے سوچ رکھا تھا۔ میں نے بغیر کسی گھبراہٹ کے کہا۔

"سر! میں پنجابی ضرور ہوں اور مسلمان بھی ہوں۔ لیکن میرا تعلق پاکستان سے نہیں ہے میں مالیر کوٹلہ کا رہنے والا ہوں اور اپنے ایک دوست کے ساتھ یہاں روزگار کی تلاش میں آیا تھا۔"

فوجی کیپٹن نے آنکھیں سکیڑ رکھی تھیں اور ہونٹوں پر بڑی طنزیہ مسکراہٹ تھی۔ جب میں اپنی بات ختم کر چکا تو وہ بولا۔

"ہندوستان آزاد ہونے کے بعد تو مشرقی پنجاب کے سارے مسلمان پاکستان چلے گئے تھے۔ تم مالیر کوٹلہ میں کیسے رہ گئے؟"

اس سے ثابت ہو گیا تھا کہ اس فوجی کیپٹن کو معلوم نہیں کہ سکھوں نے مشرقی پنجاب کے تمام شہروں اور دیہات کے مسلمانوں کو شہید کر دیا تھا یا انہیں پاکستان ہجرت کرنے پر مجبور کر دیا تھا مگر صرف مالیر کوٹلہ ایک ایسی ریاست تھی جہاں کے مسلمانوں کو کچھ نہیں کہا گیا تھا۔ اس کی وجہ ایک خاص تاریخی واقعہ تھا۔ جو میں پہلے کہیں بیان کر چکا ہوں۔ میں نے فوجی کیپٹن کو یہ تاریخی واقعہ بھی مختصر الفاظ میں بیان کر دیا اور کہا کہ مالیر

کوٹلہ کے سارے پنجابی مسلمان محفوظ رہے تھے۔

"میرے ماں باپ بچپن میں ہی فوت ہو گئے تھے۔ میں چچا کے ہاں رہ رہا تھا خراد کا تھوڑا بہت کام سیکھا تھا۔ مگر چچا مجھ سے نوکروں سے بھی بدتر سلوک کرتے تھے۔ آخر میں نے اپنے دوست کے ساتھ مل کر پروگرام بنایا کہ جنوبی بھارت چل کر کام تلاش کرتے ہیں۔ ہم نے سنا تھا کہ جنوبی بھارت میں روزگار عام مل جاتا ہے۔"

فوجی کیپٹن مجھے مسلسل طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ گھور کر دیکھتا رہا۔ پھر اٹھتے ہوئے بولا۔

"تم سے کل باتیں ہوں گی۔"

اس نے اس کے بعد کوئی بات نہ کی اور دوسرے فوجیوں کے ساتھ باہر نکل گیا۔ سلاخوں والا دروازہ بند کر کے باہر سے اسے تالا لگا دیا گیا۔ کوئی گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے بعد مجھے کھانے کو تھوڑے سے چاول اور دال دی گئی۔ یہ دونوں چیزیں کیلے کے پتے پر ڈال کر سلاخوں میں سے مجھے اندر پکڑا دی گئی۔ میں سوچنے لگا کہ یا تو اس شمالی بھارت کے فوجی کیپٹن نے میری بات کا یقین کر لیا ہے یا پھر یہ انتہائی عیار شخص ہے اور مجھے کشمیری کمانڈو ثابت کرنے کے لئے اس کے پاس کوئی حتمی ثبوت موجود ہے۔

وہ رات گزر گئی۔

دوسرے دن مجھے چائے کا ایک گلاس اور ایک بند دیا گیا۔ دوپہر کو پھر تھوڑے سے چاول اور دال کیلے کے پتے پر ڈال کر سلاخوں کے نیچے سے مجھے پکڑا دی گئی۔ باہر ہر چار گھنٹے کے بعد گارڈ کی ڈیوٹی بدل جاتی تھی اور پہلے فوجی کی جگہ دوسرا فوجی آجاتا تھا۔ دوپہر بھی گزر گئی۔ مجھ سے پوچھ گچھ کرنے کوئی نہ آیا۔ شام ہوگئی۔ سلاخوں والے دروازے کے باہر سے اس فوجی گیریزن یا چھاؤنی جو کچھ بھی وہ جگہ تھی مجھے احاطے کی سامنے والی فوجی بارکیں نظر آرہی تھیں۔ فوجی گاڑیاں اور فوجی آتے جاتے رہتے تھے۔ شام کے وقت بارکوں کی بتیاں روشن ہوگئی تھیں۔ میں سوچنے لگا کہ مجھ سے ابھی تک انٹیروگیشن کیوں نہیں کی گئی۔ جب رات ہوگئی تو وہی انڈین فوجی کیپٹن دو فوجی سپاہیوں کے ساتھ اندر آگیا۔ کرسی کھینچ کر میرے سامنے بیٹھ گیا۔ اس نے جیب سے سگار نکال کر سلگایا۔ ایک سگار مجھے بھی پیش کیا۔ میں نے شکریے کے ساتھ کہا۔

"میں سگار نہیں پیتا"

اس نے سگار کیس جیب میں رکھ لیا اور کرسی کے ساتھ ٹیک لگا کر بڑے اطمینان سے بیٹھ گیا اور میری طرف مسلسل گھورتے ہوئے بولا۔

"تو تم یہاں روزگار کی تلاش میں اپنے دوست کے ساتھ آئے تھے؟"

"جی ہاں سر!"

میں نے بڑے بھولے بھالے انداز میں جواب دیا۔ اس نے دوسرا سوال پوچھا۔

"تم پانڈی چری میں کہاں کہاں پھرتے رہے ہو؟"

میں نے کہا۔

"دن کے وقت شہر میں گھوم پھر کر کام تلاش کرتے تھے ہم دونوں۔ مگر خراد کی دکان یہاں کہیں نظر نہ آئی۔ اب یہی سوچا تھا کہ کسی دوسرے شہر جا کر کام تلاش کرتے ہیں"

"تم بندرگاہ کی طرف تو کبھی نہیں گئے ہو گے؟"

فوجی کیپٹن نے بڑے معنی خیز انداز میں پوچھا۔ میں نے فوراً کہا۔

"سر! ہم نے تو بندرگاہ دیکھی تک نہیں۔ ادھر جانے کی ہمیں کیا ضرورت تھی سر!"

فوجی کیپٹن نے ایک فوجی کو اشارہ کیا۔ وہ باہر نکل گیا۔ دوسرے لمحے واپس آیا تو ایک بار تو میرا دل دھک سے رہ گیا۔ اس کے ساتھ وہی بوڑھا انگریز سیاح اور اس کی بیٹی الزبتھ تھی جو مجھے پانڈی چری کی ڈائیونگ کلب میں ملے تھے۔ دونوں باپ بیٹی اندر آکر کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ فوجی کیپٹن نے مجھ سے پوچھا۔

"ان لوگوں کو پہچانتے ہو؟"

میں نے صاف انکار کر دیا۔ سوائے انکار کرنے کے میں کچھ اور کر بھی نہیں سکتا تھا۔ فوجی کیپٹن نے بوڑھے انگریز سے ہندوستانی میں پوچھا۔

"کیا آپ اسے پہچانتے ہیں؟"

بوڑھے انگریز نے انگریزوں والی اردو بولتے ہوئے کہا۔

"میں اسے پہچانتا ہوں۔ یہی وہ نوجوان ہے جو ڈائیونگ کلب کے ریستوران میں مجھے اور میری بیٹی کو ملا تھا اور اس نے ہمارے ساتھ سمندر میں غوطہ خوری بھی کی تھی۔ یہ بڑا ماہر غوطہ خور ہے اور اس نے ہم سے آکسیجن ماسک کی ڈیوریشن کے بارے میں بھی پوچھا تھا کہ کیا کوئی ایسا آکسیجن ماسک بھی ہے جس کو پہن کر آدمی سمندر کے اندر زیادہ سے زیادہ دیر تک رہ سکے؟"

"پھر تم لوگوں نے اسے کیا بتایا تھا؟"

فوجی کیپٹن نے بوڑھے انگریز سے پوچھا۔

بوڑھے انگریز کی بیٹی الزبتھ نے اس کے جواب میں کہا۔

"میں نے خود اسے کلب کی الماری میں رکھے ہوئے وہ آکسیجن ماسک دکھائے جن کی سمندر کے نیچے ڈیوریشن آدھ گھنٹہ ہوتی ہے"

فوجی کیپٹن نے الزبتھ سے پوچھا۔

"پھر اس نے کیا کہا تھا؟"

الزبتھ بھی ہندوستانی میں بول رہی تھی۔ اس نے کہا۔

"پھر اس نے پوچھا تھا کیا کوئی فالتو آکسیجن سلنڈر بھی ہوتا ہے جو اس ماسک کے ساتھ لگا کر آدمی سمندر کے نیچے آدھ گھنٹے سے زیادہ وقت گزار سکتا ہے؟"

فوجی کیپٹن نے الزبتھ سے پوچھا۔

"پھر تم نے کیا جواب دیا تھا؟"

الزبتھ کہنے لگی۔

"میں نے اسے فالتو آکسیجن سلنڈر دکھا کر کہا تھا کہ اگر غوطہ خور یہ سلنڈر بھی اپنے ساتھ رکھ لے تو سمندر کے نیچے کافی دیر تک غوطہ خوری کر سکتا ہے؟"

فوجی کیپٹن نے بوڑھے انگریز سے سوال کیا۔

"اس کے بعد ڈائیونگ کلب سے جو آکسیجن ماسک اور آکسیجن سلنڈر رات کو چوری ہو گئے تھے وہ کون کون سے تھے؟"

بوڑھے انگریز نے کہا۔

"کلب کے مالک کے بیان کے مطابق وہ آدھ گھنٹے ڈیوریشن والے آکسیجن ماسک اور دو گیس کے فالتو سلنڈر تھے"

فوجی کیپٹن نے ایک بار پھر الزبتھ اور بوڑھے انگریز سے پوچھا۔

"کیا آپ کو یقین ہے کہ یہی وہ نوجوان تھا؟"

دونوں نے اس بات کی تصدیق کی کہ میں ہی وہ نوجوان ہوں جو غوطہ خوری کے میں انہیں ملا تھا اور جس نے کلب کے آکسیجن ماسک کے بارے میں طرح طرح کے

گئے تھے اور یہ کہ وہ مجھے اپنی گاڑی میں چھوڑنے اس کی سرائے والے چوک تک بھی گئے تھے۔ فوجی کیپٹن نے دونوں کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا۔

"اب آپ لوگ جا سکتے ہیں"

بوڑھا انگریز سیاح اور اس کی بیٹی اٹھ کر مجھے غور سے دیکھتے ہوئے چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد فوجی کیپٹن سگار کی راکھ جھاڑتے ہوئے میری طرف جھک کر کہنے لگا۔

"میرا خیال ہے اب تمہیں اعتراف کر لینا چاہئے کہ تم پاکستانی کمانڈو ہو اور تم نے ہی اپنے ساتھی سے مل کر ہمارے بحری جہازوں کے نیچے ٹائم بم لگا کر انہیں تباہ کیا ہے۔"

میں نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے بڑے اطمینان سے کہا۔

"یہ بالکل غلط بات ہے۔ اس انگریز اور اس کی بیٹی نے میرے بارے میں غلط بیانی کی ہے۔ میرا کسی پاکستانی کمانڈو سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ میں کبھی کسی کلب میں نہیں گیا۔ میں تو معمولی مڈل جماعت پاس ہوں۔ روزگار کی تلاش میں یہاں در بدر پھرتا رہا ہوں آپ لوگ مجھے جان بوجھ کر پھنسا رہے ہیں۔"

اس کے ساتھ ہی فوجی کیپٹن نے میرے منہ پر اس زور سے تھپڑ مارا کہ میرا چہرہ دوسری طرف ہو گیا اور ساتھ ہی مجھے اپنے ہونٹوں پر خون کا ذائقہ محسوس ہوا۔ یقین کریں میری آنکھوں کے آگے تارے سے ناچنے لگے۔ کیپٹن اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے زور سے ٹھڈا میرے پیٹ میں مارا۔ میں سٹول پر سے گر پڑا۔ وہ مجھے مار رہا تھا۔ اور ساتھ ساتھ گالیاں بھی دیتا جا رہا تھا۔ جب وہ تھک گیا تو اس نے ایک فوجی سے انگریزی میں کہا۔

"اس کو ٹارچر سیل میں لے چلو"

میرا جسم اگرچہ کافی مضبوط تھا مگر اس فوجی کیپٹن کی بے تحاشا مار پیٹ سے میرا جوڑ جوڑ درد کر رہا تھا۔ دو فوجی مجھے پکڑ کر گھسیٹتے ہوئے کمرے سے باہر لے گئے۔ ٹارچر سیل قریب ہی ایک تنگ سے نیم روشن کمرے میں بنایا گیا تھا۔ انہوں نے مجھے وہاں دھکیل دیا اور دروازہ بند کر کے باہر تالا لگا دیا۔ یہ دروازہ لوہے کا تھا اور سلاخ دار تھا۔ میں فرش پر ... اپنے جسم کی چوٹوں کو سہلانے لگا اور سوچنے لگا کہ اب مجھے کیا حکمت عملی اختیار کرنی

چاہئے۔ ملٹری انٹیلی جینس پولیس نے ہمارے بارے میں سارے کوائف بالکل صحیح صحیح
اکٹھے کر لئے تھے۔ جس رات بحری جہازوں کو غرق کیا گیا تھا اس سے ایک رات پہلے
ڈائیونگ کلب میں سے دو آکسیجن ماسکوں اور فالتو گیس سلنڈروں کا چوری ہونا اس بات کا
ثبوت تھا کہ یہ چیزیں ان ہی کمانڈوز نے چرائی ہیں جنہوں نے بعد میں جہازوں کے پیندوں
میں سمندر کے اندر غوطہ خوری کر کے ٹائم بم لگائے تھے۔ بحریہ کی انٹیلی جینس کو ڈوبے
ہوئے جہازوں کے معائنے سے معلوم ہو گیا ہو گا کہ جہازوں کے پیندوں میں بم لگا کر تباہ کیا
گیا ہے اور کمانڈوز فولادی تار کاٹ کر جہازوں کے پاس آئے تھے۔ میں زیادہ سے زیادہ
یہی موقف اختیار کر سکتا تھا کہ بوڑھے انگریز اور اس کی بیٹی کو جان بوجھ کر گواہ بنایا گیا ہے
اور ان سے غلط بیان میرے نام منسوب کیا گیا ہے۔ مگر یہ بڑا کمزور موقف تھا۔ اس کو ثابت
کرنے کے لئے میرے پاس کوئی دلیل نہیں تھی۔ بس میں انکار ہی کر سکتا تھا کہ میں
پاکستانی کمانڈو نہیں ہوں۔ جیسا کہ یہ بات واضح ہو چکی تھی کہ بحریہ اور ملٹری کی انٹیلی
جینس کو میرے بارے میں پورے ثبوت مل گئے تھے۔

ٹارچر سیل میں مجھ پر وحشیانہ تشدد شروع ہو گیا۔ جیسی جیسی اذیت مجھے دی جا سکتی
تھی دی گئی۔ یہ ٹارچر مجھے اس بھارتی فوجی کیپٹن کی نگرانی میں دی جا رہی تھی۔ جب درد
حد سے گزر جاتا تو کیپٹن میرے قریب ہو کر مجھ سے کہتا۔

"اگر اب بھی تم بتا دو کہ تمہارا دوسرا کمانڈو ساتھی کہاں ہے اور پانڈی چری میں
تمہارے اور ساتھی کہاں کہاں روپوش ہیں تو تمہیں مزید کچھ نہیں کہا جائے گا۔ ہم تمہیں
ہسپتال میں بھجوا دیں گے اور پھر آزاد کر دیں گے۔"

یہ کام وہ زندگی میں کبھی بھول کر بھی نہیں کر سکتے تھے۔ میں ہر بار یہی کہتا۔

"میں پاکستانی کمانڈو نہیں ہوں۔ میرا کوئی کمانڈو ساتھی نہیں ہے۔"

وہ ساری رات مجھ پر شدید وحشیانہ تشدد ہوتا رہا۔ کبھی میری کمانڈو ٹریننگ مجھے تشدد
کی اذیت سے کچھ دیر کے لئے نجات دلا دیتی اور کبھی تشدد کی تکلیف میری ٹریننگ کی
حدود سے آگے گزر جاتی اور مجھ پر واقعی نیم بے ہوشی طاری ہو جاتی۔ مجھ پر جس قسم کا

تشدد کیا گیا اور جیسی اذیت دی گئی میں ان کی تفصیلات میں نہیں جانا چاہتا۔ بس یوں سمجھ
لیں کہ ایک مردہ بے جان جسم اناٹمی کے ڈاکٹروں کے حوالے کر دیا گیا تھا اور وہ اس کی چیر
پھاڑ کر رہے تھے۔ اگر کچھ خیال رکھا جا رہا تھا تو صرف اس بات کا کہ میں مر نہ جاؤں اور
میری سانس کی آمد و رفت بحال رہے۔ یہ رعایت بھی مجھے اس لئے دی گئی تھی کہ وہ مجھ
سے اپنے مطلب کی معلومات حاصل کرنا چاہتے تھے جس میں وہ ابھی تک ناکام رہے تھے۔

دوسرے روز مجھ پر کوئی تشدد نہ کیا گیا۔ مجھے اٹھا کر ایک دوسرے کمرے میں ڈال گیا
جہاں ایک ڈاکٹر نے مجھے تھوڑی سی طبی امداد دی۔ میرے زخموں پر دوائی لگائی۔ مجھے دو
انجکشن بھی دیئے جس کے بعد مجھے نیند آگئی۔ نیند کیا آئی تھی بس میں بے ہوش ہو گیا
تھا۔ جب ہوش آیا تو میں نے دیکھا کہ میں ایک سٹریچر پر لیٹا ہوا ہوں۔ چھوٹا سا تنگ کمرہ
ہے۔ دروازہ سلاخوں والا ہے۔ اس کے باہر بھی ایک بڑا کمرہ ہے جس میں میز کرسیاں لگی
ہیں۔ اس کی کھڑکیوں میں سے دن کی روشنی آ رہی ہے۔ بڑی میز پر وہی فوجی کیپٹن بیٹھا
کسی سے ٹیلی فون پر بات کر رہا ہے۔ میرے والے چھوٹے کمرے کے ساتھ ہی کیپٹن کا
بڑا کمرہ بنایا گیا تھا۔ یا کیپٹن کے بڑے آفس کے ساتھ یہ چھوٹی سی حوالات بنا دی گئی تھی۔
میں پوری طرح سے اب ہوش میں تھا۔ انجکشن اور طبی امداد کی وجہ سے میرا جسم کا درد
کافی حد تک کم ہو گیا تھا۔ میں نے سٹریچر پر لیٹے لیٹے اپنے کان کیپٹن کی باتوں پر لگا دیئے۔
وہ انگریزی میں کسی سے کہہ رہا تھا۔

"تم لوگ بالکل نکمے ہو۔ تم اس لائق نہیں ہو کہ تمہیں ملٹری انٹیلی جینس میں رکھا
جائے۔ جب پولیس اور فوج نے سارے شہر کی ناکہ بندی کر رکھی ہے تو اس پاکستانی کمانڈو
کا دوسرا ساتھی کیوں نہیں پکڑ سکے؟ وہ اتنی جلدی شہر سے کیسے بھاگ سکتا ہے۔ ہاں۔
ہاں۔ میں کچھ نہیں جانتا۔ ملٹری انٹیلی جینس کی ڈیفنس برانچ کا سینئر آفیسر میجر شرت دیوان
دو ایک روز میں خود یہاں معاملے کی تفتیش کے لئے پہنچ رہا ہے۔ میں اس کا کیا جواب
دوں گا کہ دوسرا کمانڈو کیوں نہیں پکڑا گیا۔ وہ تو میرا کورٹ مارشل کرا دے گا۔"

میجر شرت دیوان کا نام سنتے ہی میرا سارا بدن ایک بار تو خوف کے مارے بالکل سن

سا ہو گیا۔ اگر وہ یہاں آ گیا تو مجھے اس کے سامنے پیش کر دیا جائے گا۔ پھر اس کے بعد کیا ہو گا؟ بس ایک دھماکہ ہی ہو گا اور میرے سارے راز طشت از بام ہو جائیں گے۔ پاکستان اور کشمیر کے خلاف بھارتی فوجی ہائی کمانڈ کے ناپاک منصوبوں کا ایک بھی راز مجھے معلوم نہ ہو سکے گا اور اس کے بعد میرے پاس اپنی بے گناہی ثابت کرنے کے لئے کچھ نہیں ہو گا اور یہ لوگ میرا کورٹ مارشل کرنے کے بعد فوراً مجھے شوٹ کر دیں گے۔

میرے ذہن میں خیالات کا ایک ہیجان سا برپا ہو گیا تھا۔ میں سوچنے لگا کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ میجر شرت دیوان کے پانڈی چری پہنچنے سے پہلے پہلے کسی طرح میں یہاں سے فرار ہونے میں کامیاب ہو جاؤں؟ بظاہر یہ بات ناممکن لگتی تھی۔

میں نے دوبارہ اپنے کان بھارتی کیپٹن کی ٹیلی فون پر کی جانے والی گفتگو پر لگا دیئے۔

وہ فون پر کہہ رہا تھا۔

"میں تم لوگوں کو صرف کل کے دن کی مہلت دیتا ہوں۔ ہو سکتا ہے ناگ پور سے میجر شرت دیوان پرسوں شام کو ہیڈ کوارٹر پہنچ جائے۔ اگر کل تک تم لوگوں نے دوسرے مفرور کمانڈو کو نہ پکڑا تو میں تم دونوں کو کوارٹر گارڈ میں بند کر دوں گا۔"

اور اس نے ٹیلی فون بند کر دیا اور بڑبڑاتے ہوئے انگریزی میں گالیاں دینے لگا۔

ایک اور بات کا بھی مجھے پتہ چل گیا تھا کہ میں انڈیا کی ملٹری انٹیلی جینس کی حراست میں ہوں۔ یہی وجہ تھی کہ ناگ پور سے میجر شرت خود پکڑے گئے کمانڈو سے پوچھ گچھ کرنے آ رہا تھا۔ میری سمجھ میں وہاں سے فرار کی کوئی ترکیب نہیں آ رہی تھی۔ دروازہ ہر وقت مقفل رہتا تھا۔ ایک فوجی ہر وقت دروازے کے باہر کھڑا رہتا تھا۔ اگر کسی طرح سے میں اس فوجی حوالات سے نکل بھی جاؤں تو آگے کیپٹن کا کمرہ تھا۔ اس کمرے کے باہر بھی گارڈ ہر وقت ہوتی تھی۔ اس کے بعد ملٹری کے گیریزن' چھاؤنی یا ہیڈ کوارٹر کا علاقہ تھا جہاں سے میرے ایسے خطرناک کمانڈو کا فرار ہو جانا ناممکن تھا۔ لیکن میرا وہاں سے فرار ہونا انتہائی ضروری ہو گیا تھا۔ صرف میرے لئے ہی نہیں بلکہ کشمیر کی کاز اور پاکستان کی سلامتی کی خاطر میرا وہاں سے فرار ضروری تھا۔ میں نے سٹریچر پر لیٹے لیٹے آنکھیں بند کر

لیں اور سوچنے لگا کہ یہاں سے کس طرح فرار ہو سکتا ہوں۔

ان انڈین فوجیوں نے میری تلاشی لیتے وقت میرے پاس جتنے روپے تھے وہ نکال لئے تھے اور میری گھڑی بھی اپنے قبضے میں کر لی تھی۔ اب میرے پاس سوائے تین کپڑوں یعنی پتلون قمیض اور پرانی جیکٹ کے اور کچھ نہیں تھا۔ اتنے میں فوجی کیپٹن میرے پاس آ گیا۔ فوجی گارڈ نے جلدی سے کرسی لا کر میرے سٹریچر کے پاس رکھ دی۔ کیپٹن کرسی پر بیٹھ گیا۔ سگار اس کے ہاتھ میں سلگ رہا تھا۔ اس نے مجھے تحکمانہ انداز میں کہا۔

"آنکھیں کھولو"

میں نے آنکھیں کھول دیں۔ میں پہلے ہی نیم وا آنکھوں سے اسے وہاں آتا دیکھ رہا تھا۔ کیپٹن مجھے اعتماد میں لینے کے انداز میں کہنے لگا۔

"یاد رکھو۔ ہم نے تمہارے ساتھ ابھی تک بڑی نرمی کا سلوک کیا ہے لیکن ناگ پور سے جو ملٹری انٹیلی جینس کا میجر آ رہا ہے وہ بوچر یعنی قصائی کے نام سے مشہور ہے۔ وہ تمہارا پیٹ پھاڑ ڈالے گا اور تمہارے پیٹ میں جتنے راز تم نے چھپائے ہوئے ہیں وہ سارے باہر نکال لے گا۔ اس لئے تمہارے حق میں یہی بہتر ہے کہ اس کے آنے سے پہلے پہلے مجھے صرف اتنا بتا دو کہ تمہارا دوسرا مفرور ساتھی کہاں چھپا ہوا ہے اور بھارت میں تم لوگ کہاں کہاں پر یہ کام کر رہے ہو۔ میں تم سے ایک بار پھر وعدہ کرتا ہوں کہ میں تمہاری جان بچا لوں گا اور تمہیں یہاں سے برما کے شہر رنگون بھجوا دوں گا۔ وہاں سے تم بڑی آسانی کے ساتھ پاکستان جا سکو گے"

میں نے کہا۔

"سر! میں بے گناہ ہوں۔ میں پاکستانی کمانڈو نہیں ہوں۔"

"ٹھیک ہے"

کیپٹن نے کرسی سے اٹھتے ہوئے کہا۔

"اگر تم یہی چاہتے ہو کہ تمہارے جسم کی بوٹی بوٹی الگ کی جائے تو پھر میجر شرت اس کام میں ماہر ہے۔ کل نہیں تو پرسوں یہاں آ جائے گا۔"

یہ کہہ کر کیپٹن میرے کمرے سے نکل کر اپنے کمرے میں میز پر جا کر بیٹھ گیا اور کچھ لکھنے لگا۔ ڈیوٹی گارڈ نے میرے دروازے کو زور سے بند کر کے تالا لگا دیا۔ اس کا مطلب تھا کہ ناگ پور سے میجر شرت کل نہیں پرسوں وہاں پہنچ رہا تھا۔ جب میں اس لمحے کا تصور کرتا جب میجر شرت مجھے اپنے سامنے ایک پاکستانی کمانڈو کے روپ میں دیکھے گا تو میرے کانوں میں آندھیاں سی چلنا شروع ہو جاتیں۔ میجر شرت تو مجھے دھرم ویر کی حیثیت سے جانتا تھا جس نے اس کی بہن کو ڈاکوؤں کے چنگل سے نکالا تھا اور جو ہر وقت دیش بھگتی کے راگ الاپتا رہتا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ اس حیرت انگیز انکشاف کے بعد وہی میجر شرت دیوان جو مجھے اپنا چھوٹا بھائی سمجھتا تھا میری جان کا دشمن بن جائے گا اور مجھے زندہ نہیں چھوڑے گا۔ مجھے اپنی جان کی پروا نہیں تھی۔ لیکن سب سے زیادہ صدمہ اس بات کا تھا کہ میں دشمن کی قید میں مارا جاؤں گا اور ایک ایسا وسیلہ میرے ہاتھ سے ہمیشہ کے لئے نکل جائے گا جس کی مدد سے میں بھارت کے پاکستان دشمن عزائم کے ٹاپ سیکرٹ خفیہ رازوں سے واقف ہوتا رہتا تھا۔

اتنے میں دو فوجی ساتھ والے کمرے میں داخل ہوئے انہوں نے بھارتی کیپٹن کو سلیوٹ کیا۔ بھارتی کیپٹن انہیں ساتھ لے کر میرے کمرے میں آ گیا۔ دونوں فوجیوں میں سے ایک سکھ تھا اور دوسرا گورکھا۔ انہوں نے میری نبض دیکھی۔ سکھ فوجی جو کیپٹن رینک کا تھا کہنے لگا۔

"یہ اب ٹھیک ہو گیا ہے۔ اسے چیمبر فائیو میں پہنچا دو کیپٹن۔"

بھارتی کیپٹن نے کہا۔

"یس! میرا بھی یہی خیال تھا۔ ٹھیک ہے۔ میں اسے آج رات چیمبر فائیو میں پہنچا دوں گا۔"

سکھ کیپٹن کہنے لگا۔

"ناگ پور سے سپیشل برانچ انٹیلی جنیس کے میجر شرت دیوان کا پیغام بھی آ گیا ہے۔ وہ پرسوں صبح کی گاڑی پر ناگ پور سے پانڈی چری پہنچ رہا ہے۔ وہ پورا بوچڑ ہے۔ وہ

پاکستانی کمانڈو سے سب کچھ معلوم کر لے گا۔ اتنی دیر تک چیمبر فائیو کا کیپٹن جوشی اس سے انٹروگیٹ کرے گا۔"

پھر اس نے مجھے گالی دے کر کہا۔

"تم لوگوں نے ہماری نیوی کا اتنا بڑا نقصان کیا ہے کہ تم ایسے ایک ہزار کمانڈوز کو پھانسی پر لٹکا دینے سے بھی یہ نقصان پورا نہیں ہو سکتا"

میں نے دل میں کہا۔ اگر خدا نے میری زندگی لکھی ہے تو تمہیں اس سے بھی ہزار گنا زیادہ تباہی کا سامنا کرنے کے لئے تیار رہنا ہو گا۔ دونوں فوجی چلے گئے۔ کچھ وقت گزر گیا۔ اس کے بعد مجھے ہتھکڑی لگا کر دو فوجی گارڈز کی نگرانی میں ایک عمارت کی دوسری منزل کے ایک کمرے میں لے جا کر ڈال دیا گیا۔ یہاں فرش پر صرف ناریل کی چٹائی بچھی ہوئی تھی۔ وہاں اور کچھ نہیں تھا۔ یہاں مجھے ٹین کے ڈبے میں باسی سبزیوں کا شوربہ اور باسی ڈبل روٹی کے دو ٹکڑے کھانے کو دیئے گئے۔ مٹی کے پیالے میں پانی پینے کو ملا۔ یہ چیمبر فائیو تھا۔ دیوار کے ساتھ بلب جل رہا تھا۔ یہ چھوٹا سا کمرہ بھی حوالات کی طرح تھا جس کا دروازہ لوہے کی سلاخوں والا تھا۔ دروازے کے آگے ایک تنگ سی راہ داری تھی۔ یہاں کسی جانب ایک بلب روشن تھا جس کی روشنی دروازے کے آگے پڑ رہی تھی۔

یہ کوئی خاص قسم کا عقوبت خانہ تھا جہاں مجھ سے کسی کیپٹن جوشی نے پوچھ گچھ کرنی تھی اور مجھ پر کوئی نئی قسم کا تشدد کرنا تھا۔ مجھے سب سے زیادہ فکر اس بات کا تھا کہ پرسوں صبح کسی وقت میجر شرت دیوان ناگ پور سے یہاں پہنچنے والا ہے۔ اس کے آنے سے پہلے پہلے وہاں سے فرار ہو جانا چاہتا تھا لیکن فرار کا کوئی راستہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ جس عمارت کی دوسری منزل کے تارچر چیمبر فائیو میں مجھے قید کیا گیا تھا اس کے پیچھے کوئی ریلوے لائن تھی۔ وہاں سے کسی کسی وقت کوئی انجن ریل گاڑی کے ڈبوں کو لے کر شنٹ کرتا' سیٹی بجاتا آہستہ آہستہ گزر جاتا تھا۔ اس کمرے میں نہ تو کوئی روشندان تھا اور نہ ہی کوئی کھڑکی تھی۔

اتنے میں ایک کالے رنگ کا خوفناک چہرے والا آدمی جس نے کیپٹن کی وردی پہنی ہوئی تھی اور جس کے گال پر لمبا سا کسی زخم کا نشان تھا ہاتھ میں ایک بریف کیس لئے میرے پاس آکر کھڑا ہوگیا۔ ایک سپاہی نے فوراً کرسی لا کر رکھ دی تھی۔ وہ کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس نے سب سے پہلے میری نبض دیکھی۔ پھر بے رحمانہ انداز میں مسکراتے ہوئے بولا۔

"اچھا۔ تو تم نہیں بتاؤ گے کہ تمہارا ساتھی کمانڈو کہاں روپوش ہے اور انڈیا میں تم پاکستانی کمانڈوز کا ہائیڈ آؤٹ کہاں ہے؟"

میں نے بڑی بے زاری سے کہا۔

"میں پاکستانی کمانڈو نہیں ہوں۔ مجھے ناحق گرفتار کرلیا گیا ہے۔ بحری جہازوں کی تباہی سے میرا کوئی تعلق نہیں ہے"

وہ بولا۔

"میرا نام کیپٹن جوشی ہے۔ میں کان پور کا رہنے والا ہوں۔ قیدی کی چمڑی اتارنے کا ماہر ہوں۔"

یہ کہتے ہوئے اس نے بریف کیس میں سے ایک لمبا نشتر نکال کر مجھے دکھاتے ہوئے کہا۔

"اس نشتر سے پہلے تمہارے گال پر ایک لمبا کاٹ لگاؤں گا۔ پھر زخم کے اندر اپنی دو انگلیاں ڈال کر صرف ایک جھٹکا دوں گا اور تمہارے گال کی کھال الگ ہو جائے گی"

وہ مکروہ انداز میں ہنسنے لگا۔ نشتر اس کے ہاتھ میں تھا۔ کیپٹن جوشی نے مجھے گردن سے دبوچ کر میرے گال پر نشتر چلا دیا۔ میری چیخ نکل گئی میں نے اپنی گردن اس کے شکنجے سے چھڑا لی۔ کیپٹن جوشی نے چلا کر ڈیوٹی گارڈ پر موجود سپاہی کو آواز دی۔

لانس نائیک! اسے آکر پکڑو"

لانس نائیک جو دروازے کے باہر ڈیوٹی پر کھڑا تھا دوڑ کر اندر آگیا۔ اس نے مجھے بازوؤں سے پکڑ لیا۔ میری ہتھکڑی یہاں لاتے وقت اتار دی گئی تھی۔ بوچڑ کیپٹن جوشی نے

نشتر میری گال پر لگایا ہی تھا کہ ایک فوجی نے آکر سلیوٹ کیا اور اونچی آواز میں بولا۔

"سر! سوامی گورکھ ناتھ جی آئے ہیں"

کیپٹن جوشی کا نشتر والا ہاتھ وہیں رک گیا۔ وہ جلدی سے میرے ٹارچر چیمبر سے نکل کر راہ داری میں آگیا۔ اس دوران ایک اونچا لمبا سادھو نمودار ہوا جس کے لمبے بال تھے۔ ڈاڑھی سینے تک پھیلی ہوئی تھی۔ گلے میں منکوں کی مالائیں تھیں۔ ہاتھوں میں کڑے تھے۔ ماتھے پر سیندھور کا ٹیکا لگا تھا۔ وہ دروازے کے پاس آکر کھڑا ہوگیا۔ کیپٹن جوشی نے جھک کر سادھو کے پاؤں چھوئے اور ہاتھ باندھ کر بڑے ادب سے بولا۔

"مہاراج! میرے دھن بھاگ کہ آپ میرے آفس میں پدھارے"

سادھو نے ایک نظر سلاخوں میں سے مجھے دیکھا اور پوچھا۔

"یہ ملیچھ پاکستانی جاسوس ہے کیا؟"

کیپٹن جوشی بولا۔

"جی مہاراج! ان لوگوں نے ہمارے دو جہاز برباد کر دیئے ہیں۔ ایک ہی پکڑا گیا ہے۔ دوسرے کے بارے میں پوچھ گچھ کر رہے ہیں۔"

سادھو نے جس کا نام سوامی گورکھ ناتھ تھا مجھے بہت برے لفظوں سے پکارا اور اندر آگیا۔ کیپٹن جوشی بھی اس کے ساتھ ہی اندر آگیا۔ سوامی گورکھ ناتھ نے جھک کر مجھے دیکھا۔ میرے گال سے خون رس رہا تھا۔ اس نے غصیلی آواز میں کہا۔

"بتا دے تیرے دوسرے ملیچھ ساتھی کہاں ہیں۔ نہیں تو تیری بوٹیاں چیل کوؤں کو کھلا دیں گے۔"

پھر سوامی نے کیپٹن جوشی سے پوچھا۔

"ابھی تک اس نے اپنے ساتھیوں کا نام پتہ نہیں بتایا؟"

کیپٹن جوشی ہاتھ باندھے پاس ہی کھڑا تھا۔ کہنے لگا۔

"مہاراج! ابھی بتا دے گا۔ میں نے اپنا آپریشن ابھی شروع نہیں کیا۔"

سوامی گورکھ ناتھ نے اپنا ہاتھ آگے کر کے کیپٹن جوشی کے سر پر رکھا اور کہا۔

"بالک! ہم گورو گورکھ ناتھ کا ایک منتر پڑھ کر اس ملیچھ پر پھونکیں گے اس منتر کے
ثر سے یہ فوراً اپنے ساتھیوں کے نام اور ٹھکانے بتا دے گا۔"

کیپٹن جوشی خوش ہو کر بولا۔

"مہاراج! آپ منتر پڑھ کر ضرور پھونکیں۔ مجھے پورا وشواش ہے کہ آپ کے منتر
سے ہمیں اپنا مقصد حاصل ہو جائے گا۔"

سوامی وہیں فرش پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔ اس نے بازو بلند کیا اور نعرہ لگایا۔

"اولکھ نرنجن!"

اس کے بعد کیپٹن جوشی سے کہا۔

"بچہ! تم ہمارے خاص بالکے ہو۔"

کیپٹن جوشی بولا۔

"مہاراج! یہ آپ کی کرپا ہے۔"

سوامی نے کہا۔

"فوراً جاؤ اور اپنے ہاتھ سے چائے کا ایک گلاس بنا کر لاؤ۔ ہم اس چائے پر منتر
پڑھیں گے اور وہ چائے اس ملیچھ کو پلا دیں گے۔ پھر دیکھنا یہ کیسے بولتا ہے۔"

کیپٹن جوشی نے کہا۔

"ابھی لاتا ہوں مہاراج!"

سوامی نے تاکید کرتے ہوئے کہا۔

"یاد رکھنا۔ چائے خود بنانا۔ کسی دوسرے سے نہ بنوانا۔ نہیں تو منتر کا اثر جاتا رہے
گا۔"

کیپٹن جوشی بولا۔

"مہاراج! میں خود بنا کر لاؤں گا۔ آپ مجھ پر بھروسہ رکھیں۔"

یہ کہہ کر وہ اس چیمبر فائیو سے باہر چلا گیا۔ ڈیوٹی گارڈ نے دروازہ بند کر دیا او
چوکس ہو کر پہرہ دینے لگا۔ سوامی گورکھ ناتھ مجھے گھورے جا رہا تھا۔ میں نے سوچا کہ یہ

جاہل سادھو مجھ پر کیا منتر پھونکے گا۔ میرے دل پر اللہ اور اس کے رسول پاک ﷺ کا
نام لکھا ہوا ہے۔ اس کا منتر سارے کا سارا بھسم ہو کر رہ جائے گا۔ مجھے صرف یہ خوشی
تھی کہ میں کچھ دیر کے لئے انتہائی درندہ صفت اذیت سے بچ گیا تھا۔ میرے نزدیک یہ
کوئی فراڈ یا سادھو تھا جس نے بھارت کے فوجی کیپٹن کو الو بنا رکھا تھا۔ سوامی گورکھ ناتھ
نے اپنے چھوٹے سے کھدر کے تھیلے کو جو اس کی بغل میں لٹک رہا تھا کھولا اور ایک نظر
دروازے کے باہر کھڑے فوجی کی طرف دیکھا۔ پھر تھیلے میں سے کپڑے میں لپٹی ہوئی کوئی
شے بڑی تیزی سے نکالی اور اسے میرے ہاتھ میں تھماتے ہوئے بولا۔

"اسے فوراً کہیں چھپا لو"

میری سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ یہ سادھو کیا کر رہا ہے۔ میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ سوامی گورکھ
ناتھ نے انتہائی درشت مگر دبی آواز میں کہا۔

"آدمی ہو کہ جانور؟ اسے چھپا لو۔ جلدی"

میں نے رومال میں لپٹی ہوئی شے جلدی سے اپنی پتلون کی جیب میں چھپا لی۔ اسے
پکڑتے ہوئے مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ یہ ایک چھوٹا پستول ہے۔ صورت حال ایک دم
تبدیل ہو گئی تھی۔ سوامی گورکھ ناتھ اونچی آواز میں منتر پڑھنے لگا۔ ایک بار منتر پڑھ کر
اس نے میرے قریب آ کر میرے سر پر پھونک ماری اور آہستہ سے کہا۔

"اس میں ایک خط بھی ہے۔ اسے پڑھ لینا۔"

اور وہ منتر پڑھنے لگ گیا۔ دروازے کے باہر جو انڈین لانس نائیک ڈیوٹی پر کھڑا تھا
اس کا منہ سامنے کی طرف تھا۔ ہماری طرف اس کی پشت تھی۔ اتنے میں کیپٹن جوشی
چائے کا پیالہ ہاتھ میں لئے آ گیا۔ سوامی جی نے خوش ہو کر کہا۔

"شاباش! لا پیالی ادھر لا کر رکھ دے۔ بس سمجھ لے کہ تیرا کام ہو گیا جوشی۔"

کیپٹن جوشی سوامی جی کے آگے چائے کی پیالی رکھ کر وہیں بڑے ادب سے بیٹھ گیا۔
سوامی گورکھ ناتھ بڑے لمبے لمبے منتروں کا جاپ کر رہا تھا۔ جب اس نے منتر پڑھنا ختم کئے
تو چائے کی پیالی میں پھونک مار کر کیپٹن جوشی کو حکم دینے کے انداز میں کہا۔

"اب یہ چائے اس ملیچھ کو پلا دے۔ اگر یہ نہ پیئے تو اسے زبردستی پلا دے"
اس کے ساتھ ہی سوامی جی نے مجھے آنکھ سے ہلکا سا اشارہ کر دیا۔ کیپٹن جوشی نے چائے کی پیالی میری طرف بڑھائی اور کرخت آواز میں کہا۔

"یہ میرے گورو جی کی خاص چائے ہے۔ اگر تو نے اسے نہ پیا تو میں تیری آنکھیں نکال دوں گا۔"

میں نے ذرا سے ہچکچانے کی اداکاری کی اور پھر سوامی جی کا اشارہ پا کر آہستہ آہستہ چائے پینے لگا۔ کیپٹن جوشی بڑا خوش ہوا سوامی جی نے مسکرا کر کہا۔

"جوشی جی! دیکھا ہمارے گورو گورکھ ناتھ کے منتر کا اثر؟ یہ چائے پینے کے بعد کچھ دیر کے لئے بے ہوش ہو جائے گا۔ ہم اسے یہاں اکیلا چھوڑ دیں گے۔ یہ بہت ضروری ہے۔ ہم باہر راہداری میں ایک طرف کھڑے ہو کر پانچ منٹ انتظار کریں گے۔ ٹھیک پانچ منٹ کے بعد اسے ہوش آجائے گا۔ پھر جب تم اس سے پوچھو گے تو یہ اپنے سارے کمانڈو ساتھیوں کے نام اور پتے بتا دے گا۔"

"دھن ہو مہاراج"

وہ دونوں میرے کمرے سے چلے گئے۔ سوامی جی نے کہا۔

"ڈیوٹی پر کھڑے سپاہی کو بھی تھوڑی دیر کے لئے یہاں سے ہٹا دو"

ڈیوٹی پر کھڑا سپاہی بھی کیپٹن جوشی کے حکم سے ان کے ساتھ ہی ایک طرف کو چلا گیا۔ میں سمجھ گیا تھا کہ سوامی جی کا اس ڈرامے سے کیا مقصد ہے۔ وہ یقیناً مجھے خط پڑھنے کا موقع دینا چاہتے تھے جو پستول والے بنڈل میں ساتھ ہی تھا۔ ان کے جاتے ہی میں نے جیب سے کپڑے میں لپٹا ہوا بنڈل نکال کر کھولا۔ یہ ایک بڑا ماڈرن قسم کا چھوٹا سا پستول تھا جس کے آگے چھوٹا سا سائی لینسر لگا ہوا تھا۔ ساتھ ایک کاغذ تہہ کر کے رکھا ہوا تھا۔ میں نے کاغذ کھول کر پڑھا۔ اس پر اردو کی عبارت میں لکھا تھا۔

"اس پستول کی مدد سے اگر تم یہاں سے فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے تو اس کاغذ کی پشت پر جو ایڈریس لکھا ہے وہاں پہنچ کر گنگو نام کے بیرے سے مل لینا۔ کوڈ ورڈ ہے

سیتا رام ہے۔ اگر پکڑے گئے تو پستول غائب کر کے اس خط کو منہ میں ڈال کر نگل جانا۔"

میں نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ رقعے کی گولی سی بنا کر اسے پتلون کی جیب میں ڈال لی اور پستول دوسری جیب میں چھپا لیا۔ مگر میں پریشان بھی ہو گیا تھا۔ اس لئے کہ یہ پستول زیادہ دیر تک چھپا ہوا نہیں رہ سکتا۔ کیپٹن جوشی واپس آتے ہی جب مجھ پر تشدد شروع کرے گا تو یقینی طور پر پستول اسے نظر آجائے گا۔ مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ سوامی گورکھ ناتھ کے روپ میں ہمارے آدمی نے اس کا بندوبست بھی کر لیا ہوا تھا۔

باہر سے جے گورکھ ناتھ کا نعرہ بلند ہوا۔ میں سمجھ گیا کہ یہ مجھے اشارہ دیا گیا تھا کہ ہم آرہے ہیں۔ اس کے بعد سوامی جی کیپٹن جوشی کے ساتھ کمرے میں آگئے۔ میں اس دوران جلدی سے زمین پر لیٹ گیا تھا۔ میں نے خود پر مصنوعی بے ہوشی طاری کر لی تھی۔ سوامی جی نے آتے ہی کیپٹن جوشی سے کہا۔

"ملیچھ بے ہوش ہے۔ ابھی اسے ہوش میں لاتا ہوں۔ پھر دیکھنا کیسے فر فر بولتا ہے۔"

اس نے کوئی منتر پڑھ کر میرے چہرے پر پھونک ماری۔ میں نے آنکھیں کھول دیں اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔ کیپٹن جوشی نے میرے پاس بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

"بتا تیرے دوسرے کمانڈو ساتھی کہاں کہاں پر ہیں۔ ان کے نام کیا ہیں؟"

میں نے یونہی سوچے سمجھے بغیر ایک چیخ ماری اور پھر بے ہوش ہونے کی اداکاری کرتے ہوئے زمین پر پڑ گیا۔ سوامی جی نے بعد میں مجھے بتایا کہ میں نے ٹھیک کیا تھا۔ سوامی جی نے مجھ پر منتر پڑھ کر پھونکنے شروع کر دیئے۔ جب دیر تک وہ منتر پڑھتے رہے اور میں بے ہوش ہی رہا تو انہوں نے کیپٹن جوشی سے کہا۔

"بالکے! منتر ضرورت سے زیادہ چڑھ گیا ہے۔ یہ ابھی ہوش میں نہیں آئے گا۔ ابھی اسے پڑا رہنے دو۔ صبح آکر اس سے تمام راز معلوم کریں گے۔ صبح تک اسے ہوش آگیا ہو گا۔"

"جو حکم مہاراج"

کیپٹن جوشی نے ہاتھ باندھ کر کہا اور سوامی جی کے ساتھ ہی کمرے یعنی چیمبر فائیو سے

باہر نکل گیا۔ جیسا کہ میں پہلے بھی بیان کر چکا ہوں کہ ہندو قوم سر سے پاؤں تک توہمات میں ڈوبی ہوئی ہے۔ ان کے پڑھے لکھے لوگ بھی اس معاملے میں انتہائی ضعیف الاعتقاد ہوتے ہیں اور سادھو جوگی سنیاسی لوگ انہیں خوب الو بناتے ہیں۔ کیونکہ سادھوؤں کی ہندو لوگ صرف عزت ہی نہیں کرتے بلکہ ان سے ڈرتے بھی رہتے ہیں۔ انہیں یقین ہوتا ہے کہ اگر کسی جوگی یا سادھو نے انہیں بد دعا دے دی تو وہ تباہ و برباد ہو جائیں گے۔

ان لوگوں کے جانے کے بعد میں نے آنکھیں کھول کر لیٹے لیٹے دروازے کی طرف دیکھا۔ دروازے کے باہر لانس نائیک پہرے پر کھڑا تھا۔ کبھی وہ ٹہلنے لگتا اور کبھی مجھے ایک نظر دیکھ کر میری طرف پشت کر کے سلاخوں والے دروازے کے آگے کھڑا ہو جاتا۔

سوامی گورکھ ناتھ ہمارا کوئی خاص آدمی تھا جو سادھو کے روپ میں جنوبی ہند میں کام کر رہا تھا۔ اس نے خط میں جو کچھ مختصر سا لکھ دیا تھا اس کا مطلب یہی تھا کہ میں آج رات کو ہی وہاں سے فرار ہونے کی پوری کوشش کروں۔ اس نے مجھے پستول اس مقصد کے لئے دیا تھا۔ یہ گویا ایک طرح سے خدا کی مدد تھی جو اپنے آدمی کی شکل میں مجھے پہنچی تھی۔ ایک دن چھوڑ کر میجر شرت دیوان مجھ سے انٹروگیشن کرنے کے لئے آ رہا تھا۔ میرا وہاں سے فرار ہونا بہت ضروری تھا۔

میں نے اب پہرے پر کھڑے لانس نائیک کو اس نگاہ سے دیکھا کہ میں اسے کس طرح قابو کر سکتا ہوں۔ اس فوجی پر قابو پانا بہت ضروری تھا۔ میں نے دیکھ لیا تھا کہ باہر سے اندر جاتے ہوئے جب اس نے سلاخوں والے دروازے کو تالا لگایا تھا تو اس چابی سے لگایا تھا جو اس کی بیلٹ کے ساتھ لٹکی ہوئی تھی۔ مجھے اس بھارتی لانس نائیک پر صرف قابو ہی نہیں پانا تھا بلکہ اس کو اس طرح سے قریب لانا تھا کہ اس کی بیلٹ میں سے چابی نکال کر میں دروازے کے باہر لگا ہوا تالا کھول سکوں۔ بظاہر یہ بڑا مشکل کام تھا۔ لیکن اس وقت میں ٹارچر کی ساری اذیت بھول کر سر سے پاؤں تک کمانڈو بن چکا تھا۔ میرے اندر شیر کی دلیری اور لومڑی کی عیاری بیدار ہو چکی تھی۔ میں نے فوراً ایک حکمت عملی اپنے ذہن میں تیار کر لی۔ سب سے پہلے میں ہمہ تن گوش ہو گیا کہ باہر سے کوئی آوازیں وغیرہ تو

نہیں آ رہیں۔ باہر راہ داری میں اور نیچے احاطے میں خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ رات ابھی آدھی نہیں گزری تھی۔ لیکن میں مزید انتظار کرنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔ مجھے قدرت نے ایک سنہری موقع فراہم کر دیا تھا۔ اب مجھے اس سنہری موقع سے پورا پورا فائدہ اٹھانا تھا۔ مجھے اس حقیقت کا بھی احساس تھا کہ اگر یہ موقع میں نے ہاتھ سے گنوا دیا تو پھر میری موت یقینی ہے اور میں دشمن کی قید میں نہیں مرنا چاہتا تھا۔ میں نے اپنے سوچے سمجھے منصوبے پر عمل کرتے ہوئے آہستہ آہستہ کراہنا شروع کر دیا۔

میرے کراہنے کی آواز پر لانس نائیک نے پلٹ کر میری طرف دیکھا۔ میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ میں نے کراہتے ہوئے کہا۔

"مجھے پانی لاؤ۔ پانی پلاؤ۔ میں مر رہا ہوں۔ پانی۔ پانی۔"

لانس نائیک یہ دیکھ چکا تھا کہ مجھ پر سوامی جی نے بڑے منتر پھونکے ہیں۔ سوامی جی اور کیپٹن جوشی کے درمیان جو گفتگو ہوئی تھی وہ اسے بھی سن چکا تھا۔ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ مجھ سے کیپٹن صاحب نے بڑے قیمتی راز معلوم کرنے ہیں اور مجھے ہر حالت میں زندہ رکھنا ہے۔ چنانچہ اس نے کہا۔

"لاتا ہوں پانی"

یہ کہہ کر وہ دروازے سے ہٹ کر راہ داری میں ایک طرف چلا گیا۔ میں نے اس کے قدموں کی آواز سے اندازہ لگایا کہ وہ چھ قدم چلا گیا۔ وہاں پانی کی کوئی بالٹی وغیرہ رکھی ہوئی ہو گی۔ جب واپس آتے ہوئے اس کے قدموں کی آواز آنے لگی تو میں اٹھ کر دروازے کی سلاخوں کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔ لانس نائیک ٹین کے ڈونگے میں میرے لئے پانی لے کر آیا تھا۔ مجھے سلاخوں کے پاس کھڑے دیکھ کر بولا۔

"پیچھے ہٹو۔ پیچھے ہٹو"

میں ایک قدم پیچھے ہٹ گیا۔ لیکن میں نے ایسا زاویہ بنا لیا تھا کہ جہاں سے کمانڈو ایکشن میرے لئے مشکل نہیں تھا۔ اب سارا کام پھرتی کا تھا۔ لومڑی کی عیاری سے میں نے کام لیا تھا۔ اب چیتے کی تیزی اور پھرتی کی ضرورت تھی۔ سارا کام ایک سیکنڈ کا تھا۔

اس ایک سیکنڈ میں اگر میرا وار پڑ گیا تو بیڑا پار نہیں پڑا تو میری موت سامنے کھڑی تھی۔
بھارتی لانس نائیک نے ڈونگے والا ہاتھ سلاخوں کے اندر سے میری طرف بڑھایا
اس کے ساتھ ہی ایک بجلی چمکی۔ اس بجلی میں کڑک بالکل نہیں تھی۔ صرف آنکھوں کو
چندھیا دینے والی چمک تھی۔ مجھے یقین ہے بھارتی لانس نائیک کو یہی محسوس ہوا ہو گا
جیسے اس کے سامنے ایک بجلی سی چمک گئی ہے۔ اس کے بعد اسے کوئی ہوش نہیں رہا
میں نے اس کے بازو کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر اتنی زور سے اندر کی طرف کھینچ کر جھٹکا
دیا کہ اس کا ماتھا لوہے کی سلاخوں کے ساتھ زور سے ٹکرا گیا۔ میں نے اس کا بازو چھوڑا
نہیں تھا۔ چھوڑ بھی نہیں سکتا تھا۔ دوسرے لمحے میرا ایک بازو سلاخوں سے باہر جا کر اس
کی گردن کے گرد لوہے کے شکنجے کی طرح جکڑا گیا۔ گردن کو جکڑنے کے ساتھ ہی میں نے
اس کی گردن کو دوسرا جھٹکا دیا۔ وہ کوئی اتنا طاقتور فوجی بھی نہیں تھا۔ جنوبی بھارت کے
فوجی بھی دبلے پتلے مریل سے ہوتے ہیں۔ اس کے لئے میرا ایک جھٹکا بہت تھا۔ اس کی
گردن ایک طرف کو ڈھلک گئی۔ میں نے فوراً اس کی بیلٹ میں لٹکی ہوئی چابی کو زنجیر سے
پکڑ کر زور سے کھینچا۔ زنجیر ٹوٹ گئی اور چابی میرے ہاتھ میں آگئی۔ میں نے بڑے آرام
سے لانس نائیک کے بے حس جسم کو نیچے فرش پر ڈال دیا اور ہاتھ باہر نکال کر تالے کو
چابی لگائی۔ تالا کھل گیا۔

ساتھ ہی میری خوش قسمتی کا دروازہ بھی کھل گیا۔

میں نے جیب سے پستول نکال کر مضبوطی سے اپنے ہاتھ میں پکڑ لیا تھا۔ اب مجھے
صرف اتنا احساس تھا کہ اس عمارت کے پیچھے کوئی ریلوے لائن ہے جہاں سے دن کے
وقت اور رات کے وقت بھی کبھی کبھی شنٹ کرتے ریل کے ڈبے گزرا کرتے ہیں۔ ادھر
طرف سے کبھی کوئی ریل گاڑی شور مچاتی نہیں گزری تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ ادھر
طرف کوئی کارخانہ تھا جس کے احاطے کے اندر تک ریلوے لائن بچھی ہوئی تھی۔ ہو سکتا
تھا یہ ریلوے کا ہی کوئی کارخانہ ہو۔ مجھے اسی جانب اتر کر فرار ہونا تھا۔ میں دبے پاؤں راہ
داری میں آگیا۔ راہ داری میں ایک بلب دیوار کے ساتھ روشن تھا۔ اس کی روشنی

دور تک نہیں جاتی تھی۔ میں اس طرف جھک کر چلنے لگا جدھر سے مجھے ریلوے انجن کے
شنٹ کرنے کی آوازیں آیا کرتی تھیں۔

راہ داری آگے بند ہو گئی۔ یہاں تین فٹ اونچی دیوار تھی۔ میں نے بائیں جانب
گردن ذرا سی اٹھا کر دیکھا۔ یہ فوجی کیمپ یا رجمنٹ کے ہیڈ کوارٹر کا احاطہ تھا۔ احاطے میں
تین چار فوجی گاڑیاں ایک جانب دیوار کے ساتھ کھڑی تھیں۔ ٹین کی چھت کے آگے
کھمبے پر بلب جل رہا تھا۔ یہاں ایک جیپ کھڑی تھی۔ کچھ دور مجھے ایک فوجی پہرہ دیتا
دکھائی دیا۔ میں جلدی سے نیچے ہو گیا اور دیوار پر سے سر نکال کر دوسری طرف جھانک کر
دیکھا۔ ایک منزل نیچے مجھے دور جلتے کسی بلب کی روشنی میں ریل کی پٹڑیاں نظر آئیں۔
میں دوسری منزل پر تھا۔ نیچے چھلانگ لگانے سے آواز بھی پیدا ہوتی اور میں ریلوے
لائنوں پر گر کر زخمی بھی ہو سکتا تھا۔ میں نے جھک کر دیوار کو دور تک دیکھا۔ مجھ سے چند
گز کے فاصلے پر چھت کے پرنالے کا لوہے کا پائپ دیوار کے ساتھ نیچے تک گیا ہوا تھا۔
میرے وہاں سے نکلنے کی صرف یہی ایک صورت تھی۔ دوسرا کوئی راستہ نہیں تھا۔ میں
نے اللہ کا نام لیا اور سانپ کی طرح رینگتے ہوئے اپنے آپ کو راہ داری کی دیوار کی
دوسری طرف لے آیا۔ میں نے پاؤں باہر کو نکلی ہوئی اینٹوں پر جما کر دیوار کی منڈھیر کو
ایک ہاتھ سے پکڑ لیا۔

دوسرے ہاتھ کو میں نے آگے بڑھایا۔ پائپ ابھی ایک دو گز آگے تھا۔ میں کوشش کر
کے کھسکتا ہوا کچھ اور آگے ہو گیا۔ میرا ہاتھ پرنالے کے پائپ پر پڑ گیا۔ میں نے ایک ہاتھ
سے دیوار کی منڈھیر کو مضبوطی سے پکڑے رکھا۔ دوسرے ہاتھ سے پرنالے کے پائپ کو
پکڑا اور اپنا بایاں پاؤں آگے کر کے پائپ کے گرد لگے ہوئے لوہے کے رنگ پر ٹکا دیا۔
اس کے ساتھ ہی میں نے دیوار والا ہاتھ چھوڑ کر جلدی سے پائپ کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ
لیا۔ اب میرا دایاں پاؤں پائپ کے رنگ پر تھا اور میں چھپکلی کی طرح پائپ کے ساتھ چمٹا
ہوا تھا۔ وہاں زیادہ دیر تک چمٹے رہنے کی گنجائش نہیں تھی۔ میں نے دونوں پاؤں لوہے
کے رنگ پر سے ہٹا لئے اور اوپر والے ہاتھوں سے پائپ کو پکڑ کر آہستہ آہستہ نیچے کھسکنا

شروع کر دیا۔ میں ایک منزل نیچے کھسک گیا۔ دوسری یعنی نیچے والی منزل کے درمیان
پہنچ کر میں نے ہاتھ چھوڑ دیئے۔ میں نیچے ریلوے لائن کے پاس دیوار کے ساتھ اگی
جھاڑی پر گرا۔

گرنے کے ساتھ ہی میں وہیں سمٹ کر بیٹھا رہا۔ میرے کان خرگوش کے کان بن
تھے۔ میں کارخانے کی طرف سے آتی ایک آواز کو سن رہا تھا۔ یہ ایسی آواز تھی جیسے
کسی بند جگہ پر کوئی کسی شے کو ہتھوڑے سے کوٹ رہا ہو۔ میں نے جھاڑیوں میں سے
باہر نکال کر دائیں اور بائیں طرف دیکھا۔ دائیں طرف ریل کی تین پٹڑیاں کسی کا
کے اندر چلی گئی تھیں۔ وہاں کھمبے پر بلب روشن تھا۔ بائیں جانب ریل کی پٹڑیاں
علاقے میں جاتی معلوم ہو رہی تھیں۔ ضرور اس طرف یا تو ریلوے کا کوئی چھوٹا سا
سٹیشن تھا یا پھر مال لادنے اور اتارنے والے پلیٹ فارم تھے۔ میں جلدی سے اٹھ
ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ بائیں جانب تیز تیز قدموں سے چلنے لگا۔ ریل کی پٹڑ
پہلو میں جگہ تھوڑی سی تھی۔ اس پر جگہ جگہ جھاڑیاں اگی ہوئی تھیں۔ میں زیادہ تیز
چل سکتا تھا۔ مگر میں ایک سیکنڈ کے لئے بھی وہاں رک نہیں سکتا تھا۔ آگے جا کر ر
لائنوں کا جال پھیلنا شروع ہو گیا۔ دور ادھر ادھر ریلوے شیڈ کی چھتوں پر روشنیاں بھ
نظر آنے لگیں۔ میں ان سے بچتا ریلوے لائنوں کے اوپر سے گزر کر مشرق کی جا
دیوار تھی اس طرف آ گیا۔ اس دیوار کے اوپر اندھیرے میں کہیں کہیں روشنی
تھی۔ اس روشنی میں مجھے دیوار کے اوپر خاردار تار لگی نظر آئی۔ دیوار دور تک
تھی۔ سامنے سے ایک انجن شنٹ کرتا چلا آ رہا تھا۔ اس کے آگے کی دو بتیاں
تھیں۔ میں جلدی سے دیوار کے ساتھ لگ کر بیٹھ گیا۔ انجن بھاپ چھوڑتا چھک چھ
مجھ سے تھوڑے فاصلے پر سے گزر گیا۔ اس کے جاتے ہی میں اٹھا اور دیوار کے
ساتھ چلنے لگا۔ مجھے صرف یہی ایک ڈر تھا کہ کہیں میں کسی فوجی شیڈ میں نہ نکل
پستول میں نے جیب میں ہی رکھا ہوا تھا۔ میرے گال پر کیپٹن جوشی نے نشتر سے جو
لگایا تھا وہاں زخم میں سے خون بہنا تو بند ہو چکا تھا مگر گال درد کر رہا تھا۔

میں اب تیز چلنے کی بجائے نارمل چال چلنے لگا تھا کہیں اندھیرا آ جاتا اور کہیں میں
دیوار کے اوپر جلنے والے بلب کی روشنی میں آ جاتا۔ روشنی آتی تو میں جھک کر تیزی سے
آگے نکل جاتا۔ دل میں خدا سے دعائیں مانگ رہا تھا کہ یا اللہ یہاں سے نکلنے کا کوئی راستہ
دکھا دے۔ آگے ایک اونچا سگنل کیبن آ گیا۔ اس میں خوب روشنی ہو رہی تھی۔ مجھے
ایک دو آدمیوں کے سائے سے بھی نظر آئے۔ میں رک گیا۔ مجھے اس کیبن کے قریب
سے گزرنا تھا اور وہاں روشنی تھی۔ دو تین سیکنڈ رک کر سوچا کہ مجھے کیا کرنا چاہیئے۔ میں
زیادہ دیر رک بھی نہیں سکتا تھا۔ مجھے جلدی سے جلدی اس علاقے سے نکل جانا چاہیئے
تھا۔ آخر یہی فیصلہ کیا کہ انجان بن کر خاموشی سے نکل جاؤں گا۔ اوپر سے کسی نے دیکھ
بھی لیا تو میرے پھٹے پرانے کپڑوں سے وہ یہی سمجھے گا کہ میں ریلوے کا کوئی مزدور ہوں۔
میں چل پڑا۔ چھ سات قدم چلا ہوں گا کہ دیوار میں ایک جگہ چھوٹا سا دروازہ نظر پڑا۔ یہ
کوئی دروازہ نہیں تھا۔ دیوار میں شگاف ڈال کر آنے جانے کے لئے راستہ بنا لیا گیا تھا۔
میں نے خدا کا شکر ادا کیا اور شگاف میں سے گزر کر دیوار کی دوسری طرف نکل آیا۔

میں نے دیکھا کہ میں ایک پتلی سی کچی سڑک پر ہوں جس کی ایک جانب ٹین کی
ڈھلواں چھتوں والی چھوٹی چھوٹی کوارٹر نما کوٹھیاں بالکل ساتھ ساتھ بنی ہوئی ہیں ان میں
کہیں کہیں روشنی ہو رہی تھی۔ کچا راستہ خالی تھا۔ میں دیوار کے ساتھ ساتھ چلتا گیا۔ مجھے
محسوس ہو گیا تھا کہ میں ریلوے کی حدود سے باہر نکل آیا ہوں۔ کوارٹروں کی دوسری
جانب سے کبھی کبھی کسی ٹرک کے گزرنے کی آواز آ جاتی تھی۔ تھوڑی دور چلنے کے بعد
ان کوارٹر نما کوٹھیوں کے درمیان سے ایک تنگ راستہ نظر پڑا جو یقیناً دوسری طرف والی
سڑک کو جاتا تھا۔ میں اس راستے میں سے گزرنے لگا۔ یہاں اندھیرا تھا اور کوٹھیوں کے
پہلو کی اونچی اونچی دیواریں تھیں۔ یہ راستہ ختم ہوا تو سامنے بڑی سڑک تھی۔ سڑک کی
بتیاں جل رہی تھیں۔ ایک بس سٹاپ کا کھوکھا خالی پڑا تھا مجھے کوئی اندازہ نہیں تھا کہ میں
شہر کے کس علاقے کی طرف نکل آیا ہوں۔ اتنا مجھے معلوم تھا کہ پانڈی چری کا ساحل
سمندر شہر کے مشرق کی جانب ہے۔ اس طرف جانا موت کے منہ میں جانا تھا۔ میں نے

آسمان کی طرف نگاہ اٹھا کر دیکھا۔ آسمان پر کہیں کہیں بادل تھے۔ ان کے درمیان ستارے بھی ٹمٹما رہے تھے۔ میں نے مغرب کی طرف رخ کیا اور سڑک پار کر کے دوسری طرف آکر سمندر کے الٹے رخ چل پڑا۔

دو تین بھاری ٹرک ایک دوسرے کے پیچھے سڑک پر سے گزر گئے۔ یہ شہر پانڈی چری کی کوئی بڑی شاہراہ معلوم ہوتی تھی جو کسی دوسرے شہر کو جاتی تھی۔ اس وقت میری حالت یہ تھی کہ میری قمیض اور پتلون بوسیدہ ہو رہی تھی۔ قمیض پر خون کے دھبے بھی کہیں کہیں جمے ہوئے تھے۔ میرے بائیں رخسار پر زخم کا لمبا نشان تھا۔ جیب میں پھوٹی کوڑی بھی نہیں تھی۔ یہ بھی نہیں پتہ تھا کہ رات کا کیا بجا ہے۔ رات کتنی گزر چکی ہے۔ سڑک پر سے تھوڑی تھوڑی دیر بعد گاڑیاں گزر جاتی تھیں۔ جب ایک بس بھی گزری جس کی چھت پر بھی مسافر بیٹھے تھے۔ یہ دیہاتی کسان معلوم ہو رہے تھے۔ سڑک پر دونوں طرف بتیاں جل رہی تھیں۔ ان گاڑیوں سے اندازہ ہوا کہ رات ابھی زیادہ نہیں گزری۔ مجھے بہت جلد کسی جگہ چھپ جانا چاہئے تھا۔ کیونکہ فوجی ٹارچر چیمبر فائیو سے میرے فرار کا کسی وقت بھی راز فاش ہو سکتا تھا اور اس کے بعد شہری پولیس اور فوجی پولیس کو میری تلاش میں نکل پڑنا تھا۔ مجھے کوئی ٹھکانہ نظر نہیں آرہا تھا۔ میں نے پتلون کی جیب سے کاغذ کی وہ گولی نکالی جسے میں نے ٹارچر سیل میں ہی جیب میں ڈال لیا تھا جو مجھے سوامی جی نے دی تھی۔ اس نے کہا تھا کہ اس پر وہ پتہ لکھا ہوا ہے جہاں پہنچ کر تم نے گنگو نام کے بیرے سے ملنا ہے اور اس کے واسطے کوڈ ورڈ سوامی جی نے جے جے سیتا رام بتایا تھا۔ میں نے ایک جگہ سڑک پر روشنی میں کھڑے ہو کر کاغذ کی گولی کو کھول کر پڑھا۔ اس پر لکھا تھا

"جے بھارتی بنڈار

رمیہ جی سٹریٹ۔ گول کر۔

پانڈی چری"

اس کے نیچے گنگو بیرا لکھا تھا۔ میں نے کاغذ دوبارہ جیب میں ڈال لیا۔ میری پتلون کی

پچھلی جیب میں سوامی جی کا دیا ہوا چھوٹا پستول اسی طرح پڑا تھا۔ اسے چلانے کی نوبت ہی نہیں آئی تھی۔ اس میں میگزین بھرا ہوا تھا۔ میرے فرار کا علم ہو جانے کے بعد کسی بھی چوک یا ناکے پر پولیس تلاشی کے دوران یہ پستول میرے لئے مصیبت کا باعث بن سکتا تھا۔ میں اسے پھینکنا بھی نہیں چاہتا تھا۔ کیونکہ یہ مجھے کسی ناگہانی آفت سے نجات بھی دلا سکتا تھا۔ اب مجھے یہ معلوم کرنا تھا شہر میں گول کر کا علاقہ کون سا ہے۔ کیونکہ اسی علاقے میں کوئی جے بھارتی بھنڈار تھا جو یقیناً کوئی ریستوران تھا اور وہاں مجھے گنگو نام کے بیرے یا ویٹر یا ریستوران کے ملازم سے رابطہ پیدا کرنا تھا جو یقیناً اپنا ہی آدمی تھا۔ میں جیسے جیسے آگے بڑھ رہا تھا سڑک پر کچھ رونق نظر آنے لگی تھی۔ میں اس رونق سے بچنا چاہتا تھا۔ چنانچہ میں سڑک سے ہٹ کر فٹ پاتھ پر ہو کر چلنے لگا۔ یہاں کہیں کہیں سٹور نما دکانیں تھیں۔ ایک جگہ فٹ پاتھ پر چائے اور پان سگریٹ کا کھوکھا تھا۔ اس کے سامنے فٹ پاتھ پر دو مدراسی صرف دھوتیاں پہنے چائے کے گلاس ہاتھوں میں لئے بیٹھے بیڑی پی رہے تھے۔ میں نے سوچا کہ یہ عام قسم کے آدمی ہیں۔ ان سے پتہ پوچھنا چاہئے۔ میں ان کے پاس چلا گیا۔ دونوں نے میری طرف دیکھا۔ میں نے وہاں کی عام ہندوستانی بول چال میں پوچھا کہ گول کر کہاں ہے۔ مجھے گول کر جانا ہے۔ ان میں سے ایک نے بازو سے ایک طرف اشارہ کیا اور بولا۔

"ادھر کو جائے گا۔ ادھر ایک روڈ کراس کرلے گا۔ سامنے والا باجو گول کر کو جائے گا۔"

میں نے ان سے زیادہ باتیں کرنی مناسب نہ سمجھیں اور خاموشی سے جس طرف مدراسی نے اشارہ کیا تھا اس طرف چلنے لگا۔ سامنے شاہراہ میں سے ایک سڑک نکل کر اندر کی طرف چلی گئی تھی۔ مجھے اسی سڑک کو کراس کرنا تھا۔

میں سڑک کراس کر گیا۔

یہاں دونوں جانب اونچے اونچے فلیٹوں والی بلڈنگیں تھیں۔ میں سامنے والی سڑک پر آ گیا۔ یہ پتلی سڑک سے چھوٹی تھی اور اس میں اکثر دکانیں بند ہو چکی تھیں۔ میں دکانوں کے بورڈ پڑھنے کی کوشش کرتا آگے چلا جا رہا تھا۔ اکثر بورڈ تامل زبان میں لکھے ہوئے تھے۔ کہیں کہیں انگریزی کے بورڈ بھی تھے مگر ان میں جے بھارتی بھنڈار کا بورڈ کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں آگے چلتا گیا۔ ایک دکان کے اندر سے روشنی باہر سڑک پر آ رہی تھی اور تامل گانوں کی آواز بھی آ رہی تھی۔ یہ ضرور کوئی ہوٹل یعنی ریستوران ہو گا۔ یہ سوچ کر میرے قدم ذرا تیز ہو گئے۔ پولیس کا ایک سپاہی جو سائیکل پر سوار تھا میرے سامنے سے آ کر گزر گیا۔ اس نے مدراس کی پولیس کی وردی یعنی نیکر اور خاکی رنگ کی دو پلی ٹوپی سر پر پہن رکھی تھی۔ ہاتھ میں بید کا ڈنڈا بھی تھا۔ میں اپنے دھیان میں چلتا رہا۔ اس نے مجھے ایک نظر دیکھا اور گزر گیا۔

جس دکان کے اندر سے روشنی اور تامل گانے کی آوازیں آ رہی تھیں وہ جے بھارتی بھنڈار نام کا ریستوران ہی تھا۔ ایک لمبی دکان تھی جہاں کرسیاں میز بچھے تھے۔ سپیکر پر مدراسی گانے والی کا ریکارڈ بج رہا تھا۔ دکان میں کافی گاہک بیٹھے کافی پی رہے تھے۔ یہاں بھی کافی کا زیادہ دور تھا۔ میں پہلے تو باہر کھڑا رہا کہ کوئی بیرا باہر نکلے تو اس سے گنگو کا پوچھوں۔ جب اندر سے کوئی ملازم ٹائپ کا آدمی باہر نہ نکلا تو میں ہمت کر کے ریستوران میں داخل ہو گیا اور جاتے ہی جہاں خالی کرسی دیکھی وہیں بیٹھ گیا۔ ایک کالا کلوٹا مدراسی لڑکا

میری میز پر آ کر میز پر کپڑا مارتے ہوئے تامل زبان میں کچھ بولا۔

میں نے کہا۔

"ایک گلاس کافی لے گا۔"

وہ جانے لگا تو میں نے اسے اشارے سے اپنے قریب بلا کر ہندوستانی میں پوچھا کہ کیا گنگو آج چھٹی پر ہے؟ میں نے یہ ظاہر کیا کہ میں اسے جانتا ہوں اور اس سے ملنا چاہتا ہوں۔ اس نے وہیں سے آواز دی اور تامل زبان میں کچھ کہا۔ اس میں گنگو کا نام بھی تھا۔ اس نے گنگو کو ہی آواز دی تھی۔ تھوڑی دیر بعد میں نے دیکھا کہ ایک پچاس پچپن سال کی عمر کا گہرے سانولے رنگ کا آدمی جس نے گھٹنوں تک میلی سی لنگی اور میلی سی ہی بنیان پہن رکھی تھی اپنے بالوں کو ایک ہاتھ سے کھجاتا میری طرف چلا آ رہا ہے۔ پہلے تو مجھے شک ہوا کہ یہ وہ آدمی نہیں ہو سکتا جس سے ملنے کو مجھے سوامی جی نے کہا تھا۔ لیکن پھر خیال آیا کہ ہمارے آدمی اسی طرح کام کیا کرتے ہیں وہ میرے پاس آ کر تامل میں کچھ بولا۔ میں نے کہا۔

"تمہارا ہی نام گنگو ہے؟"

اس نے کان کے پیچھے بیڑی نکال کر سلگاتے ہوئے کہا۔

"پھوکٹ بات نہیں کرے گا۔ کیا پینا مانگتا"

میں نے آہستہ سے کہا۔

"مجھے سوامی جی نے بھیجا ہے۔"

اس نے یہ سنا تو اس کے چہرے کی کیفیت میں ذرا سا بھی فرق نہ آیا۔ بیڑی کا دھواں اڑاتے ہوئے وہ کپڑے سے میری میز صاف کرنے لگا اور مجھ سے پوچھا۔

"کیا پئے گا بابو؟"

میں نے کہا۔

"کافی۔ پئے گا"

وہ چلا گیا۔ مجھے الجھن میں چھوڑ گیا۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ اصلی گنگو ہے یا

کوئی اور گنگو ہے۔ مگر سوامی نے اسی ریستوران کا پتہ لکھا تھا اور اس ریستوران میں ایک
ہی گنگو ہونے کا زیادہ امکان تھا۔ پھر خیال آیا کہ وہ مجھ سے کوڈ ورڈ سنے بغیر ہرگز کسی ر
عمل کا اظہار نہیں کرے گا۔ جب وہ کافی کا گلاس لے کر میرے پاس آیا تو میں نے آہستہ
سے کہا۔

"جے سیتا رام"

اس نے اپنے ہاتھ میں پکڑا ہوا رومال جس سے وہ میزیں صاف کرتا تھا نیچے گرا دیا۔
اسے اٹھانے کے لئے جھکا اور رومال اٹھانے کے ساتھ ہی کہنے لگا۔

"بھنڈار کے پیچھے چلے جاؤ۔ میں آتا ہوں"

یہ جملہ اس نے ہندوستانی میں نہیں بلکہ بڑی صاف اردو میں بولا تھا۔ میری جان میں
جان آئی کہ اس پریشانی کے عالم میں کوئی تو اپنا ساتھی ملا۔ میرے پاس ایک پیسہ بھی نہیں
تھا کہ کافی کا بل ادا کر سکتا۔ میں نے پہلے سے سوچی ہوئی اسکیم پر عمل کرتے ہوئے کافی کا
گلاس منہ کے قریب لا کر سونگھا اور لڑکے کو آواز دی۔ لڑکے کی بجائے گنگو آ گیا۔ اس
نے تیز آواز میں پوچھا۔

"کیا بولے گا اب؟"

میں نے کہا۔

"کافی میں سے صابن کی بو آ رہی ہے۔ میں نہیں پی سکتا۔ اسے لے جاؤ"

گنگو نے ترش ہو کر کہا۔

"تو پھر دوسرے بھنڈار میں جاؤ۔ سالا آ جاتا ہے کہیں سے"

وہ سمجھ گیا تھا کہ میں خستہ حالت میں ہوں اور میرے پاس کچھ نہیں ہے۔ میں جلدی
سے ریستوران سے باہر نکل گیا۔ تھوڑی دور چلنے کے بعد ایک راستہ بائیں طرف جاتا
تھا۔ میں اس پر سے ہوتا ہوا ریستوران کے عقب میں آ گیا جہاں ایک بدرو بہہ رہا تھا۔
یہاں اندھیرا تھا اور گندے پانی کی بدبو پھیلی ہوئی تھی۔ مگر مجھے اسی جگہ ٹھہر کر گنگو کا
انتظار کرنا تھا۔ ایک جگہ کچرے کا بہت بڑا ڈرم پڑا تھا۔ میں ڈرم کی اوٹ میں ہو کر کھڑا ہو

گیا۔ دس پندرہ منٹ گزر گئے۔ آخر مجھے ایک طرف سے اندھیرے میں انسانی سایہ اپنی
طرف آتا نظر پڑا۔ یہ گنگو ہی تھا۔ وہ میرے قریب آ کر خاموش کھڑا ہو گیا۔ بولا

"تم پیچھے کدھر سے آئے ہو؟"

میں نے کہا۔

"جہاں سے ہمارے سب لوگ آتے ہیں"

وہ بولا۔

"کسی کا نام لو"

مجھے یقین ہو گیا تھا کہ گنگو یہی ہے اور یہ اپنا ہی آدمی ہے۔ اب وہ اس بات کی
تصدیق کرنا چاہتا تھا کہ کیا میں بھی اس کا آدمی ہوں۔ میں نے کمانڈر شیروان کا نام لیا تو
اس نے پوچھا۔

"وہ کہاں ہوتا ہے؟"

میں نے کہا۔

"سری نگر کی پہاڑیوں میں"

"تمہیں سوامی جی کہاں ملے تھے؟"

میں نے کہا۔

"فوجی ہیڈ کوارٹر کے ٹارچر چیمبر فائیو میں بھارتی فوجی کیپٹن جوشی کے پاس وہ مجھے
ملے تھے۔ جب مجھے سخت ٹارچر کیا جا رہا تھا۔"

گنگو نے مجھ سے ہاتھ ملایا اور بولا۔

"میرے ساتھ آؤ"

میں اس کے پیچھے چل پڑا۔ وہاں اندھیرا تھا۔ ساتھ والی عمارتوں کی ہلکی ہلکی روشنی
وہاں پڑ رہی تھی۔ ہم نے ایک جگہ سے بدرو کا ٹوٹا پھوٹا لکڑی کا پل عبور کیا اور اتر کر نیچے
درختوں میں آ گئے۔ یہ تاڑ اور ناریل کے درخت تھے۔ ہم ان درختوں میں ادھر ادھر سے
گزرتے کافی دور تک چلتے گئے۔ اندھیرے میں کچھ جھونپڑیاں نظر آئیں۔ وہاں سے آگے

ایک طرف چھوٹا سا کھوکھا کھڑا تھا۔ گنگو وہاں جا کر رک گیا۔ پھر اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا کہ کوئی اس کا پیچھا تو نہیں کر رہا۔ پھر اس نے دھوتی کے ڈھب میں سے چابی نکال کر کھوکھے کا دروازہ کھولا اور اندر داخل ہو گیا۔ میں بھی اس کے پیچھے اندر چلا گیا۔ اندر اندھیرا تھا اور ناریل کے تیل کی بو پھیلی ہوئی تھی۔ گنگو نے دروازہ بند کر دیا اور ماچس جلا کر ایک موم بتی روشن کر دی۔ کھوکھا ایک تنگ سی جگہ تھی جہاں فرش پر چٹائی بچھی تھ اور کونے میں ٹین کا صندوق پڑا تھا اور رسی کے ساتھ پرانی دھوتی لٹک رہی تھی۔ گنگ چٹائی پر بیٹھ گیا اور مجھے بھی اپنے پاس بٹھا لیا۔ کہنے لگا۔

"جس روز جیا گامی کھاڑی میں انڈین نیوی کے دو جہاز دھماکے کے بعد غرق ہو گئے تھے میں اسی وقت سمجھ گیا تھا کہ اپنے کشمیری کمانڈو پانڈی چری میں پہنچ گئے ہیں۔ مجھے سب سے پہلے یہ بتاؤ کہ تمہارا کوئی اور ساتھی تو نہیں پکڑا گیا؟"

میں نے کہا۔

"میرے ساتھ صرف ایک ہی کمانڈو تھا وہ جہاں ہم ٹھہرے ہوئے تھے وہاں سے پانچ منٹ پہلے ہی نکل گیا تھا۔"

گنگو نے پوچھا۔

"تم صرف دو ہی تھے؟"

میں نے کہا۔

"ہم تو صرف دو ہی آئے تھے باقی اگر یہاں ہوں تو ان کا مجھے معلوم نہیں ہے۔"

گنگو نے مجھے بیڑی دیتے ہوئے کہا۔

"بیڑی پیئو گے؟"

میں نے بیڑی لے لی۔ اس نے ماچس جلا کر میری بیڑی سلگائی۔ ایک بیڑی خود بھی سلگائی اور بولا۔

"تم خوش قسمت ہو کہ اس فوجی کیمپ میں تمہیں لے جایا گیا جہاں ہمارے لیڈر سوامی گورکھ ناتھ کے بھیس میں آتے جاتے رہتے ہیں۔ انہیں یقیناً پتہ چل گیا ہو گا کہ

کشمیری کمانڈو کو پکڑ کر وہاں لایا گیا ہے۔ وہ اچانک کیپٹن جوشی کے پاس نہیں گئے ہوں گے وہ سوچی سمجھی سکیم کے تحت وہاں آئے ہوں گے۔"

میں نے کہا۔

"میرا بھی یہی خیال ہے۔ کیونکہ جب میں اور وہ ٹارچر چیمبر میں اکیلے رہ گئے تھے تو انہوں نے کاغذ میں لپٹا ہوا پستول تھیلے میں سے نکال کر مجھے دیا تھا اور کہا تھا کہ اس میں ایک پرچہ بھی ہے جس پر ایڈریس لکھا ہے۔ اس ایڈریس پر جا کر گنگو بیرے سے ملو۔ اس کا مطلب ہے کہ وہ پہلے سے جانتے تھے کہ میں وہاں موجود ہوں اور انہوں نے مجھے وہاں سے فرار ہونے کا موقع فراہم کرنا ہے۔ چنانچہ وہ پرچہ لکھ کر اور پستول لے کر میرے پاس آئے تھے۔"

"وہ پستول کہاں ہے؟"

گنگو نے پوچھا۔

میں نے پتلون کی پچھلی جیب میں سے پستول نکال کر اس کو دیا۔ وہ موم بتی کی روشنی میں پستول کو بڑے غور سے دیکھنے لگا۔ پھر بولا۔

"یہ پستول ہمارے ایک ساتھی نے پانڈی چری کے ائیر فورس ڈپو سے اڑایا تھا۔ یہ تم اپنے پاس ہی رکھو"

میں نے اسے کہا کہ اب تک ممکن ہے میرے فرار کا فوج کو علم ہو گیا ہو۔ فوج اور پولیس ضرور میری تلاش میں شہر میں نکل آئی ہو گی۔ میں یہاں سے گیا تو میری چیکنگ بھی ہو سکتی ہے۔ یہ پستول مجھے دوبارہ گرفتار کروا دے گا۔ گنگو بولا۔

"تم ابھی میرے پاس ہی رہو گے۔"

گنگو نے میرا پستول لے کر وہیں کونے میں صندوق کے پیچھے کپڑے میں لپیٹ کر چھپا دیا۔ اس نے اپنا اصلی مسلمان نام مجھے بتایا تھا مگر میں اس کا اصلی نام آپ کو نہیں بتاؤں گا۔ یہ بھی یاد رکھیں کہ میں نے پانڈی چری کے جس ریستوران کا نام یہاں جے بھارتی بھنڈار لکھا ہے یہ بھی فرضی نام ہے۔ سوامی گورکھ ناتھ نے مجھے گنگو سے ملنے کے لئے

کسی اور جگہ کا ایڈریس دیا تھا۔ میں ان سب جگہوں کا اصلی نام نہیں لکھ سکتا اس لئے کہ ہمارے یہ محب وطن مجاہد آج بھی بھارت کے ان شہروں میں اپنی جانیں خطرے میں ڈالے کشمیر کی آزادی اور پاکستان کی سلامتی کے لئے کام کر رہے ہیں۔ اگر میں نے یہاں ان کے اصلی نام اور پتے لکھ دیئے تو بھارت کی خفیہ پولیس انہیں بڑی آسانی سے پکڑ سکتی ہے۔

اس لئے میں گنگو کو گنگو ہی لکھوں گا۔ سوامی جی بھی مسلمان تھے اور سنسکرت اور ہندی کے بڑے عالم یعنی وردان تھے۔ اور وہ ایک عالم فاضل ہندو سادھو کے بھیس میں دشمن کے گھر میں بیٹھ کر کشمیر اور پاکستان کی سلامتی کے لئے خفیہ خدمات انجام دے رہے تھے۔ ان لوگوں نے اپنی جان ہتھیلی پر رکھی ہوئی تھی۔ موت ہر وقت ان کے سر پر منڈلاتی رہتی تھی۔ ان کی ذرا سی غلطی انہیں پھانسی کے تختے پر لٹکا سکتی تھی۔ سوامی جی ک بھی میں اسلامی نام نہیں لکھوں گا اور یہ بھی نہیں بتاؤں گا کہ وہ کہاں کے رہنے والے تھے۔ اتنا ضرور بتائے دیتا ہوں کہ وہ پاکستانی نہیں تھے۔ وہ ہندوستان کے ہی شہری مسلمان تھے اور کشمیر میں بھارتی قابض فوج کشمیری مسلمانوں پر جو ظلم کر رہی تھی اس کے خلاف وہ اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ وہ کشمیر کے محاذ پر جا کر دشمن سے جنگ نہیں کر سکتے تھے۔ مگ وہ ایک دوسرے محاذ پر آزادی کشمیر کی کاز کے لئے کام کر رہے تھے۔ اگر ان کو سنسکرت اور ہندی زبانوں پر عبور نہ ہوتا تو وہ بھارتی فوج اور بھارتی بیوروکریٹس کو کبھی متاثر نہیں کر سکتے تھے۔

گنگو جانے لگا تو بولا۔

"میں ہوٹل بند ہونے کے بعد آؤں گا۔ تم یہیں رہنا۔ باہر مت نکلنا۔"

وہ چلا گیا۔ میں جھونپڑے میں ہی چٹائی پر کچھ دیر بیٹھ کر آئندہ کیا کرنا ہو گا۔ کیسے کر ہو گا۔ ان باتوں پر غور کرتا رہا گنگو کافی دیر بعد آیا۔ وہ میرے لئے کچھ کھانے کو بھی لایا تھا۔ میں نے کھانا وغیرہ کھایا۔ اس نے کہا۔

"میں نے سوامی جی کو پیغام بھجوا دیا ہے کہ تم میرے پاس پہنچ گئے ہو۔ وہ کل رات

تم سے ملاقات کریں گے۔"

میں نے کہا۔

"گنگو بھائی! میرا ناگ پور واپس پہنچنا بڑا ضروری ہے۔"

وہ بولا۔

"سوامی جی ہی اس کا انتظام کریں گے تم اکیلے یہاں سے نکلے تو پکڑے جاؤ گے سب سے پہلے تو صبح تمہارے لئے نئے کپڑے لاؤں گا۔ یہ بڑے گندے ہو رہے ہیں۔"

میں نے اس سے پوچھا۔

"سوامی جی کیا مجھ سے ملنے یہاں آئیں گے؟"

گنگو نے کہا۔

"نہیں۔ ہمیں ان کے پاس جانا ہو گا یہ میں تمہیں کل شام کو ہی بتا سکوں گا کہ سوامی جی سے کہاں ملاقات ہو گی۔"

اس کے بعد گنگو سو گیا۔ میں بھی سو گیا۔ دوسرے روز کافی دیر تک سویا رہا۔ گنگو جا چکا تھا۔ دن کافی نکل آیا تھا۔ گنگو میرے لئے چائے وغیرہ لے کر آیا۔ کہنے لگا۔

"اس کھوکھے کے پیچھے نلکا لگا ہوا ہے تم وہاں جا کر منہ ہاتھ دھو آؤ۔"

میں باہر نکل کر نلکے پر گیا۔ منہ ہاتھ دھویا۔ پانی پیا۔ اور واپس کھوکھے کے اندر بیٹھ کر ناشتہ کیا۔ گنگو بولا۔

"میں دوپہر کو تمہارے لئے کچھ کھانے کو بھی لاؤں گا اور تمہارے لئے دوسرے کپڑے بھی لاؤں گا۔"

میں نے کہا۔

"میرے لئے کہیں سے کوئی پرانی پتلون اور قمیض ہی لے آنا۔ دھوتی کرتہ نہ لانا۔ میں پتلون قمیض میں واپس ناگ پور پہنچنا چاہتا ہوں۔"

وہ چلا گیا۔ دوپہر کو میرے لئے چاول اور سبزی لے کر آ گیا۔ ایک بنڈل میں پرانی پتلون اور دھلی ہوئی قمیض تھی۔ میری جیکٹ تو فوجی ٹارچر سنٹر میں ہی رہ گئی تھی۔ میں

نے گندے کپڑے اتار کر وہ پہن لئے۔ میں نے اس سے کہا کہ فوج کو میرے فرار کا علم ہو گیا ہو گا۔ کیا اس بارے میں تمہیں کوئی خبر ہے؟ وہ بولا۔

"ایسی خبریں باہر نہیں نکلا کرتیں۔ فوج اور پولیس ان خبروں کو خفیہ رکھتی ہے۔ اس سے ایک تو ان کی بدنامی ہوتی ہے کہ اتنا خطرناک کمانڈو ان کی حراست سے بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو گیا دوسرے وہ اپنی سرگرمیوں سے مفرور کمانڈو کو بے خبر بھی رکھنا چاہتے ہیں۔ ویسے یہ بات یقینی ہے کہ اب تک خفیہ طور پر پولیس اور ملٹری انٹیلی جنس کے آدمیوں نے سفید کپڑوں میں شہر کی ناکہ بندی کر دی ہو گی۔"

گنگو جے بھارتی بھنڈار میں معمولی بیرے کی حیثیت سے ملازم تھا۔ اسے صبح سے لے کر رات تک وہاں کام کرنا پڑتا تھا۔ دوپہر کو گیا تو رات کے نو بجے واپس آیا۔ کہنے لگا۔

"تمہیں سوامی جی سے ملنے ان کے مندر چلنا ہو گا وہ رات کے دس بجے تک مندر میں گیان دھیان میں مصروف رہتے ہیں۔ ہم یہاں سے پورے دس بجے نکلیں گے۔ وہاں تم پتلون اور قمیض کی بجائے دھوتی کرتا پہن کر جاؤ گے۔"

اس نے صندوق میں سے ایک گہرے رنگ کی چارخانہ لنگی اور اسی رنگ کا کرتہ نکال کر مجھے دیا۔ میں نے پتلون قمیض اتار کر لنگی اور کرتہ پہن لیا۔ پاؤں میں گنگو کی چپل پہن لی۔ جب رات کے دس بج گئے تو گنگو مجھے لے کر ایک طرف روانہ ہو گیا۔ وہ خدا جانے کہاں کہاں سے گزرتا رہا۔ کبھی جھاڑیاں اور ویران علاقہ آجاتا۔ کبھی آبادی شروع ہو جاتی۔ آخر مجھے ایک جگہ ڈھلواں چھتوں والے اک منزلہ مکانوں سے کچھ فاصلے پر ایک مندر نظر آیا جس کا سٹائل جنوبی ہند کے مندروں والا تھا۔ یہ کوئی بڑا مندر نہیں تھا۔ ہم مندر کے اندر جانے کی بجائے اس کے عقب میں آکر بیٹھ گئے۔ یہ بالکل ویران جگہ تھی وہاں اندھیرا اور خاموشی تھی۔ مجھے کوٹھڑی میں بٹھانے کے بعد گنگو نے اندر طاق میں رکھا ہوا تانبے کا ایک دیا جلا دیا تھا۔ اس کی روشنی میں میں نے دیکھا کہ دیواروں پر کہیں کہیں جالے لگے ہوئے تھے۔ میں پٹ سن کی چٹائی پر بیٹھا تھا۔ گنگو بولا۔

"میں زیادہ دیر یہاں نہیں ٹھہر سکتا۔ میں جاتا ہوں۔ سوامی جی تم سے ملنے آ

آجائیں گے۔ ان سے باتیں کرنے کے بعد تم مندر کے گیٹ کے پاس آجانا۔ میں وہاں سے تمہیں لے لوں گا۔"

وہ چلا گیا۔ میں بند کوٹھڑی میں اکیلا بیٹھا رہا۔ تانبے کا پرانا دیا جل رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد باہر کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ دروازے کو میں نے اندر سے چٹخنی لگا دی تھی۔ قدموں کی چاپ دروازے کے پاس آکر رک گئی۔ مجھے سوامی جی کی آواز سنائی دی۔

"جے سیتا رام۔ دروازہ کھولو"

میں سوامی جی کی آواز پہچانتا تھا۔ میں نے دروازہ کھول دیا۔ سوامی جی اندر آگئے۔ انہوں نے دروازہ بند کر کے چٹخنی لگا دی۔ وہ اسی گیروے لباس میں تھے۔ میرے قریب چٹائی پر بیٹھتے ہی بڑی صاف اردو میں کہنے لگے۔

"اللہ کا شکر ہے کہ تم خیریت سے گنگو کے پاس پہنچ گئے۔ مجھے تمہارا فکر تھا۔"

میں نے کہا۔

"آپ کو کیسے معلوم ہو گیا تھا کہ میں فوج کے ٹارچ چیمبر میں ہوں؟"

سوامی جی نے جو مسلمان تھے اور ہمارے اپنے غازی اور مجاہد تھے مسکرا کر کہا۔

"یہ معلوم کرنا میری ڈیوٹی میں شامل ہے کیپٹن جوشی میرا مرید ہے۔ میں نے اسے کچھ ایسی شعبدہ بازی دکھائی ہوئی ہے کہ وہ میرا گرویدہ ہو چکا ہے۔ مجھے اسی کی زبانی پتہ چلا تھا کہ فوج نے ان پاکستانی کمانڈوز میں سے ایک کمانڈو کو پکڑ لیا ہے جنہوں نے جیا گامی کی کھاڑی میں انڈین نیوی کے دو اسلحہ بردار جہازوں کو تباہ کیا تھا۔ اس کے بعد میں نے ایک منصوبہ بنایا اور تمہارے تک پہنچ گیا۔"

میں نے سوامی جی سے پوچھا۔

"ٹارچ چیمبر سے میرے فرار کے بعد آپ پر تو کسی کو شک نہیں پڑا کہ آپ نے کمانڈو کو فرار ہونے میں مدد دی ہے؟"

سوامی جی بولے۔

"میں نے یہاں کی فوج کے سینئر آفیسر میں اپنا جو مقام بنایا ہے اس کا اندازہ تم اس بات سے لگا سکتے ہو کہ کسی کو مجھ پر ذرا سا بھی شک نہیں پڑا۔ بلکہ الٹا کیپٹن جوشی نے پہرے پر جو لانس نائیک موجود تھا اور جسے تم نے بے ہوش کر دیا تھا اس کو کوارٹر گارڈ میں بند کر دیا بہرحال ان باتوں کو چھوڑو۔ تم نے ہندو بن کر دھرم ویر کے نام سے ملٹری انٹیلی جنیس کی ڈیفنس برانچ کے میجر شرت دیوان کے گھر میں جو مقام بنایا ہے اسے بنا رہنا چاہئے۔ خدا نے بڑا کرم کیا کہ عین وقت پر تم فرار ہو گئے۔ ورنہ میجر شرت کل صبح پہنچنے والا تھا۔ وہ تمہیں دیکھ لیتا تو سارے کئے کرائے پر پانی پھر جاتا اور یہ بات ہمارے حق میں سخت نقصان دہ ثابت ہوتی۔ کیونکہ تم دھرم ویر کے روپ میں میجر شرت کے قریب رہ کر بھارتی فوجی ہائی کمانڈ کے پاکستان دشمن راز معلوم کر سکتے ہو۔ تم نے جو جگہ بنائی ہے یہاں تک ہمارے آدمی نہیں پہنچ سکتے۔ اب تمہارا واپس ناگ پور جانا بہت ضروری ہے۔ میجر شرت دیوان آنے والا تھا مگر اسے آج صبح ہی تمہارے فرار کی اطلاع کر دی گئی۔ اور وہ پانڈی چری نہیں آ رہا۔ لیکن اس نے ناگ پور سے ہی کیپٹن جوشی کے خلاف غفلت برتنے کے جرم میں سخت ایکشن لینے کا حکم جاری کر دیا ہے۔"

میں نے کہا۔

"آپ کے خیال میں میرے ناگ پور جانے کا محفوظ طریقہ کون سا ہو سکتا ہے؟"

سوامی جی کچھ سوچ کر بولے۔

"میں کوئی نہ کوئی طریقہ نکال لوں گا۔ تم اس معاملے میں فکر نہ کرو۔ تمہیں کل اطلاع پہنچ جائے گی کہ تمہیں یہاں سے کس طرح نکلنا ہے اور کیسے ناگ پور پہنچنا ہے۔ کیونکہ اس وقت ریلوے سٹیشن کے علاوہ شہر کے ہر بس سٹاپ اور لاریوں کے اڈوں پر پولیس اور ملٹری پولیس کے آدمی موجود ہیں۔ یہ بڑی خوش قسمتی کی بات ہوئی ہے کہ فوجی حراست میں تمہاری کوئی تصویر نہیں اتاری گئی۔ اگر تصویر اتار لی جاتی تو تمہارے لئے پانڈی چری سے باہر قدم نکالنا ناممکن تھا۔"

میں نے سوامی جی سے کمانڈو اورنگ زیب کے بارے میں پوچھا۔

"کیا آپ کو میرے ساتھی کمانڈو اورنگ زیب کے بارے میں کوئی خبر ہے؟ وہ پانڈی چری کی اشرفیہ سرائے میں میری گرفتاری سے چند منٹ پہلے جدا ہو گیا تھا۔"

سوامی جی کہنے لگے۔

"کمانڈو اورنگ زیب کے بارے میں مجھے ابھی تک کوئی اطلاع نہیں ملی۔ وہ پکڑا بھی نہیں گیا۔ اگر پکڑا گیا ہوتا تو مجھے لازمی طور پر اس کا علم ہو جاتا۔ اس کا یہی مطلب ہے کہ وہ پانڈی چری سے نکلنے میں کامیاب ہو گیا ہے اور اب تک کمانڈر شیروان کے پاس سری نگر پہنچ چکا ہو گا۔"

اس کے بعد سوامی جی اٹھ کھڑے ہوئے۔

"پہلے میں جاتا ہوں۔ تم میرے جانے کے پانچ منٹ بعد یہاں سے نکلنا۔ اور جاتے ہوئے یہ دیا بجھا دینا۔ تمہیں کیا کرنا ہے؟ اس بارے میں کل کسی وقت تمہیں بتا دیا جائے گا۔"

سوامی جی دروازہ کھول کر باہر نکل گئے۔ ان کے جانے کے پانچ چھ منٹ بعد میں نے دیا بجھایا اور کوٹھڑی سے نکل گیا۔ میں نے مندر کا گیٹ آتی دفعہ دیکھ لیا تھا۔ میں وہاں سے سیدھا گیٹ پر آ گیا۔ وہاں گنگو ایک طرف اندھیرے میں کھڑا میرا انتظار کر رہا تھا۔ اس نے مجھے پیچھے آنے کا اشارہ کیا اور آگے آگے چلنے لگا۔ ہم جس راستے سے آئے تھے اسی راستے سے گزرتے ہوئے واپس گنگو کی جھونپڑی یا کھوکھے میں پہنچ گئے۔ میں گنگو کو سوامی جی کے ساتھ جو باتیں ہوئی تھیں بتانے لگا تو اس نے کہا۔

"ان باتوں کو بتانے کی ضرورت نہیں ہے اب تم سو جاؤ۔ میں ہوٹل جا رہا ہوں دروازے کو اندر سے کنڈی نہ لگانا۔ میں رات کو آ کر سو جاؤں گا۔ کل صبح ملاقات ہو گی۔"

وہ چلا گیا۔ اس کا ہوٹل رات کو بارہ بجے کے بعد بند ہوتا تھا۔ دوسرے روز بھی میں نے آدھا دن گنگو کے جھونپڑے میں ہی گزارا۔ دوپہر کے بعد گنگو آ گیا۔ اس کے ہاتھ میں کپڑے کی گٹھڑی تھی۔ وہ میرے لئے کھانا بھی لایا تھا۔ جھونپڑے میں آ کر اس نے کہا۔

"پہلے کھانا کھالو۔ پھر بات کریں گے"

میں نے چاول وغیرہ جو کچھ وہ لایا تھا کھانے لگا۔ میں ابھی تک لنگی کرتہ کے لباس میں ہی تھا۔ میری پتلون قمیض جو گنگو میرے لئے لایا تھا صندوق میں بند تھی۔ میرا پستول بھی صندوق کے پیچھے ہی خفیہ جگہ پر چھپایا ہوا تھا۔ کھانا کھا چکنے کے بعد گنگو نے گٹھڑی کھول کے اس میں سے گیروے رنگ کا ایک لمبا چولا۔ گیروے رنگ کی ایک دھوتی اور لمبے لمبے بالوں کی ایک وگ اور بڑے بڑے منکوں کی مالا نکال کر مجھے دکھائی اور کہا۔

"یہ لباس پہن لو۔ تمہاری پتلون اور قمیض الگ تھیلے میں بند کر دیتا ہوں۔ یہ کپڑے تم ناگ پور پہنچنے کے بعد پہن لو گے۔"

میں نے پوچھا۔

"کیا مجھے سادھو بن کر ناگ پور جانا ہو گا؟"

وہ بولا۔

"ہاں مگر تم اکیلے نہیں جاؤ گے۔ اکیلے اگر تم کسی ریاست کے راجہ بن کر بھی جاؤ گے تو پکڑ لئے جاؤ گے۔ ملٹری پولیس اور سول پولیس کے خفیہ لوگ تمہاری تلاش میں ٹڈی دل کی طرح شہر میں پھیلے ہوئے ہیں۔"

"تو پھر میرے ساتھ کون جائے گا؟"

گنگو بولا۔

"سوامی جی تمہارے ساتھ جائیں گے۔ انہوں نے صرف تمہیں حفاظت کے ساتھ ناگ پور پہنچانے کا یہ انتظام کیا ہے کہ وہ ہندو شردھالوؤں کی پوری ایک منڈلی لے کر ناگ پور کے بڑے مندر کی یاترا پر جا رہے ہیں۔ تم بھی ان شردھالوؤں میں شامل ہو گے۔ اس طرح تم پر کسی کو شک نہیں پڑے گا اور سوامی جی کی وجہ سے تمہاری چیکنگ بھی نہیں ہو گی۔ ٹھیک ایک گھنٹے بعد پانڈی چری سے ورنگل جانے والی گاڑی چل پڑے گی۔"

میں نے کہا۔

"اس کا مطلب ہے پانڈی چری کے ریلوے سٹیشن تک مجھے اکیلے جانا ہو گا؟"

گنگو بولا۔

"نہیں۔ ایک گھنٹے بعد سوامی جی اپنی منڈلی کے سادھوؤں اور دوسرے شردھالوؤں کو لے کر ہمارے ہوٹل کے سامنے سے گزریں گے۔ تم اس وقت تک ہمارے ہوٹل کے باہر بیٹھو گے۔ وہاں تم پر کوئی شک نہیں کرے گا۔ یہاں سادھو لوگ عام چلتے پھرتے رہتے ہیں۔ جب سوامی جی اپنی منڈلی کو لے کر وہاں سے گزریں گے تو تم بھی ان میں شامل ہو جاؤ گے۔ یہ سارا ڈرامہ صرف تمہیں محفوظ طریقے سے ناگ پور پہنچانے کے لئے کھیلا جا رہا ہے۔ اب جلدی سے یہ کپڑے پہن کر اپنا حلیہ سادھوؤں والا بنا لو اور میرے جانے کے کچھ دیر بعد یہاں سے نکل کر ہمارے ہوٹل پہنچ جانا۔ اور وہاں باہر ایک کرسی پڑی ہو گی اس کرسی پر بیٹھ جانا۔ میں خود آکر تمہیں بڑی عقیدت سے کافی کا گلاس پیش کروں گا۔"

گنگو کے جانے کے بعد میں نے دھوتی کرتہ اتار کر گیروے رنگ کا لمبا چولا اور دھوتی پہن لی۔ گلے میں منکوں والی مالائیں ڈالیں۔ سر پر لمبے لمبے بالوں والی وگ جمائی اور بالکل سادھو بن گیا۔ اس حلیے میں مجھے مشکل ہی سے پہچانا جا سکتا تھا۔ اس کے بعد میں نے صندوق میں سے پتلون قمیض اور بوٹ نکال کر تھیلے میں ڈالے اور تھیلا کندھے پر لٹکا لیا۔ پستول میں نے صندوق کے پیچھے ہی پڑا رہنے دیا۔ اس کی ضرورت نہیں تھی۔

میں سر سے پاؤں تک سادھو بن کر جھونپڑے سے نکل کر گنگو کے ہوٹل کی طرف چل پڑا۔ راستے میں ایک دو آدمی ملے مگر انہوں نے میری طرف کوئی توجہ نہ کی۔ ہوٹل کے پاس آیا تو دیکھا کہ باہر ایک لوہے کی کرسی پڑی تھی۔ میں جاتے ہی گنگو کی ہدایت کے مطابق اس پر بیٹھ گیا۔ کوئی ایک منٹ بعد گنگو میرے پاس آیا۔ اس کے ہاتھ میں کافی کا گلاس تھا۔

کہنے لگا۔

"مہاراج کافی لایا ہوں۔"

میں نے سادھوؤں کی طرح ہاتھ اٹھا کر کہا۔

"جے ویشنو بھگوان کی۔ سہجل رہو"

میں خاموشی سے کافی پینے لگا۔ دس پندرہ منٹ گزرے ہوں گے کہ سامنے بازار میں سادھوؤں کی ایک ٹولی آتی دکھائی دی۔ آگے آگے سوامی جی اپنے مخصوص جوگیوں والے بھیس میں تھے۔ ہاتھ میں ترشول تھا۔ شردھالو اور سادھو ان کے پیچھے پیچھے چل رہے تھے۔ ان میں کچھ لوگ سویلین کپڑوں یعنی دھوتی کرتوں اور پتلون قمیض میں بھی تھے۔ اس شخص نے ہر طبقہ خیال کے لوگوں کو اپنے زیر اثر کر رکھا تھا۔ یہ پندرہ بیس کے قریب لوگ تھے۔ سوامی جی آگے آگے چلتے کبھی کبھی جے گورو گورکھ ناتھ اور اولکھ نرنجن کا نع لگا رہے تھے۔ وہ میرے قریب سے گزرے تو انہوں نے کنکھیوں سے میری طرف دیکھا اور آگے نکل گئے۔ میں کرسی سے اٹھا اور جلوس میں شامل ہو گیا۔

چوک میں چار پانچ ویگنیں کھڑی تھیں۔ سب لوگ ویگنوں میں بیٹھ کر ریلوے سٹیشن پر آ گئے۔ ریلوے سٹیشن پر لوگ آکر سوامی جی کے ہاتھ چومتے اور ایک طرف ہٹ جاتے۔ ان لوگوں کو ریل گاڑی کا ٹکٹ لینے کی ضرورت نہیں تھی۔ کیونکہ انڈیا میں نابیناؤں اور جوگیوں سادھوؤں کو ریل کا ٹکٹ معاف ہوتا ہے۔ سب لوگ پلیٹ فارم پر آکر گاڑی میں سوار ہو گئے۔ مجھے سوامی جی نے اپنے ڈبے میں اپنے بالکل ساتھ بٹھا لیا وہ گردن ہلا ہلا کر رام نام کا جاپ کر رہے تھے۔

گاڑی چل پڑی۔ اس گاڑی کو ورنگل شہر تک جانا تھا۔ وہاں سے ہمیں ناگ جانے والی گاڑی پکڑنی تھی۔ یہ لمبا سفر تھا۔ ہمارے اردگرد دوسرے سادھو بیٹھے تھے۔ سٹیشن پر سوامی جی اور باقی سادھوؤں کی بڑی آؤ بھگت ہوئی۔ لوگ مٹھائیاں اور پوریاں کر دیتے۔ سارا دن گزر گیا۔ اس دوران سوامی جی مجھ سے مطلب کی کوئی بات نہ سکے۔ رات ہو گئی۔ سوامی جی نے اپنے مرید سادھوؤں سے کہا۔

"تم سب لوگ اب سو جاؤ۔ ہم جاگ کر رام نام کا جاپ کریں گے۔ یہ ہمار ہمارے ساتھ جاگے گا"

سب سادھو اور دوسرے لوگ سونے کی تیاریوں میں لگ گئے۔ پانڈی چری کے ریلوے سٹیشن پر مجھے پلیٹ فارم پر کھڑی ٹرین کے اردگرد کچھ ایسے چہرے نظر آئے تھے جو مشکوک چہرے تھے اور یقیناً یہ سی آئی ڈی اور ملٹری انٹیلی جینس کے خفیہ اہل کار تھے۔ جوگی سادھوؤں کی منڈلی کا وہ بڑے غور سے جائزہ بھی لے رہے تھے مگر خاموش تھے۔ پولیس دوسرے مسافروں کی چیکنگ وغیرہ بھی کر رہی تھی لیکن ہمیں کسی نے نہ پوچھا۔ وہ لوگ جانتے تھے کہ یہ سادھوؤں کی منڈلی ہے اور سوامی گورکھ ناتھ کی قیادت میں یاترا پر کسی تیرتھ استھان کو جا رہی ہے۔

رات کو جب سب سادھو لوگ گہری نیند سو رہے تھے تو سوامی جی نے جو میرے بالکل قریب بیٹھے تھے آہستہ سے میری طرف جھک کر کہا۔

"سب ٹھیک ہو جائے گا۔ ورنگل میں سی آئی ڈی زیادہ ہو گی۔ وہاں تم اوپر برتھ پر جا کر سو جانا"

ٹرین فراٹے بھرتی رات کی تاریکی میں بھاگی جا رہی تھی۔ سوامی جی نے ایک نظر سے قریب سوئے ہوئے سادھوؤں کا جائزہ لیا۔ پھر میرے قریب ہو کر آہستہ سے کہا۔

"ناگ پور پہنچنے کے بعد تم سے کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں۔ مجھ سے ملے بغیر سٹیشن سے باہر نہ جانا"

ورنگل کا سٹیشن آیا تو میں برتھ پر چڑھ کر لیٹ گیا۔ میں پہلو کے بل لیٹا تھا اور میرا چہرہ کھڑکی کی طرف تھا۔ میں اوپر والی برتھ پر لیٹا نیم وا آنکھوں سے کھڑکیوں کی طرف دیکھ رہا تھا جہاں سے مجھے پلیٹ فارم پر چلتے پھرتے لوگ نظر آ رہے تھے۔ ٹرین رکی ہوئی تھی۔ اتنے میں پولیس کے دو سپاہی سوامی جی کی کھڑکی کے پاس آکر کھڑے ہو گئے۔ انہوں نے سوامی جی سے اس علاقے کی زبان میں جو بعد میں سوامی جی نے بتایا کہ تلگو زبان تھی۔ حیدر آباد دکن اور آج کے آندھیرا پردیش میں زیادہ تر تلگو زبان بولی جاتی ہے۔ سوامی جی کو میں دیکھ رہا تھا۔ وہ بڑے اعتماد اور بے نیازی کے ساتھ پولیس والوں سے باتیں کر رہے تھے۔ تھوڑی دیر باتیں کرنے کے بعد سپاہی چلے گئے۔ سوامی جی نے نہایت دور

اندیشی سے کام لیتے ہوئے مجھے ورنگل کے سٹیشن پر برتھ پر جا کر لیٹ جانے کا مشورہ دیا
تھا۔ پولیس کے سپاہی ضرور میرے بارے میں ہی کچھ پوچھ رہے تھے۔ گاڑی آگے روانہ
ہو گئی تو سوامی جی نے چہرہ اوپر اٹھا کر میری طرف دیکھا۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں اور
سونے کی کوشش کرنے لگا۔ دو تین راتوں سے تقریباً جاگ رہا تھا۔ آنکھیں بند کرتے ہی
نیند آ گئی۔ جب بیدار ہوا تو گاڑی کے ڈبے میں دن کی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ گاڑی
پوری سپیڈ سے جا رہی تھی۔ سوامی جی کے چیلے ان کے آمنے سامنے والی نشستوں پر بیٹھے
تامل زبان میں ان سے باتیں کر رہے تھے۔ اب معلوم ہوا کہ ہمارے خاص آدمی کو
سوامی کے بھیس میں تھا تامل اور تلیگو زبانوں پر بھی عبور حاصل تھا۔ اس شخص نے اپنے
بارے میں اور اس علاقے میں اپنی پوزیشن کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا لیکن معلوم
ہوتا تھا کہ اس مجاہد کو اس علاقے میں بڑی خاص یعنی ماسٹر سپائی کی حیثیت حاصل ہے۔

میں بھی برتھ پر سے اتر کر سوامی جی کے پاس بیٹھ گیا اور ان کا پاٹھ بڑی عقیدت سے
سننے لگا۔ تیسرے پہر چندرا پور کا بڑا شہر آیا اور گزر گیا۔ سورج ناگ پور کے کارخانوں
اونچی اونچی چمنیوں کے پیچھے جھک رہا تھا کہ ٹرین ناگ پور پہنچ گئی۔ ہمارے سوامی جی
اپنے تمام عقیدت مند سادھوؤں اور منڈلی کے دوسرے لوگوں سے کہا کہ وہ پلیٹ فارم پر
ایک طرف بیٹھ جائیں ہم منہ ہاتھ دھو کر آتے ہیں۔ سوامی جی یہ کہہ کر فرسٹ کلاس کے
ویٹنگ روم کی طرف بڑھے۔ مجھے انہوں نے پہلے ہی ہدایت کر دی تھی کہ سٹیشن پر
اترتے ہی میں فرسٹ کلاس کے ویٹنگ روم میں چلا جاؤں۔ چنانچہ میں ٹرین کے رکتے ہی
ڈبے سے اتر کر جہاں انہوں نے کہا تھا وہاں پہنچ گیا تھا۔ فرسٹ کلاس کا ویٹنگ روم خالی
تھا۔ ایک طرف لکڑی کی جالی دار سکرین کھڑی تھی۔ میں نے وہاں جا کر اپنا حلیہ تبدیل
کیا اور سکرین سے باہر آ گیا۔ سوامی جی مجھے اس سکرین کے پیچھے لے گئے اور دھیمی آواز
میں کہنے لگے۔

"یہ اطلاع مجھے بھی مل چکی ہے کہ بھارت نے پاکستان پر حملہ کرنے کا پروگرام بنا
ہے۔ میجر شرت دیوان کے قریب رہ کر تھوڑی سی کوشش سے تمہیں اس بارے میں

معلومات مل سکتی ہیں۔ اس منصوبے کی جو بھی خبر ملے اسے فوراً جس طرح بھی ہو سکے
سری نگر میں کمانڈو شیروان کو پہنچا دینا۔ مجھ سے شاید تمہاری ملاقات نہ ہو۔ لیکن ناگ پور
میں بھی ہمارا ایک آدمی موجود ہے۔"

پھر سوامی جی نے مجھے تھیلے میں سے ایک تہہ کیا ہوا کاغذ نکال کر دیا اور کہا۔

"اس میں اس آدمی کا ایڈریس اور وہ ہندوانہ نام جس طرح وہ ناگ پور میں رہ رہا
ہے لکھا ہوا ہے۔ خفیہ کوڈ ورڈ بھی لکھا ہوا ہے۔ ضرورت پڑنے پر تم اس سے مل سکتے
ہو۔ وہ دھماکہ خیز ڈیوائسز بنانے کا ماہر ہے۔ اب تم خاموشی سے نکل جاؤ۔ اللہ حافظ!"

یہ کہہ کر سوامی جی جے گورو گورکھ ناتھ کا نعرہ بلند کرتے ہوئے ویٹنگ روم کے باتھ
روم کی طرف چل دیئے۔ میں چپکے سے باہر آ گیا۔ اب مجھے وہاں سے سیدھا ناگ پور فوجی
ہیڈ کوارٹر کی ملٹری کینٹین کی طرف جانا تھا۔ میرے چہرے پر کیپٹن جوشی کے نشتر کا لگایا ہوا
ی لکیر ایسا نشان باقی تھا۔ زخم ٹھیک ہو گیا تھا مگر نشان موجود تھا۔ میں نے سٹیشن سے نکلتے
لمبی پگڑی اور ملٹری ہیڈ کوارٹر پہنچ گیا۔ گیٹ پر دو فوجی کھڑے تھے۔ ان میں سے ایک
صورت سے واقف تھا۔ پھر بھی اس نے فوجی کینٹین میں فون کر کے میرے بارے
تصدیق کرنے کے بعد مجھے گیٹ کے اندر جانے دیا۔ فوجی کینٹین پر کینٹین کا مالک مہتہ
ل تھا۔ اسسٹنٹ جگدیش موجود تھا۔ مجھے دیکھتے ہی اس نے ہاتھ جوڑ کر نمسکار کیا اور

"شری دھرم ویر جی! ورنگل سے کب واپس آئے؟"

میں نے کہا۔

"بھیا جی! ابھی آ رہا ہوں۔ مہتہ جی کہاں ہیں؟"

جگدیش ایک مدراسی فوجی کے سامان کو لفافے میں ڈال رہا تھا۔ کہنے لگا۔

"مہتہ جی مارکیٹ گئے ہیں۔ اب شاید کل ہی آئیں گے صبح کو"

میں نے کہا۔

"میں اپنے بڑے بھیا میجر صاحب سے مل کر ابھی آتا ہو"

جگدیش مسکراتا رہا۔ میں آفیسرز کوارٹرز کی طرف بڑھ گیا۔ سورج غروب ہونے و
تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ یہ وقت میجر شرت دیوان کے شراب کی محفل سجانے کے ہوتا ہے
وہ ضرور اپنے کمرے میں ہی ہو گا۔ میرا اندازہ غلط نہیں تھا۔ میجر شرت ڈرائنگ روم
سامان شراب ترتیب سے رکھ رہا تھا۔ اس کا اردلی پاس کھڑا صاف کپڑے سے شیشے
گلاس کو چمکا رہا تھا۔ میجر نے جیسے ہی مجھے دیکھا مسکرانے لگا۔

"ارے دھرم ویر جی! کب آئے؟ تم جلدی نہیں آگئے؟"

میں نے میجر شرت دیوان سے آگے بڑھ کر ہاتھ ملایا۔ میجر نے مجھے گلے لگا لیا۔
نے کہا۔

"بھیا جی! ورنگل میں میرا جی نہیں لگا۔ خیال تھا کچھ نہیں تو دس پندرہ دن
رہوں گا مگر آپ کی یاد آنے لگی۔ ورنگل میں بھی کوئی دلکشی نہیں تھی۔ بس
آگیا۔"

میجر شرت نے میرے رخسار پر زخم کا نشان دیکھ کر پوچھا۔

"یہ زخم کہاں سے لگا؟"

میں نے کہا۔

"ورنگل کے ایک مندر میں پوجا پاٹھ کرنے گیا تھا۔ ایک بندر نے حملہ کر دیا پنجہ
اور میرا گال زخمی ہو گیا۔ میجر شرت نے ہلکا سا قہقہہ لگا کر کہا۔

"ہنومان جی کو تم پر پیار آگیا ہو گا"

اس دوران اردلی نے میجر کے گلاس میں شراب کا پہلا پیگ بنا دیا تھا۔ نہ میں
پانڈی چری کے جہازوں کی تباہی کا پوچھا۔ نہ میجر شرت نے ان کا کوئی ذکر کیا۔ وہ واقع
ذمے دار بھارتی فوجی افسر تھا۔ فوج میں انٹیلی جینس کور والے عہدے دار ویسے بھ
قسم کی باتوں کو اپنوں سے بھی چھپا کر رکھتے ہیں۔ اگر کوئی پوچھ بیٹھے تو گول مول
دے دیتے ہیں۔ ناگ پور شہر پانڈی چری سے بہت دور تھا۔ اگرچہ پانڈی چری کی
انتظامیہ نے ناگ پور سے میجر شرت کو بلوایا تھا کہ وہ گرفتار شدہ پاکستانی یا کشمیری

ے پوچھ گچھ کرے لیکن میجر شرت کا پانڈی چری کے انٹیلی جینس ہیڈ کوارٹر سے براہ
راست ایسا کوئی تعلق نہیں تھا۔ اس وجہ سے میں کسی حد تک مطمئن تھا کہ پانڈی چری
میں بھی جن فوجی افسروں نے ٹارچر کیا ہے خاص طور پر کیپٹن جوشی یہ لوگ ناگ پور نہیں
آئیں گے۔ میں میجر شرت کے پاس بیٹھا ماتا جی اور شکنتلا جی کا احوال پوچھ رہا تھا کہ
ایک سکھ کیپٹن اندر آگیا۔ یہ شراب نوشی میں میجر کا ساتھی تھا۔ میں نمستے کہہ کر اٹھا اور
وہاں سے نکل آیا۔

یہ جولائی کا مہینہ تھا۔ ابھی جولائی کی دو تین تاریخ ہی تھی۔ جنوبی ہند میں بارشوں کا
سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔ جس دن میں ناگ پور پہنچا اسی رات بڑی موسلا دھار بارش
ہوئی۔ صبح اٹھا تو درخت دھلے دھلائے سرسبز ہو رہے تھے۔ آسمان پر گھٹائیں جھکی ہوئی
تھیں رات کو اپنے کمرے میں آکر دروازے کو چٹخنی لگا کر سوامی جی کا دیا ہوا رقعہ غور سے
پڑھ لیا تھا۔ اس میں ناگ پور میں اپنے خاص جاسوس کا ہندوانہ نام اور اس کا ایڈریس لکھا
ہوا تھا۔ خفیہ کوڈ ورڈ یہ تھا۔

"میں مالا پورم کا شکاری ہوں"

یہ جملہ مجھے اپنے جاسوس ساتھی کو جا کر کہنا تھا۔ اس نے پوچھنا تھا۔

"مالا پورم میں برکھا تو نہیں ہوئی؟"

اس کے جواب میں مجھے کہنا تھا۔

"مالا پورم میں برف باری ہوئی ہے"

سوامی جی نے کہا تھا کہ میں ضرورت کے وقت اس آدمی سے ملوں۔ لیکن میں نے
سوچا کہ کیوں نہ پہلے اپنے جاسوس سے ایک سرسری ملاقات کر لی جائے اور جگہ بھی دیکھ
لی جائے۔ ضرورت کے وقت جگہ تلاش کرنے میں وقت ضائع نہیں کرنا پڑے گا۔

چنانچہ دوپہر کے کھانے کے بعد میں نے اپنے اسسٹنٹ جگدیش سے کہا۔

"جگدیش جی! میں گنپتی راگھو جی کے مندر میں ماتھا ٹیکنے جا رہا ہوں۔ تھوڑی دیر میں
آجاؤں گا"

جگدیش بولا۔

"دھرم ویر جی! میرے لئے پرشاد ضرور لیتے آنا۔"

میں نے کہا۔

"ضرور لیتا آؤں گا۔"

میں فوجی ہیڈ کوارٹر کے گیٹ سے نکل کر سڑک پر آگیا۔ سوامی جی نے اپنے جا
کا جو ایڈریس دیا تھا میں ٹیکسی لے کر وہاں پہنچ گیا۔ میں یہ نہیں بتاؤں گا کہ وہ ناگ پ
کون سا علاقہ تھا۔ اپنے جس جاسوس کے پاس جانا تھا اس کی دکان بازار کے شروع
تھی۔ میں یہ بھی نہیں بتاؤں گا کہ اس کی دکان کس چیز کی تھی۔ بس یوں سمجھ لیں
ایک دکان تھی اور وہاں روز مرہ ضروریات کی اشیاء فروخت ہوتی تھیں۔ میں دکان
داخل ہو گیا اور الماری اور شیلف کے خانوں میں لگی ہوئی چیزوں کو دیکھنے لگا۔ ساتھ
کنکھیوں سے میں نے دیکھ لیا کہ ایک دبلا پتلا سانولے رنگ کا آدمی کونے میں کاؤنٹر
پیچھے کرسی پر بیٹھا اخبار پڑھ رہا ہے۔ یقیناً یہی دکان کا مالک تھا اور اپنا خاص جاسوس ت
اس وقت اس کے پاس کوئی گاہک موجود نہیں تھا۔ میں آہستہ آہستہ چیزوں کو دیکھتا ا
کے پاس آکر رک گیا۔ میں اس کا ہندوانہ نام بھی نہیں بتاؤں گا۔ آپ فرضی نام رکھ لیں
چلئے گھنشام رکھ لیں۔ میں نے اس سے مخاطب ہو کر کہا۔

"مہاراج! مجھے گھنشام جی سے ملنا ہے۔"

اس آدمی نے اخبار کے اوپر سے نظریں اٹھا کر مجھے دیکھا اور کہا۔

"میں ہی گھنشام ہوں۔ کیا کام ہے تمہیں؟"

میں نے کاؤنٹر پر اس کی طرف تھوڑا سا جھک کر کہا۔

"میں مالا پورم کا شکاری ہوں۔"

گھنشام پر میرے اس خفیہ کوڈ جملے کا بظاہر کوئی اثر نہ ہوا۔ اس نے نظریں اخبار
جمالیں اور آہستہ سے پوچھا۔

"مالا پورم میں برکھا تو نہیں ہوئی؟"

میں نے کہا۔

"مالا پورم میں برفباری ہوئی ہے۔"

اس نے اخبار پڑھتے ہوئے آہستہ سے کہا۔

"تمہارے پیچھے لکڑی کا زینہ اوپر کوٹھڑی میں جاتا ہے۔ اوپر جا کر میرا انتظار کرو۔"

میں پیچھے ہٹ گیا اور الماریوں میں رکھی چیزوں کو دیکھتا ہوا پیچھے مڑا۔ سامنے لکڑی کا
تنگ زینہ اوپر جا رہا تھا۔ میں خاموشی سے زینہ چڑھنے لگا۔ چھ سات سیڑھیاں تھیں۔ اوپر
کوٹھڑی کا دروازہ بند تھا میں نے اسے کھولا اور اندر جا کر دروازہ بند کر دیا۔ کوٹھڑی کی
سامنے والی دیوار میں ایک کھڑکی تھی جو کھلی تھی۔ اس پر سفید پردہ گرا ہوا تھا۔ وہاں سے
دن کی ابر آلود دھندلی روشنی کوٹھڑی میں آرہی تھی۔ دیوار کے ساتھ لکڑی کا تخت بچھا ہوا
تھا۔ ادھر ادھر دکان سے متعلق اشیائے ضرورت کونے میں پڑی تھیں۔ بانس کی دو پرانی
کرسیاں بھی تھیں۔ میں کرسی پر بیٹھ گیا۔ کوئی پانچ سات منٹ کے بعد گھنشام اوپر آگیا۔
میرے سامنے تخت پوش پر بیٹھتے ہی بولا۔

"تمہیں یقین ہے کہ یہاں آتے ہوئے تمہیں کسی نے نہیں دیکھا؟ کوئی
مشکوک شخص تمہارا پیچھا تو نہیں کر رہا تھا؟"

میں نے کہا۔

"مجھے یقین ہے کہ ایسا کوئی آدمی میرا پیچھا نہیں کر رہا تھا"

"ہوں۔"

پھر اس نے میرا نام دھرم ویر لیا اور بولا۔

"کچھ روز پہلے سوامی جی نے ایک آدمی کے ہاتھ مجھے تمہارے بارے میں
سب کچھ بتا کر بھیج دیا تھا۔ وہ کل اچانک ناگ پور یاترا پر کیوں آئے ہیں؟ کیا
تمہیں معلوم ہے؟"

میں نے اسے بتایا کہ وہ صرف مجھے حفاظت سے ناگ پور تک پہنچانے
آئے تھے"

گھنشام کی آنکھیں چمکیلی تھیں۔ عمر ساٹھ کے قریب ہو گی۔ چہرے پر ذہانت کی چمک تھی۔ کہنے لگا۔

"یہ انہوں نے بڑا اچھا کیا۔ تم لوگوں نے پانڈی چری میں دشمن کے جہازوں کو غرق کر کے بڑا کارنامہ کیا ہے۔ اس کے بعد تمہارا اکیلے ناگ پور آنا خطرے سے خالی نہیں تھا۔"

مجھے معلوم ہوا کہ اس شخص کو میرے اور کمانڈو اورنگ زیب کے بارے میں سب کچھ معلوم تھا۔ کہنے لگا۔

"یہ اللہ کا بڑا کرم ہوا کہ سوامی جی کو عین وقت پر تمہارے بارے میں پتہ چل گیا اور انہوں نے کیپٹن جوشی کے ٹارچر چیمبر سے فرار ہونے کا موقع فراہم کر دیا۔ ورنہ کیپٹن جوشی ایسے قصاب کے ہاتھوں تمہارا زندہ بچنا ناممکن تھا۔ وہ اس سے پہلے ہمارے دو کشمیری کمانڈوز کو ٹارچر کر کے ہلاک کر چکا ہے۔"

میں حیران بھی ہوا اور خوش بھی ہوا کہ اپنے اس خاص جاسوس کو ناگ پور کی ایک معمولی سی دکان میں بیٹھے بیٹھے دشمن کی تمام سرگرمیوں کا علم تھا۔ وہ کہنے لگا۔

"تم میجر شرت دیوان کے پاس ہوتے ہو۔ وہاں سے تمہیں بھارتی فوج کے ٹاپ سیکرٹ منصوبوں کا پتہ چل سکتا ہے۔ راجدھانی دلی سے ہمارے آدمی نے ایک ہفتہ پہلے ہمیں اطلاع دی تھی کہ بھارت نے پاکستان پر حملہ کرنے کا پروگرام تیار کر لیا ہے۔ وہ پاکستان کو مظلوم کشمیریوں کی سیاسی اور اخلاقی مدد دینے کے جرم میں سزا دینا چاہتا ہے۔ کیا اس بارے میں تمہیں کچھ خبر ہے؟"

میں نے آہستہ سے کہا۔

"میں نے ملٹری انٹیلی جینس کی ٹاپ سیکرٹ فائل میں خود پڑھا ہے کہ انڈیا نے پاکستان پر سرحد کی تین چار طرف سے اچانک حملہ کرنے کا منصوبہ تیار کر لیا ہوا ہے۔ مگر مجھے ابھی تک پاکستان پر بھارت کے حملے کی تاریخ اور وقت

معلوم نہیں ہو سکا۔"

گھنشام نے کہا۔

"اس کا معلوم کیا جانا بہت ضروری ہے۔ ظاہر ہے اگر انڈیا نے پاکستان پر حملہ کیا تو یہ کھلی جنگ ہو گی اور اس کے ساتھ ہی ہمارے کشمیری مجاہدین کے خلاف بھی کھلی جنگ کا اعلان کر دیا جائے گا اور ان کے ٹھکانوں پر فوج کے پورے پورے بریگیڈ حملہ کریں گے اور ان کے ساتھ مارٹر توپیں بھی ہوں گی۔"

میں نے کہا۔

"میں اسی لئے میجر شرت کے ساتھ دھرم ویر بن کر رہ رہا ہوں۔ مجھے جیسے ہی پاکستان پر بھارتی حملے کی تاریخ کا سراغ ملا میں فوراً ہی کمانڈو شیروان کو وائرلیس پر سری نگر اطلاع کر دوں گا۔"

گھنشام نے کہا۔

"تمہیں اگر کسی وقت میری ضرورت پڑے تو میری دکان پر آنے کی بجائے مجھے ٹیلی فون کر دینا۔ اپنا فون نمبر میں تمہیں لکھ کر دیئے دیتا ہوں۔ دن کے وقت ٹیلی فون میرے پاس نیچے دکان میں ہوتا ہے رات کو میں اسی کوٹھڑی میں سوتا ہوں اس وقت میں ٹیلی فون اوپر کوٹھڑی میں لے آتا ہوں۔"

گھنشام نے ایک کاغذ پر مجھے اپنا فون نمبر لکھ کر دیا اور کہنے لگا۔

"میں تمہیں ہر قسم کی دھماکہ خیز چیزیں تیار کر کے دے سکتا ہوں۔ میں اس کام کا ماہر ہوں۔"

میں نے کہا۔

"سوامی جی نے مجھے بتا دیا تھا"

گھنشام کہنے لگا۔

"اب تم جاؤ اور اشد ضرورت کے وقت ہی مجھے فون کرنا۔ اور فون پر

کہنا کہ میں بالا جی سے ملنا چاہتا ہوں۔ جب میں کہوں کہ میں ہی بالا جی بول رہا ہوں تو تم کہنا کہ میں مالا پورم کا شکاری ہوں۔ اس کے بعد ہم ایک دوسرے کو پہچان لیں گے۔ پھر تمہیں جو بات کرنی ہو گی وہ فون پر نہیں کرو گے۔ فون پر صرف ہماری فوری ملاقات کا وقت طے ہو گا۔ سمجھ گئے ہو!"

میں نے کہا۔

"ہاں۔ سمجھ گیا ہوں"

"اب تم خاموشی سے نیچے اترو اور دکان سے نکل جاؤ۔"

میں اٹھا۔ دروازہ کھول کر زینے پر سے ہوتا ہوا دکان میں آگیا۔ دکان میں ایک ملازم ٹائپ کا لڑکا ایک گاہک عورت کو کوئی شے دکھا رہا تھا۔ میں سر جھکائے خاموشی سے اس کے قریب سے گزرتا ہوا بازار میں اتر گیا۔ بازار میں آیا تو دیکھا کہ بوندا باندی شروع ہو گئی تھی۔ میں نے ایک رکشا لے لیا اور فوجی کینٹین پر واپس آگیا۔ راستہ میں میں نے ایک حلوائی کی دکان پر رکشا کھڑا کیا اور میٹھی بوندیوں کے دو دونے لے کر رکھ لئے۔ میں نہیں بھولا تھا کہ جگدیش مجھ سے گنپتی رگھو جی کے مندر کا پرشاد ضرور مانگے گا۔ کینٹین میں جا کر میں نے بوندیوں کا ایک ڈونا دے کر کہا۔

"یہ لو جگدیش رگھو جی کے مندر کا پرشاد۔"

اس نے ہاتھ جوڑ کر بڑی عقیدت سے پرشاد لیا اور بوندیاں کھاتا ہوا اپنے کام میں لگ گیا۔ اس وقت بھی بوندا باندی ہو رہی تھی۔ شام کو زور کی بارش شروع ہو گئی۔ میں کینٹین کے کام سے فارغ ہو کر دوسرے کپڑے بدل کر میجر شرت کے آفیسرز ہوسٹل کی طرف چل پڑا۔ بوندیوں کا ڈونا میں نے لفافے میں ڈال کر ساتھ رکھ لیا تھا۔

بارش ہو رہی تھی۔ کینٹین سے میجر شرت کا کمرہ زیادہ دور نہیں تھا۔ راستے میں صرف کوارٹر گارڈ کا کمرہ ہی آتا تھا۔ میجر شرت کے کمرے میں

شراب و کباب کی محفل لگی ہوئی تھی۔ مگر صرف دو آدمی تھے۔ میجر شرت اور ملٹری انٹیلی جینس کور کا سکھ کیپٹن دونوں ایک ایک پیگ پی چکے تھے اور ہلکے ہلکے سرور میں تھے۔ میں نے ہاتھ جوڑ کر نمسکار کیا اور لفافے میں سے ڈونا نکال کر میجر شرت کو پیش کرتے ہوئے کہا۔

"بھیا! میں آج گنپتی رگھو جی کے مندر میں ماتھا ٹیکنے گیا تھا۔ آپ کے لئے پرشاد لایا ہوں۔"

میجر شرت نے بڑی عقیدت سے ڈونا لے کر اپنے ماتھے سے لگایا اور اردلی سے کہا۔

"اسے سنبھال کر رکھ لو۔ ہمیں ڈنر کے ساتھ دینا نہ بھولنا۔"

اردلی ڈونا لے کر کچن کی طرف چلا گیا۔ میں نے محسوس کیا کہ سکھ کیپٹن مجھے گھور کر دیکھ رہا ہے۔ میں نے بظاہر اس کا کوئی نوٹس نہ لیا۔ سکھ کیپٹن بولا۔

"دھرم ویر! یہ تمہاری گال پر زخم کا لمبا نشان کہاں سے آگیا ہے؟"

اس سے پہلے کہ میں کوئی جواب دیتا میجر شرت دیوان نے ہنس کر کہا۔

"دھرم دیر ورنگل کے مندر میں ماتھا ٹیکنے گیا تھا۔ وہاں ہنومان جی کو اس پر پیار آگیا۔ انہوں نے پنجہ مار دیا۔"

سکھ کیپٹن گلاس منہ کے ساتھ لگا کر ہلکے ہلکے گھونٹ بھر رہا تھا۔ میں نے گال سہلاتے ہوئے کہا۔

"میرا بھائی بھی ساتھ تھا۔ ان کی طرف کوئی بندر نہیں گیا تھا۔"

میجر شرت بولا۔

"ارے تمہارے چچا کا پتر ہنومان جی کو برا لگا ہو گا۔"

میں اس سکھ کیپٹن کی طرف سے محتاط ہو گیا۔ حالانکہ ایسی کسی بات کا امکان نہیں تھ کہ ملٹری انٹیلی جینس کے سکھ کیپٹن کو پتہ چل گیا ہو کہ میرے گال پر جو زخم کا لمبا نشان ہے وہ پانڈی چری کے ٹارچر چیمبر میں کیپٹن جوشی کے نشتر لگانے سے پڑا ہے۔ پھر بھی ایک کمانڈو سپاہی کی حیثیت سے میرا محتاط ہونا لازمی تھا۔ وہاں بیٹھنے رہنے کا بہانہ میں نے ڈھونڈ رکھا تھا کہ میں گلاس میں موقع پا کر تھوڑی شراب ڈال دیتا تھا۔ کسی کا گلاس ہوتا تو میں جلدی سے اس میں برف کے دو چار ٹکڑے ڈال کر دوسرا پیگ تیار کر دیتا اس رات بھی میں دیر تک شرت دیوان کے کمرے میں شراب کی محفل میں بیٹھا رہا شاید وہ کوئی فوجی سیکرٹ کی بات کریں۔ کیونکہ شراب کے نشے میں چاہے کتنا محتاط کیوں ہو اس کی زبان سے کوئی نہ کوئی بات ضرور نکل جاتی ہے۔ مگر اس رات دونوں عورتوں

باتیں کرتے رہے۔ انہوں نے پانڈی چری کے جہازوں کی تباہی اور پاکستان پر بھارت کے متوقع حملے کے بارے میں کوئی بات نہ کی۔ باہر بارش ہو رہی تھی۔ کھلی کھڑکیوں میں سے بارش کی آواز بھی آ رہی تھی اور بارش میں بھیگی ہوئی جنوبی ہند کی ٹھنڈی ہوا بھی آ رہی تھی۔ میں میجر شرت کے لئے تیسرا پیگ بنا رہا تھا کہ سکھ کیپٹن نے بھنے ہوئے مرغ کی ٹانگ چباتے ہوئے اس سے کہا۔

"پانڈی چری کی نیول انٹیلی جینس کے سب افسروں کا کورٹ مارشل ہونا چاہئے کہ اتنا خطرناک کمانڈو ان کی قید سے فرار ہو گیا اور وہ سوئے پڑے رہے۔"

میرے کان کھڑے ہو گئے۔ میجر شرت دیوان سگار سلگا رہا تھا۔ کہنے لگا۔

"وہ اس قدر نا اہل لوگ ہیں کہ ابھی تک وہ مفرور کمانڈو کو پکڑ بھی نہیں سکے۔ پانڈی چری کی پولیس میں بھی سب گدھے بھرتی ہوئے ہیں۔"

سکھ کیپٹن بولا۔

"ہمارا بہت بڑا نقصان ہوا ہے۔ ان جہازوں میں اسرائیل کی طرف سے ہمیں دیئے گئے جدید قسم کے اعلیٰ ترین راڈار بھی تھے۔ کانگریس کی حکومت بھی منہ دیکھ رہی ہے۔ کچھ نہیں کرتی۔ ہماری اسرائیلی حکومت کے آگے بھی سخت بدنامی ہوئی ہے۔"

میجر شرت کو میں نے دوسرا گلاس بنا کر دے دیا تھا۔ وہ اس کے گھونٹ بھرنے کے بعد گلاس میز پر رکھ کر کہنے لگا۔

"تم دیکھ لینا ہفتے کی رات کو اسرائیل کے جرنیلوں کو ہم ڈنر دے رہے ہیں وہ سب سے پہلے ہمارے جنرل گھماپا سے یہی سوال کریں گے کہ ہمارے جہازوں کا سکیورٹی کا انتظام اتنا کمزور کیوں رکھا گیا تھا کہ کمانڈوز آ کر بڑی آسانی سے دونوں جہاز غرق کر گئے۔ میں تو ڈنر میں نہیں ہوں گا مگر میں اپنے جنرل صاحب کے سیکرٹری کو ضرور سمجھا دوں گا کہ وہ ہماری آرمی کی انٹیلی جینس کے نام پر حرف نہ آنے دے اور اسرائیلی جرنیلوں کو ڈنر میں کسی طرح یہ بات بتا دے کہ یہ حادثہ نیول انٹیلی جینس کی غفلت سے ہوا ہے"

سکھ کیپٹن کہنے لگا۔

"نہ یار یہ نہ سمجھانا اسے۔ اس سے ہماری ہی فوج کی بدنامی ہوگی۔"

میجر شرت نے سگار کا کش لگاتے ہوئے کہا۔

"ایک بات ہے۔ اسرائیل ہمارا بہترین دوست ہے اس وقت۔ چاہے وہ اس وجہ سے ہی کیوں نہ ہو کہ وہ پاکستان کا دشمن ہے۔"

سکھ کیپٹن نے کہا۔

"سر! ہمیں تو اس وقت زیادہ سے زیادہ اسلحہ کی ضرورت ہے۔ ہمارے سیکرٹ آپریشن اب زیادہ دور نہیں ہیں"

میجر شرت نے کہا۔

"ڈونٹ وری امریک سنگھ! اسرائیل ہمارے نقصان کو پورا کردے گا۔ اس کے تین اہم ترین جرنیل اسی مقصد کے لئے بھارت آرہے ہیں اور ہفتے کی میٹنگ میں وہ ہمیں یہی بتانے والے ہیں کہ بھارت کو مزید اسلحہ بھیجا جائے گا۔ اس کے علاوہ امریکہ کی ایمونیشن سپلائی بھی نیویارک کی بندرگاہ سے چل پڑی ہے۔"

سکھ کیپٹن کا نام امریک سنگھ تھا۔ وہ جھلا کر بولا۔

"یہ ہماری ہائی کمانڈ پاکستان پر حملے کا ٹائم اور ڈیٹ ہمیں کیوں نہیں بتا رہی؟"

میجر شرت نے کہا۔

"اصل میں ہائی کمانڈ نے تاریخ اور وقت مقرر کرلیا ہوا ہے۔ ہمیں آخری وقت پر بتایا جائے گا۔"

سکھ کیپٹن نے پاکستان کے خلاف دو چار باتیں کیں اور تیسرا پیگ غٹا غٹ ختم کر دیا۔ میں اس کے لئے چوتھا پیگ بنا رہا تھا کہ میجر شرت نے اردلی کو آواز دے کر کہا کہ کھانا لگا دیا جائے۔ پھر اس نے مجھ سے کہا۔

"دھرم ویر تم بھی کھانا کھا کر ہی جانا"

اب ان دونوں کو نشہ چڑھنا شروع ہوگیا تھا اور انہوں نے عورتوں کے بارے میں بڑی فحش باتیں شروع کر دی تھیں۔ مجھے یہاں سے ایک بڑی اہم خبر مل گئی تھی جو ایک

سیکرٹ خبر تھی۔ اب میرا رکنا بے کار تھا۔ چنانچہ میں نے میجر شرت سے کہا۔

"بھیا! ورنگل سے شاید بڑے بھائی کا ٹیلی فون آجائے۔ اس لئے جاتا ہوں"

وہ بولا۔

"ٹھیک ہے۔ تمہارا کھانا اردلی تمہیں کمرے میں پہنچا دے گا۔ جاؤ میرے دھرم ویر۔ تم سچ مچ میرے دھرم کے ویر ہو۔"

پھر اس نے سکھ کیپٹن کی طرف متوجہ ہو کر نشے میں سر ادھر ادھر ہلاتے ہوئے کہا۔

"امریک سنگھ! اس لڑکے دھرم ویر نے ہم پر احسان کیا ہے کہ ہم اس کا بدلہ نہیں دے سکتے۔ یہ میری بہن کو ڈاکوؤں کے غار سے نکال کر لے آیا۔ یہ بڑا بہادر لڑکا ہے۔ اسے تو فوج میں کیپٹن ہونا چاہئے تھا۔"

سکھ کیپٹن صرف میری طرف دیکھتا رہا۔ اس نے آگے سے کوئی جواب نہ دیا۔ میں تھوڑی دیر بعد وہاں سے نکل آیا۔ کیونکہ اب انہوں نے فوجی امور سے ہٹ کر عورتوں کے بارے میں اور خاص طور پر دوسرے آفیسرز کی بیویوں کے بارے میں باتیں کرنی شروع کر دی تھیں اور تجربے نے مجھے بتایا تھا کہ اب وہ اس وقت تک عورتوں ہی کی باتیں کرتے رہیں گے جب تک کہ وہ نشے میں دھت نہیں ہو جاتے۔ سکھ کیپٹن کے ساتھ میجر شرت بھی زیادہ پی جاتا تھا۔

میں آفیسر ہوسٹل سے نکلا تو باہر بارش ہو رہی تھی۔ اگرچہ بارش موسلا دھار نہیں تھی مگر برابر ہو رہی تھی۔ جنوبی اور وسطی ہند کی بارشیں ایسی ہی ہوتی ہیں۔ میں بارش میں بھیگتا دوڑتا ہوا اپنے کمرے میں پہنچا۔ اس وقت میرے دماغ میں صرف ایک ہی خیال گردش کر رہا تھا۔ اسرائیلی فوج کے تین ٹاپ کے جرنیل بھارت کو مزید اسلحہ فراہم کرنے کے موضوع پر بات چیت کرنے اور بھارتی فوجی ہائی کمانڈ کو پاکستان کے خلاف حملے کی سٹریٹجی بتانے ناگ پور پہنچ رہے تھے۔ ہفتے کی رات کو انہیں کسی جگہ ڈنر دیا جا رہا تھا جہاں یہ ساری باتیں طے ہونی تھیں۔ میجر شرت دیوان کی گفتگو سے مجھے یہ بھی معلوم ہوگیا تھا کہ اسرائیل کے یہ تینوں جرنیل پاکستان پر حملہ کرنے کے وقت بھارت میں موجود ہوں

گے پاکستان پر حملے کے سلسلے میں بھارتی جرنیلوں کی مدد کریں گے۔ اس ڈنر میں بھارتی فوج کے بھی تین ٹاپ کے جرنیل شرکت کر رہے تھے۔ میں نے اس مقام کو طاقتور دھماکے سے اڑانے کا ارادہ کر لیا تھا جہاں پاکستان کے چھ دشمن جرنیل جمع ہو کر پاکستان کی سلامتی کے خلاف منصوبہ بندی کرنے والے تھے۔

ابھی ہفتے کے دن میں دو دن باقی تھے۔ مجھے جو کچھ بھی تیاریاں کرنی تھیں ان دو دنوں کے اندر اندر ہی کرنی تھیں۔ مجھے اس وقت اپنے خاص آدمی کا خیال آ گیا جو گھنشام کے نام سے ناگ پور شہر میں مقیم تھا اور جس سے میں اسی روز ملاقات کر چکا تھا۔

چنانچہ دوسرے دن میں وقت نکال کر فوجی کینٹین سے نکلا اور گھنشام کی طرف چل پڑا۔ راستے میں ایک میڈیکل سٹور سے اسے فون پر بتایا کہ میں آ رہا ہوں۔ بڑی ضروری بات کرنی ہے۔ میں نے فوجی کینٹین سے فون کرنا مناسب نہ سمجھا تھا۔ اس خیال سے کہ کینٹین فوجی ہیڈ کوارٹر کے اندر ہی ہے ہو سکتا ہے یہاں سے باہر جانے والی فون کال چیک ہوتی ہو۔ گھنشام نے فون پر کہا۔

"آجاؤ میں انتظار کر رہا ہوں"

میں اس کی دکان میں پہنچا تو وہ حسب معمول اخبار پڑھ رہا تھا مگر اس نے مجھے دکان میں داخل ہوتے دیکھ لیا تھا۔ اس کا ملازم دو تین گاہکوں کو کچھ چیزیں دکھا رہا تھا۔ اس نے اخبار کے اوپر سے نظریں میری طرف اٹھائیں اور اوپر جانے کا اشارہ کیا۔ میں لکڑی کا زینہ طے کر کے اوپر والی کوٹھڑی میں جا کر بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر میں گھنشام بھی آ گیا۔ میں نے اسے ساری بات بتائی اور کہا۔

"مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے"

وہ بولا۔

"تم کیا چاہتے ہو؟"

میں نے کہا۔

"ہفتے کی رات کو ناگ پور کی ملٹری انٹیلی جنیس کی طرف سے اسرائیلی جرنیلوں کو

ڈنر دیا جا رہا ہے اس ڈنر میں بھارت کو اسرائیل اور امریکہ سے ملنے والے اسلحہ کی بھاری کھیپ کی بات بھی طے ہو گی اور بھارتی فوج کے تین ٹاپ کے جرنیلوں کو اسرائیلی فوجی جرنیل پاکستان کے خلاف حملہ کرنے کی حکمت عملی بھی بتائیں گے اس ڈنر میں پاکستان کے دشمن چھ ایسے فوجی جرنیل ایک جگہ جمع ہوں گے جو پاکستان کو شدید ترین میں نقصان پہنچا سکتے ہیں میں ان چھ کے چھ پاکستان دشمن جرنیلوں کو ہلاک کرنا چاہتا ہوں اور انہیں ایک ساتھ ہلاک کرنے کی صرف یہی ایک صورت ہو سکتی ہے کہ جہاں وہ میٹنگ کر رہے ہوں میں اس جگہ کو دھماکے سے اڑا دوں۔ دھماکہ اس قدر طاقتور اور ہلاکت خیز ہونا چاہیے کہ وہاں بیٹھے ہوئے اسرائیل اور بھارت کے جرنیلوں میں سے ایک بھی زندہ نہ بچے۔ کیا تم اس سلسلے میں میری مدد کرو گے؟"

گھنشام خاموش تھا۔ وہ سر جھکائے کسی سوچ میں تھا۔ چند لمحے خاموش رہنے کے بعد وہ بولا۔

"کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ جس کمرے میں یہ خفیہ فوجی میٹنگ ہونے والی ہے تم اس کمرے کا جائزہ لے کر مجھے بتا سکو کہ اس کمرے کی کھڑکیاں کتنی ہیں۔ اس میں دروازے کتنے ہیں؟"

میں نے کہا۔

"جہاں تک مجھے معلوم ہو سکا ہے یہ میٹنگ شہر کے سب سے ماڈرن ہوٹل میں ہو رہی ہے۔ اسی ہوٹل کے ایک کمرے میں پہلے اسرائیلی اور بھارتی جرنیلوں کی میٹنگ ہو گی۔ اس کے بعد بڑے ہال میں ڈنر دیا جائے گا۔"

گھنشام نے کہا۔

"یہ بہت ضروری ہے کہ جس کمرے میں ان جرنیلوں کی میٹنگ ہونے والی ہے تم مجھے ایک دن کے اندر اندر اس کمرے کی ساری کھڑکیوں دروازوں کے بارے میں پوری رپورٹ دو۔"

میں نے پوچھا۔

"کھڑکیوں اور دروازوں کے بارے میں تم کیوں زیادہ پوچھ رہے ہو؟ ہمیں تو بم لگانا ہے۔ کہیں بھی لگا سکتے ہیں کمرے میں۔"

گھنشام کہنے لگا۔

"اگر تم چاہتے ہو کہ چھ کے چھ دشمن جرنیلوں میں سے ایک بھی زندہ نہ بچے تو مجھے کل شام تک اس کمرے کی پوری تفصیل سے آگاہ کرو جہاں یہ لوگ بیٹھ کر پاکستان کے خلاف فوجی منصوبہ بندی کرنے والے ہیں۔ اب تم جاؤ۔ میں تمہارے بعد نیچے اترو گا۔"

میں اٹھ کر نیچے اتر آیا۔ سارا راستہ سوچتا رہا کہ یہ کیسے پتہ چلایا جائے کہ جرنیلوں ک میٹنگ کس ہوٹل کے کس کمرے میں ہو گی۔ ابھی تک مجھے یہ بھی علم نہیں ہو سکا تھا ک یہ میٹنگ کس ہوٹل میں ہو رہی ہے۔ اس کے اس کمرے کا سراغ لگانا تھا جہاں ا جرنیلوں کی میٹنگ ہو گی۔ ظاہر ہے وہاں سیکورٹی کے انتہائی سخت انتظامات ہوں گے اور بات بے حد خفیہ رکھی جائے گی کہ میٹنگ ہوٹل کے کس کمرے میں ہونے والی ہے۔

لیکن مجھے ہر حالت میں دونوں کا سراغ لگانا تھا۔

اور میرے پاس اس کا صرف ایک ہی ذریعہ تھا اور یہ میجر شرت دیوان تھا۔ میجر شرت دیوان ملٹری انٹیلی جینس کی سپیشل ڈیفنس برانچ کا رجمنٹل ہیڈ کوارٹر کا سینئر آفیسر تھا۔ اسے ضرور معلوم ہو گا کہ اسرائیلی اور بھارتی جرنیلوں کی مجوزہ میٹنگ کس ہوٹل میں او ہوٹل کے کس کمرے میں ہونے والی ہے۔ کیونکہ اس کی سیکورٹی کے انتظامات کی ذ داری اسی پر ہو گی۔

میں دوپہر تک فوجی کینٹین میں اپنی ڈیوٹی بھی دیتا رہا اور ذہن میں منصوبہ بندی بھ کرتا رہا۔ دوپہر کو کھانے کے ٹائم پر میں میجر شرت کے پاس آ گیا۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ اپنے کمرے میں آ کر کرتا ہے۔ جب میں اس کے کمرے میں پہنچا تو وہ تھوڑی دیر پہلے تھا اور وردی میں ہی تھا۔ صوفے پر بیٹھا اخبار پڑھ رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر اس نے اخبار ا طرف ڈال دیا اور مسکراتے ہوئے بولا۔

"دھرم ویر! تم نے بڑا اچھا کیا جو آ گئے آج میں نے خاص ویشنو کھانا بنوایا ہے تم اسے پسند کرو گے۔"

میں نے اس کے سامنے والے صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"بھیا جی! آج میرا بھی کینٹین پر کچھ کھانے کو جی نہیں چاہ رہا تھا۔ سوچا آج بھیا کے پاس جا کر کھانا کھاؤں گا۔"

"ونڈر فل!"

اس نے اردلی کو آواز دی کہ دو آدمیوں کا کھانا لگا دے۔ اس نے اخبار میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"تم اخبار پڑھو۔ اتنی دیر میں ذرا ایک فائل دیکھ لوں۔"

میں اخبار کھول کر پڑھنے لگا۔ میں اخبار کے کنارے سے میجر شرت دیوان کو دیکھ رہا ا۔ اس نے اپنے بریف کیس میں سے ایک سیاہ رنگ کی فائل نکالی اور اسے کھول کر ئل کے اندر لگے ہوئے کاغذوں کو الٹ پلٹ کرتے ہوئے ایک کاغذ پر نظریں جما دیں۔ اخبار انگریزی کا تھا۔ میجر شرت بڑے انہماک سے فائل پڑھ رہا تھا۔ پھر اس نے اپنی ردی کی اوپر والی جیب سے پنسل نکال کر کاغذ پر کچھ لکھا اور ورق الٹ دیا۔ میں نے اخبار نیچے کرتے ہوئے پوچھا۔

"بھیا! لگتا ہے دفتر میں آج کل کام زیادہ ہے جو آپ فائل ساتھ لے آئے ہیں"

میجر شرت مسکرانے لگا۔ بولا۔

"کیا بتاؤں بھیا دھرم ویر! فوج کے انٹیلی جینس کے محکمے میں گدھے کی طرح کام کرنا پڑتا ہے۔ دوسرے ملک سے فوج کا کوئی معمولی سا افسر بھی آ جائے تو ہمیں مصیبت پڑ جاتی ہے۔"

میں نے جان بوجھ کر جمائی لیتے ہوئے بظاہر بڑی بے نیازی سے پوچھا۔

"کیا باہر سے کوئی فوجی افسر آ رہا ہے؟"

وہ فائل پر نظریں جمائے ہوئے بولا۔

"ارے دھرم ویر کوئی معمولی افسر ہوتا تو میں یہ کام اپنے اسسٹنٹ کے سپرد کر دیتا پورے تین جرنیل آ رہے ہیں باہر سے۔ بھگوان کرے سارا کام خیر خیریت سے ہو جائے"

میں نے یونہی بے تعلقی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

"بھیا! تم بہت کام کرتے ہو۔ بھارت کو تم ایسے سپوتوں پر واقعی ناز ہے۔ لیکن ان جرنیلوں کو نئی دلی راجدھانی میں جانا چاہیے تھا۔ راجدھانی کی مصیبت ہم پر کیوں ڈالی جا رہی ہے بھیا؟"

میجر شرت نے ہنستے ہوئے کہا۔

"تم سویلین ہو۔ تم ان باتوں کو نہیں سمجھ سکو گے۔"

میں نے میجر شرت سے ہمدردی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

"بھیا! ان لوگوں کی سیکورٹی دیکھ بھال کر کرنا۔ مجھے تو ہر وقت تمہاری فکر رہتی ہے۔ تم میرے بڑے بھائی ہی ہو۔"

میجر شرت نے آنکھیں اٹھا کر مجھے دیکھا اور بڑی محبت سے کہا۔

"دھرم ویر! تو کیا میں تمہیں اپنا چھوٹا بھائی نہیں سمجھتا۔ تم فکر مت کرو۔ جس ہوٹل میں ان جرنیلوں کو ڈنر دیا جائے گا وہاں سیکورٹی کے ایسے سخت انتظامات ہوں گے کہ کوئی پرندہ بھی اپنا شناختی کارڈ دکھائے بغیر ہوٹل کے اوپر سے نہیں گزر سکے گا۔"

میں نے خوش ہو کر کہا۔

"ایسا ہی ہونا چاہیے۔ آخر باہر سے آئے ہوئے فوجی ہمارے مہمان ہیں۔ اور بھارت ورش تو اپنے مہمانوں کا بڑا خیال رکھتا ہے۔ مگر بھیا اس شہر ناگ پور میں تو چھوٹے چھوٹے ہوٹل ہیں۔ ان جرنیلوں کو ڈنر اپنے آفیسرز میس میں ہی دینا چاہیے تھا۔"

میجر شرت دیوان نے فائل بند کر کے بریف کیس میں رکھتے ہوئے کہا۔

"ارے بھیا! ہم یہ ڈنر ناگ پور شہر کے سب سے اعلیٰ اور ماڈرن ہوٹل اشوکا میں دے رہے ہیں۔"

میں نے فوراً کہا۔

"گڈ! واقعی یہ ہوٹل بہت شاندار ہے میں بھول ہی گیا تھا۔ میں اس کے قریب سے دو تین بار گاڑی میں گزرا ہوں۔"

اتنے میں اردلی نے آ کر کہا۔

"کھانا لگا دیا ہے صاحب!"

ہم کھانے کی میز پر جا کر بیٹھ گئے۔ میں نے بڑے طریقے سے اشوکا ہوٹل کے موضوع کو جاری رکھا اور میجر شرت سے کہا۔

"بھیا! ہوٹل کے سٹاف کی کڑی جانچ پڑتال کرنا۔ ان میں دشمن کا کوئی جاسوس بھی ہو سکتا ہے۔"

میجر شرت نے اپنی پلیٹ میں دہی ڈالتے ہوئے کہا۔

"بھیا دھرم ویر! مجھے ان باتوں کا بڑا تجربہ ہے۔ ہم نے اپنے آدمیوں کا انتظام کیا ہے۔ اس روز ہوٹل کے ملازموں کی جگہ انٹیلی جنس کے فوجی بیروں اور دوسرے سروس کرنے والوں کے لباس میں ہوں گے۔"

میں نے میجر شرت کو ہوا دیتے ہوئے کہا۔

"بھیا! یہ تو آپ نے بالکل ٹھیک کیا۔ سچ کہتا ہوں مجھے اپنے بھیا پر بڑا ناز ہے۔ میرا بھائی واقعی بھارت کا لائق فوجی افسر ہے۔"

پھر میں نے جس طرح چھوٹے بھائی بڑے بھائی کے آگے ضد کرتے ہیں اس طرح ضد کرتے ہوئے کہا۔

"بھیا! میں نے اندر سے اشوکا ہوٹل کبھی نہیں دیکھا۔ کیا اس روز مجھے بھی ساتھ نہیں لے چلو گے؟ میں اشوکا ہوٹل اندر سے دیکھنا چاہتا ہوں"

میجر شرت بولا۔

"نہیں دھرم ویر! اس روز میں تمہیں اپنے ساتھ نہیں لے جا سکتا۔ وہاں بڑی سخت سیکورٹی ہو گی۔ ہاں۔ کل صبح میں ہوٹل کے ان کمروں کا معائنہ کرنے جا رہا ہوں جہاں ہمارے مہمان جرنیل ڈنر کھائیں گے اور بیٹھ کر باتیں کریں گے۔ کل تم میرے ساتھ چلے

چلنا"

قدرت نے میری مدد کر دی تھی۔ میں یہی چاہتا تھا۔ یہ بہت مشکل مرحلہ تھا۔ بہ
مشکل مسئلہ تھا جسے میجر شرت دیوان نے خود ہی حل کر دیا تھا۔ میں نے اب فوراً موضو
بدل دیا اور میجر شرت کی والدہ کی علالت کے بارے میں باتیں کرنے لگا۔

"ماتا جی کو دیکھنے کو بڑا من چاہتا ہے بھیا! سوچتا ہوں اگلے ہفتے ماتا کی خبر لی
چھنڈواڑی جاؤں"

میجر شرت نے کہا۔

"ضرور چلنا۔ میں بھی تمہارے ساتھ ہی چلوں گا۔ ماتا جی اب بہت بوڑھی ہو
ہیں۔ لیکن شکنتلا ان کا بڑا خیال رکھتی ہے۔"

میں نے کہا۔

"شکنتلا ایسی بیٹی کسی کسی کو نصیب ہوتی ہے بھیا۔ بھگوان اس کی رکھشا کرے۔

اپنے کمرے میں آ کر میں بے چینی سے دوسرے دن کا انتظار کرنے لگا۔ میجر شر
نے کہا تھا کہ صبح ٹھیک آٹھ بجے وہ مجھے فوجی کینٹین سے لے لے گا۔

دوسرے روز میں جلدی فوجی کینٹین پر آ گیا۔ ٹھیک آٹھ بجے میجر شرت کی فو
گاڑی آ گئی۔ میں اس میں بیٹھ گیا اور گاڑی شہر کے بڑے ہوٹل اشوکا کی جانب روانہ
گئی۔ اشوکا ہوٹل ناگ پور میں نیا نیا تعمیر ہوا تھا۔ یہ تین منزلہ بڑی جدید قسم کی خوبصور
عمارت تھی۔ سامنے ایک خوبصورت کشادہ سرسبز لان تھا۔ ہماری گاڑی پارکنگ میں کھڑ
ہو گئی۔ میجر شرت دیوان اپنی فوجی وردی میں تھا۔ اس کے ساتھ چھوٹے رینک کے
فوجی افسر بھی اپنی وردیوں میں تھے۔ ہوٹل کی لابی میں اشوکا ہوٹل کا مینجر ہمارا انتظار کر
تھا۔ وہ ہمیں لے کر ڈنر ہال میں آ گیا۔ میجر شرت اور دوسرے فوجی افسروں نے پور
ہال کا معائنہ کیا۔ پردوں کو ہٹا کر دیکھا۔ کھانے کی لمبی میز کا جائزہ لیا۔ پھر ہوٹل کے مینج
کچھ ضروری ہدایات دیں اور وہاں سے ہم ہوٹل کی دوسری منزل میں بذریعہ لفٹ آ
جہاں ڈنر سے پہلے اسرائیلی اور بھارتی جرنیلوں کی خاص میٹنگ ہونی تھی۔ میجر شرت ا

اس کے ساتھی فوجی افسر اس کمرے کا بھی معائنہ کرنے میں لگ گئے۔ لیکن سب سے
زیادہ میں کمرے کا جائزہ لے رہا تھا۔ میں نے کھڑکیوں کو دیکھا۔ کمرے کی کل تین کھڑکیاں
تھیں جو نیچے لان کی جانب کھلتی تھیں۔ کمرے کے دو دروازے تھے۔ ایک دروازے سے
ہم داخل ہوئے تھے۔ دوسرا دروازہ بند تھا جو کسی دوسرے کمرے کی طرف کھلتا تھا۔ میجر
شرت نے ہوٹل مینجر سے کہا۔

"یہ تینوں کھڑکیاں بند رہیں گی اور یہ دوسرا دروازہ بھی بند رہے گا۔ مین دروازے
پر ہمارے آدمی تعینات ہوں گے۔"

ہوٹل کے مینجر نے بڑے ادب سے انگریزی میں کہا۔

"ایسا ہی ہو گا سر! ہم ان کھڑکیوں کو اور اس دروازے کو لاک کر دیتے ہیں۔"

میجر شرت نے انگریزی میں کہا۔

"ابھی لاک کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ابھی فنکشن میں دو دن باقی ہیں۔ فنکشن
والے دن ہمارے آدمی خود آ کر سارا بندوبست کریں گے۔"

اس کے بعد ہم نیچے آ گئے۔ میں میجر شرت کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ اس نے
بڑے فخر سے پوچھا۔

"کیوں دھرم ویر؟ کیا خیال ہے؟"

میں نے کہا۔

"بھیا! میں بہت مطمئن ہوا ہوں۔ ہماری انٹیلی جنس دنیا کی سب سے بہترین ملٹری
انٹیلی جنس ہے۔"

میجر شرت دیوان خوش ہو کر مسکرانے لگا۔ اس کے پیچھے پیچھے جو دو فوجی افسر چل
رہے تھے وہ بھی میری یہ بات سن کر مسکرائے۔ یہاں سے ہم واپس رجمنٹل ہیڈ کوارٹر میں
آ گئے۔ میجر شرت نے مجھے فوجی کینٹین کے باہر اتار دیا۔

کوئی ایک گھنٹہ میں نے بڑی مشکل سے گزارا۔ اس کے بعد اپنے اسسٹنٹ جگدیش
سے کہا۔

"جگدیش بھیا! کل سے میرے پیٹ میں گڑبڑ ہو رہی ہے۔ میں وید جی سے دوائی لینے شہر جا رہا ہوں تم پیچھے خیال رکھنا"

جگدیش بولا۔

"بھیا تم اپنے میڈیکل سٹور سے دوائی کیوں نہیں لے لیتے۔ مفت مل جائے گی۔"

میں نے کہا۔

"نہیں بھیا! مجھے وید جی کی آئیور ویدک دوائی سے ہی آرام آتا ہے۔ ابھی آجاؤں گا۔"

فوجی رجمنٹل ہیڈ کوارٹر سے نکل کر میں سیدھا دوسرے بازار والے شاپنگ سنٹر میں گیا۔ وہاں سے میں نے خفیہ کوڈ میں گھنشام کو فون کر کے بتایا کہ میں نے ضروری معلومات حاصل کر لی ہیں۔ میں آ رہا ہوں۔ اس نے کہا۔

"آجاؤ۔ اسی طرح سیدھا اوپر چلے جانا"

تھوڑی دیر بعد میرا رکشا اپنے خاص مجاہد جاسوس گھنشام کی دکان کے باہر پہنچ گیا۔ میں دکان کے اندر داخل ہو کر زینہ چڑھ کر اوپر والے کمرے میں چلا گیا۔ اس وقت گھنشام ایک خاتون گاہک سے باتیں کر رہا تھا۔ اس نے مجھے دیکھ لیا تھا۔ چند سیکنڈ بعد وہ بھی اوپر آگیا۔ میں نے اسے اس کمرے کی کھڑکیوں اور دروازوں کے بارے میں سب کچھ بتا دیا۔ وہ کہنے لگا۔

"کھڑکیوں اور دروازوں کا رنگ کیسا تھا؟"

میں نے یاد کیا اور کہا۔

"کھڑکیوں اور دروازوں کا رنگ نسواری تھا۔"

وہ بولا

"ٹھیک ہے۔ یہ میٹنگ کس روز ہو رہی ہے؟"

میں نے اسے بتایا کہ میٹنگ ہفتے کی رات کو ہوگی۔ وہ بولا۔

"ٹھیک ہے۔ ابھی دو دن باقی ہیں۔ لیکن ایک کام تمہیں ایک روز پہلے جا کر وہاں

کرنا ہو گا۔"

میں نے پوچھا۔

"مجھے بتاؤ۔ میں وہ کام ایک روز پہلے جا کر کروں گا۔"

گھنشام چند لمحے توقف کرنے کے بعد بولا۔

"وقت تھوڑا ہے۔ تمہارا کام مشکل ہو گا۔ مجھے بھی کچھ ضروری چیزیں تیار کرنی ہیں مگر میں آج رات انہیں تیار کر لوں گا۔ تم ایسا کرو۔ آج رات کے پچھلے پہر بلکہ صبح صبح میری دکان پر آجاؤ میں جاگ رہا ہوں گا اور دکان کا دروازہ اندر سے کھلا ہو گا۔ باقی باتیں میں اسی وقت کروں گا۔ اب تم جانا چاہو تو جا سکتے ہو۔"

میں اس آگیا۔ رات کو بستر پر لیٹنے سے پہلے پچھلے پہر کا الارم لگا دیا۔ گھڑی نے منہ اندھیرے ٹھیک چار بجے مجھے جگا دیا۔ میں نے بنیان قمیض پتلون اور ربڑ کے فلیٹ شوز پہنے اور آہستہ آہستہ جوگنگ کرتا سیر کرنے کے بہانے فوجی ہیڈ کوارٹر کے گیٹ سے نکل گیا۔ گیٹ پر پہرے دینے والے سارے گارڈ مجھ کو پہچانتے تھے۔ اب کوئی مجھے آنے جانے سے نہیں روکتا تھا۔ میں سڑک پر کچھ دور تک جوگنگ کرتا گیا۔ جب دوسری سڑک پر گھومتے ہی میں نے دوڑنا بند کر کے تیز تیز چلنا شروع کر دیا۔ ایک جگہ سے مجھے خالی ٹیکسی مل گئی۔ ابھی اندھیرا ہی تھا۔ سڑکوں کی بتیاں روشن تھیں۔ ٹیکسی لے کر میں گھنشام کی دکان والے بازار کی نکڑ پر ہی اتر گیا۔

بازار بند تھا۔ ایک دو آدمی سیر کرتے ہوئے میرے قریب سے گزر گئے۔ میں نے گھنشام کی دکان کا دروازہ آہستہ سے اندر کو دھکیلا۔ وہ کھلا تھا۔ اندر جا کر میں نے دروازہ بند کر کے کنڈی لگا دی۔ اوپر سیڑھیوں پر سے گھنشام کی آواز آئی۔

"آجاؤ"

میں کمرے میں گیا تو بجلی کے بلب کی روشنی میں میز پر کچھ چیزیں پڑی دیکھیں۔ ان میں تین چوڑے سائز کی سکاچ ٹیپیں بھی تھیں۔ لکڑی کا ایک چوکور ڈبہ پڑا تھا۔ گھنشام چارپائی پر میز کے ساتھ لگ کر بیٹھ گیا۔ میں اس کے سامنے کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس نے

نسواری رنگ کی سکاچ ٹیپ اٹھاتے ہوئے کہا۔

"اسے تم عام سکاچ ٹیپ سمجھ رہے ہو گے"

میں نے کہا۔

"لگتی تو یہ عام سکاچ ٹیپ ہے"

گھنشام بولا۔

"شاید تمہیں یقین نہ آئے مگر یہ حقیقت ہے کہ اس پچیس گز لمبی سکاچ ٹیپ میں اتنی طاقت ہے کہ یہ تمہارے اشوکا ہوٹل کا پورا بلاک دھماکے سے اڑا سکتی ہے۔"

میں حیران سا ہو کر سکاچ ٹیپ کو دیکھنے لگا جو گھنشام نے اپنے ہاتھ میں تھامی ہوئی تھی۔ اس نے کہا۔

"یہ دھماکہ خیز سکاچ ٹیپ میں نے پہلے سے تیار کر کے رکھی ہوئی تھی۔ ہمارے مجاہدوں کو کسی بھی وقت اس کی ضرورت پڑ سکتی ہے۔ لیکن آج رات میں نے اسے ایک خاص کیمیکل میں ڈال کر اس کی طاقت کو تین گنا زیادہ کر دیا ہے۔ تمہارا کام صرف اتنا ہو گا کہ ہوٹل کے جس کمرے میں اسرائیلی اور بھارتی جرنیل میٹنگ کرنے بیٹھیں گے اس کمرے کی کھڑکیوں اور دروازوں کی چوکھٹوں پر اوپر سے لے کر نیچے تک یہ سکاچ ٹیپ چپکا دینا۔ جیسا کہ تم نے بتایا تھا اگر کھڑکیاں اور دروازوں کا رنگ نسواری ہے تو یہ سکاچ ٹیپ چوکھٹوں کے ساتھ چپکی ہوئی کسی کو نظر نہیں آئے گی اور اس میں ایسے کیمیکل ملا دیئے گئے ہیں ڈی ٹیکٹر اسے ڈی ٹیکٹ نہیں کر سکتا۔ بظاہر یہ بالکل عام سکاچ ٹیپ ہے لیکن جب اس کا دھماکہ ہو گا تو ہو سکتا ہے ہوٹل کے کمرے سمیت پورا بلاک اڑ جائے کمرے میں اتنی شدید آگ بھڑک اٹھے گی کہ اسے بجھانا مشکل ہو جائے گا۔ اس آگ میں کمرے میں بیٹھا ہوا ہر شخص آن کی آن میں جل کر کوئلہ بن جائے گا۔"

میں نے گھنشام سے سوال کیا۔

"لیکن یہ سکاچ ٹیپ بم پھٹے گا کیسے اور کس وقت؟ میرا مطلب ہے اس کو ڈیٹونیٹ کہاں ہو گا؟"

گھنشام نے لکڑی کا ڈبہ کھولا۔ اس میں سے پلاسٹک کا ایک لفافہ رکھا تھا۔ اس نے لفافہ کھول کر اس میں سے شیشے کی ایک نلکی نکالی جس کے گرد نسواری رنگ کی باریک تار لپٹی ہوئی تھی۔ اس نے تار تھوڑی سی کھول کر مجھے دکھائی۔ یہ تار ریشم کے ریشے سے بھی زیادہ باریک تھی۔ گھنشام نے کہا۔

"اسے کھینچ کر دیکھو"

میں نے اسے تھوڑا سا کھینچا۔ اس نے کہا۔

"اور زور سے کھینچو"

میں نے زیادہ زور سے کھینچا مگر تار بالکل نہ ٹوٹی۔ گھنشام بولا۔

"یہ تار فولاد سے بھی زیادہ مضبوط ہے۔"

میں نے پوچھا۔

"یہ تار مجھے کہاں لگانی ہو گی؟"

گھنشام نے کہا۔

"یہی وہ تار ہے جس کے ذریعے کمرے کے دروازے اور کھڑکیوں سے چپکی ہوئی طاقتور سکاچ ٹیپ دھماکے سے پھٹ کر وہاں قیامت مچائے گی۔ اس تار کو تمہیں کسی ایک کھڑکی کی چوکھٹ سے چسپاں کرنا ہو گا کہ نظر نہ آئے ویسے میں نے اسی لئے اس تار کا رنگ بھی ٹیپ اور کھڑکیوں کے رنگ کے ایسا نسواری رکھا ہے۔ کھڑکی کی سکاچ ٹیپ کے ساتھ اسے چپکا کر اس کا ایک سرا تم نیچے کسی ایسی جگہ لٹکا دو گے جہاں نیچے سے تمہارا ہاتھ تار تک پہنچ جائے۔ جس وقت کمرے میں دشمن کے جرنیلوں کی میٹنگ جاری ہو گی تو تم کسی بھی طریقے سے اس تار کو نیچے لٹکتے ہوئے سرے کو پکڑ کر زور سے کھینچو گے۔ بس تمہارا صرف اتنا ہی کام ہو گا۔ تار کے کھینچنے سے اوپر سکاچ ٹیپ پر لگے ہوئے دھماکہ خیز کیمیکلز کو ہلکا سا جھٹکا لگے گا اور ان کیمیکلز کے عمل ردعمل ایکشن ری ایکشن کا سلسلہ شروع ہو جائے گا۔ اس چین ری ایکشن کو ایک خاص پوائنٹ تک پہنچنے میں صرف پندرہ منٹ لگیں گے اور تمہارے تار کھینچنے کے صرف پندرہ منٹ بعد سکاچ ٹیپ مواد دھماکے

سے پھٹ جائے گا۔ اس کے دھماکے دوسری کھڑکیوں اور دروازوں پر لگی ہوئی سکاچ ٹیپ کا مواد بھی دھماکوں سے پھٹ جائے گا۔ یوں وہ کمرہ سارے کا سارا ہوا میں بکھر جائے گا اور وہاں سوائے آگ کے شعلوں کے اور کچھ نظر نہیں آئے گا۔ میرا خیال ہے تم اس کی تکنیک کو سمجھ گئے ہو گے۔"

تکنیک مشکل نہیں تھی مگر اس دھماکہ خیز سکاچ ٹیپ کا کمرے کی کھڑکیوں اور دروازوں کی چوکھٹوں کے ساتھ چسپاں کر کے اس کے ایک سرے کو کھڑکی کے باہر لٹکانا اور پھر میٹنگ شروع ہو جانے کے بعد وہاں آکر تار کو نیچے سے جھٹکے کے ساتھ کھینچنا' یہ سارا عمل میرے لئے ایک آزمائش طلب کام تھا۔ اس میں میرے ہوٹل کے اردگرد اور ہوٹل کے اندر دیکھے جانے کا سو فیصد امکان تھا اور دھماکے سے پہلے میرا وہاں دیکھا جانا میرے لئے خطرناک ثابت ہو سکتا تھا۔

میں نے سکاچ ٹیپ اور نسواری تار کی نلکی لے کر ایک کپڑے میں لپیٹی اور کپڑے کو اپنی بنیان کے اندر کمر کے ساتھ باندھ لیا اور گھنشام سے کہا۔

"میں اپنی جان پر کھیل کر بھی یہ کام کروں گا۔ اب میں جاتا ہوں اگر زندہ رہا تو واپس آکر تم سے ضرور ملوں گا۔ اگر پکڑا گیا تو پھر میرا کہا سنا معاف کر دینا۔"

یہ کہہ کر میں کمرے سے اترا اور دکان سے باہر آکر سڑک پر دونوں ہاتھ ورزش کرنے کے انداز میں ہلاتے ہوئے تیز تیز چل پڑا۔ جیسے میں صبح کی سیر کر رہا تھا۔ اس وقت صبح ہو گئی تھی اور چوک میں کچھ اور لوگ بھی سیر کرتے نظر آئے۔ میں نے چوک میں جا کر رکشا لیا اور فوجی ہیڈ کوارٹر سے ایک چوک پیچھے ہی اتر گیا۔ یہاں سے میں آہستہ آہستہ جوگنگ کرتا' بازو ورزش کرنے کے انداز میں ہلاتا فٹ پاتھ پر سے ہوتا ہوا فوجی ہیڈ کوارٹر کے گیٹ میں سے گزر گیا۔

اس وقت میرے ذہن میں خیال آیا کہ اگر گیٹ پر موجود ڈیوٹی گارڈ کو کسی طرح معلوم ہو جائے کہ میری کمر کے گرد اس قدر دھماکہ خیز مواد بندھا ہوا ہے کہ اگر وہ پھٹ جائے تو سارے فوجی ہیڈ کوارٹر کے پرخچے اڑا سکتا ہے تو وہ لوگ مجھے وہیں گولیوں سے

بھون ڈالیں میں چپکے سے اپنے کمرے میں آگیا۔ میں نے کمر کے گرد لپٹے ہوئے رومال کو کھولا اور دھماکہ خیز ٹیپ اور نسواری تار کی چھوٹی سی نلکی کو اسی رومال میں لپیٹ کر کمرے میں میز کے پیچھے چھپا کر رکھ دیا۔

اب میرے سامنے اس کمانڈو آپریشن کا سب سے اہم اور سب سے خطرناک مرحلہ تھا یعنی اس سکاچ ٹیپ بم کو ہوٹل کے اس کمرے میں جا کر کھڑکیوں دروازوں کی چوکھٹوں سے چپکانا جہاں ہفتے کی رات کو اسرائیلی اور بھارتی جرنیلوں کی میٹنگ ہونے والی تھی اور پھر کسی ایک کھڑکی کی چوکھٹ سے چپکائی ہوئی دھماکہ خیز ٹیپ کے ساتھ نسواری تار کو لگانا اور اس کے سرے کو کھڑکی سے باہر کسی ایسی جگہ پر لٹکا دینا جہاں نیچے سے میں میٹنگ شروع ہونے کے بعد تار کے سرے کو کھینچ سکوں۔ یہ ان حالات میں بظاہر ایک ناممکن کام ظر آتا تھا کہ جب میرے پاس کسی قسم کا بھیس بدلنے کا کوئی ذریعہ بھی نہیں تھا۔ اور میں بھی نہیں چاہتا تھا کہ ہوٹل کا کوئی ملازم مجھے وہاں وقوعہ سے پہلے چلتا پھرتا دیکھے۔

شام تک میرا ذہن اسی ادھیڑ بن میں لگا رہا کہ مجھے کیا طریقہ اختیار کرنا چاہئے؟ شام ہ گئی۔ میری سمجھ میں ابھی تک کچھ نہیں آیا تھا۔ کوئی راستہ دکھائی نہیں دیا تھا۔ دوسرے ن رات کو ہوٹل میں جرنیلوں کی میٹنگ ہونے والی تھی۔ مجھے جو کچھ کرنا تھا اسی رات کو رنا تھا۔ کیونکہ ایک بات طے تھی کہ میں یہ کام اپنے محدود بلکہ نہ ہونے کے برابر سائل کے باعث دن کی روشنی میں نہیں کر سکتا تھا۔ آخر میں اسی فیصلے پر پہنچا کہ مجھے ات کے اندھیرے میں چوروں کی طرح ہوٹل کے کمرے میں جا کر یہ ساری کارروائی رنی ہو گی۔ اس کے سوا دوسرا کوئی چارہ کار نظر نہیں آرہا تھا اور وقت گزرتا جا رہا تھا۔ یرے پاس صرف ایک رات باقی رہ گئی تھی اور یہ آخری رات ہی تھی۔

میں نے رات کا کھانا کمرے میں ہی کھایا۔ جگدیش کینٹین میں ہی تھا۔ میں اسے ضرور بتا دینا چاہتا تھا۔ چنانچہ میں نے اس سے کہا کہ میں فلم کا آخری شو دیکھنے جا رہا وں۔ اگر بھیا شرت جی میرا پوچھیں تو انہیں کہہ دینا کہ میں فلم دیکھنے گیا ہوا ہوں۔ وہ

"میں بھی چلتا ہوں۔ دونوں اکٹھے فلم دیکھیں گے۔ میرا کام بس ختم ہی ہونے والا ہے۔"

میں نے کہا۔

"نہیں یار۔ تم میرے ساتھ نہیں جاسکتے میری ایک گرل فرینڈ میرے ساتھ جا رہی ہے"

جگدیش قہقہہ لگا کر ہنسا۔

"پھر تو تمہیں اکیلے ہی جانا چاہیے۔"

جگدیش کو یہ سب کچھ بتانے کے بعد میں اپنے کمرے میں آگیا۔ آسمان پر کالی گھٹائیں چھائی ہوئی تھیں۔ تارے کہیں نظر نہیں آرہے تھے۔ ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی اور تھوڑی دیر پہلے ہلکی سی بارش ہو کر رکی تھی۔ میں نے گھڑی پر نگاہ ڈالی۔ رات کے نو بج رہے تھے۔ مجھے اسی لمحے ہیڈ کوارٹر کے احاطے سے نکل کر رات بارہ بجے تک واپس آجانا تھا تاکہ گیٹ پر موجود ڈیوٹی گارڈ کو یقین ہو جائے کہ میں واقعی فلم کا آخری شو دیکھنے ہی گیا تھا۔ میں نے صرف اتنا کیا کہ صندوق میں سے ایک پرانی سی نسواری رنگ کی قمیض اور ہلکے گرے رنگ کی ٹی شرٹ پہن لی تاکہ رات کو میں دور سے نمایاں طور پر نظر نہ آسکوں۔ پاؤں میں ربڑ کے فلیٹ شو تھے۔ اس کے علاوہ میرے پاس کچھ نہیں تھا۔ نہ کوئی پستول میں اپنے ساتھ لے جا سکتا تھا۔ نہ چاقو ساتھ لے جا سکتا تھا۔ کیونکہ مجھے کام پستول کی گولی فائر کئے اور چاقو سے کسی کی گردن کاٹے بغیر خاموشی اور پرامن طریقے سے کرنا تھا۔ سکاچ ٹیپ اور نسواری تار کی نلکی میں نے رومال میں لپیٹ کر اپنی کمر کے ساتھ باندھ لی تھی۔ پتلون کی پچھلی جیب میں کمرے کی چابی کا چھلا اور پچیس تیس روپے کی انڈین کرنسی تھی۔

میں نے اللہ کا نام لیا اور کمرے کو تالا لگا کر سر جھکائے بڑے مزے مزے سے کوارٹر کے گیٹ کی طرف چل پڑا۔ گیٹ پر ملٹری پولیس کے دو سپاہی پہرے پر کھڑے تھے۔ میں نے جان بوجھ کر انہیں نمسکار کیا اور کہا۔

"میں فلم کا سیکنڈ شو دیکھنے جا رہا ہوں۔ بارہ ایک بجے آؤں گا۔"

ان میں سے ایک فوجی نے کہا۔

"ٹھیک ہے صاحب"

وہ سب جانتے تھے کہ میں میجر شرت دیوان کا بھائی دھرم ویر ہوں۔ یہ فوجی ویسے بھی میرے پاس فوجی کینٹین میں راشن وغیرہ لینے آتے جاتے رہتے تھے۔

میں گیٹ کے باہر آکر فٹ پاتھ پر ہو گیا۔ مجھے اتنی جلدی نہیں تھی۔ اپنا کام یعنی کمانڈو ایکشن بلکہ کمانڈو آپریشن مجھے رات ذرا گہری ہو جانے کے بعد شروع کرنا تھا اور اس دوران اشوکا ہوٹل سے دور دور ہی رہنا تھا۔ ناگ پور کے بازاروں میں ابھی خوب رونق تھی۔ میں زیادہ ہجوم والی جگہوں پر جا کر خوامخواہ لوگوں کی نظروں میں نہیں آنا چاہتا تھا۔ چنانچہ میں ایک پارک میں آکر بیٹھ گیا۔ رات بڑی خوشگوار تھی۔ ہوا چل رہی تھی۔ بادل جھکے ہوئے تھے۔ پارک میں دور دور روشنیاں جگمگا رہی تھیں۔ بوندا باندی بھی نہیں ہو رہی تھی مگر لگتا تھا کہ کسی وقت بھی بارش شروع ہو جائے گی۔ میں چاہتا تھا کہ ایک دو گھنٹے بعد بارش شروع ہو جائے۔ بارش میں میں اپنا اشوکا ہوٹل والا کمانڈو آپریشن زیادہ محفوظ ہو کر کر سکتا تھا۔ کیونکہ بارش میں لوگ کمروں سے باہر نہیں نکلتے۔

کافی دیر تک میں پارک کے بنچ پر بیٹھا سگریٹ پھونکتا رہا۔ پھر اٹھا اور اشوکا ہوٹل کی طرف روانہ ہو گیا۔ مجھے معلوم تھا یہ ہوٹل کہاں پر واقع ہے۔ میں آرام آرام سے چل رہا تھا۔ مجھے کوئی اتنی جلدی نہیں تھی۔ ایک دو بارونق چوراہوں پر سے گزرنے کے بعد میں ایک نسبتاً خالی سڑک پر آگیا۔ اس سڑک کی ایک جانب جھیلوں والا باغ تھا۔ یہ جھیلیں قدرتی تھیں۔ اس کے اردگرد ناگ پور کی سٹی کارپوریشن نے ماڈرن قسم کا باغ بنا دیا تھا جہاں بچوں کا بڑا پارک بھی تھا۔ اس باغ کی دوسری جانب اشوکا ہوٹل کی بلڈنگ تھی۔ چلتے چلتے میں باغ کی دوسری جانب نکل آیا۔ میں نے ایک جگہ رک بائیں جانب دیکھا۔ درختوں کے پیچھے مجھے اشوکا ہوٹل کی تین منزلہ عمارت تھوڑی تھوڑی نظر آرہی تھی۔ اشوکا ہوٹل کے تین بلاک تھے جو ایک دوسرے سے الگ الگ بنے ہوئے تھے۔ چونکہ یہ

ماڈرن ہوٹل تھا اس لئے یہاں عام ہوٹلوں کی طرح زیادہ روشنیاں نہیں لگی تھیں۔ کمروں کے اندر پھر دھیمی روشنیاں ہوتی تھیں۔ بلاک کے آگے کھمبوں پر ڈیکوریشن لائیٹیں ضرور لگی ہوئی تھیں۔ مگر چونکہ برسات کے موسم میں روشنی کے بلب پر پروانے وغیرہ بہت زیادہ آتے ہیں اس لئے ہر بلاک کے آگے ایک کھمبا چھوڑ کر دوسرے کھمبے کی روشنی بجھا دی جاتی تھی۔ ایسا برسات کے موسم میں رات کو ناگ پور شہر کی بڑی سڑکوں پر ایک کھمبا چھوڑ کر مرکری لائیٹ بجھا دی جاتی تھی۔ بھارت کے وسطی علاقوں میں جنگلوں پہاڑوں اور ندی نالوں کا ایک طویل اور پیچ دار سلسلہ پھیلا ہوا تھا چنانچہ ایک تو یہاں بارشیں دیر تک ہوتی رہتی تھیں اور دوسرے یہاں برسات کے موسم میں مچھر پروانے اور دوسرے حشرات الارض بے شمار ہوتے تھے۔

میں اشوکا ہوٹل کے پیچھے جو سڑک جاتی تھی وہاں پر آکر ایک جگہ اندھیرے میں کھڑے ہو کر ہوٹل کے اس بلاک کا دور سے جائزہ لینے لگا جس کی دوسری منزل کے کمرے میں مجھے کمانڈو آپریشن کے لئے جانا تھا۔ یہ ہوٹل کا نمبر تین بلاک تھا۔ دوسری منزل کا کمرہ جو میرا ٹارگٹ تھا کونے والا کمرہ تھا۔ اسی طرف ایک چھوٹا سا باغیچہ تھا جس میں ایک فوارہ لگا تھا۔ فوارے کا پانی لڑیوں کی شکل میں اچھل کر نیچے گرتا مجھے دور سے چمکتا دکھائی دے رہا تھا۔ یہاں کونے میں ہوٹل کی دیوار کے ساتھ کوئی بلب روشن نہیں تھا۔ کیونکہ اس کی روشنی کمروں کی کھڑکیوں پر پڑ کر کمروں میں رہائش پذیر لوگوں کی نیند میں خلل ڈال سکتی تھی اس لئے ہوٹل کے کسی بلاک کی دیوار پر باہر کی جانب کوئی لائٹ نہیں لگائی گئی تھی۔ صرف سامنے کچھ فاصلے پر کھمبوں پر مرکری لائٹیں لگی تھیں جن کی روشنی بلاک کے کمروں تک آتی آتی مدھم پڑ جاتی تھی۔

جہاں میں چھپ کر کھڑا تھا وہاں سے مجھے اپنا ٹارگٹ صاف نظر نہیں آ رہا تھا مگر مجھے معلوم تھا کہ مجھے کس طرف سے ہوٹل کی گارڈینا کی باڑ پھلانگ کر ہوٹل کے احاطے میں داخل ہونا ہے۔ اتنی دیر میں ہلکی ہلکی بونداباندی شروع ہو گئی تھی۔ میں دل میں دعا کرنے لگا کہ یا اللہ بارش تیز ہو جائے گی۔ اس طرح جس کو باہر نکلنا بھی ہو گا وہ باہر نہیں نکلے

اور مجھے اپنے مشن کی تکمیل میں آسانی ہو جائے گی۔ جب میں نے محسوس کیا کہ اب ہوٹل کے مطلوبہ بلاک کی طرف گہری خاموشی چھا گئی ہے اور اب شاید ہی اس طرف کسی کا آنا ہو تو میں اندھیرے سے نکل کر اپنے ہدف کی طرف چل پڑا۔ ہوٹل کے احاطے کی دیوار زیادہ اونچی نہیں تھی۔ یہ ماڈرن قسم کی فیشن ایبل ڈیزائن کی دیوار تھی جس پر تھوڑے تھوڑے فاصلے پر ہندوؤں کے مندروں کی طرح چھوٹی چھوٹی برجیاں بنی ہوئی تھیں۔ ایک جگہ سے میں نے دیوار پھلانگی اور آگے گارڈینا کی جھاڑیوں والی دیوار کی اوٹ میں آکر جھک کر ہوٹل کے بلاک کی طرف دیکھنے لگا۔ آگے چھوٹا سا باغیچہ تھا جس کے وسط میں ایک فوارہ چل رہا تھا۔ فوارے کے گول چبوترے کے اردگرد تین چار روشنیاں لگی تھیں اس کے سوا وہاں اور کہیں بجلی کا بلب یا ٹیوب لائٹ نہیں جل رہی تھی۔ میں جھاڑیوں کی دیوار کے پیچھے جھک کر چلتا اندھیرے میں بلاک سے کوئی بیس فٹ کے فاصلے پر آکر وہیں بیٹھ گیا۔

میں نے گہری نظر سے ماحول کا جائزہ لیا۔ دوسرے یعنی درمیانے بلاک کی طرف لابی میں روشنی ہو رہی تھی اور سامنے ایک دو کاریں کھڑی تھیں۔ لابی میں ایک دو آدمی ادھر ادھر حرکت کرتے نظر آ رہے تھے۔ سامنے والا باغیچہ بھی خالی تھا اور جس جگہ میں چھپا ہوا تھا وہ باغیچہ بھی خالی پڑا تھا۔ میں نے اوپر نظریں اٹھا کر دیکھا۔ گرمیوں کا موسم ہونے کی وجہ سے تقریباً ہر سویٹ یا کمروں میں ائیر کنڈیشنر چل رہے تھے جس کی وجہ سے کمروں کی تمام کھڑکیاں بند تھیں کسی کسی کمرے میں روشنی ہو رہی تھی جس کی دھیمی چمک کھڑکی کے شیشوں اور پردوں کے پیچھے سے دکھائی دے رہی تھی۔ دوسری منزل والے جس کمرے میں مجھے جانا تھا اس کمرے کی بتی بجھی ہوئی تھی اور کھڑکی پر اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ یہ بات میرے حق میں بڑی اچھی تھی۔ میں نے آنکھیں سکیڑ کر اس کمرے کی دیوار کو بڑے غور سے دیکھنے کی کوشش کی۔ دیوار کے ساتھ دو کمروں کی کھڑکیوں کے درمیان مجھے اوپر تک دیوار پر ایک بیل چمٹی ہوئی نظر آئی۔ مجھے اس بیل کے پاس پہنچنا تھا۔ بونداباندی اب ہلکی بارش میں تبدیل ہو گئی تھی۔ میں نے اردگرد دیکھا۔ وہاں کوئی نہیں تھا اور دور

دور تک علاقہ خالی پڑا تھا۔ میں جھک کر جھاڑیوں کے ساتھ ساتھ چلتا بلاک کی طرف تیزی سے دوڑا اور اس کے ساتھ لگ کر کھڑا ہو گیا۔ اب میں نے آہستہ آہستہ آگے کی جانب کھسکنا شروع کر دیا۔ سات آٹھ قدم چلنے کے بعد میں اس جگہ پہنچ کر رک گیا جہاں ایک پھولدار بیل نیچے سے اوپر تک دیوار کے ساتھ چمٹی ہوئی چلی گئی تھی۔ یہ بیل اوپر میرے مطلوبہ کمرے کے قریب سے ہو کر اوپر والی تیسری منزل کی جانب چلی گئی تھی۔

میں نے بیل میں ہاتھ ڈال کر اس کی شاخوں کو ٹٹولا۔ اچانک میرا ہاتھ لوہے کے پائپ پر پڑا۔ یہ لوہے کا پائپ تھا جو اوپر چھت پر سے بارش کا پانی نیچے گٹر میں پہنچانے کے لئے لگایا گیا تھا۔ شاید یہ بیل اس پائپ کو چھپانے کے لئے ہی لگائی گئی تھی۔ مجھے اپنا راستہ صاف ہوتا نظر آیا۔ بیل کی شاخیں نازک تھیں مگر پائپ مضبوط تھا۔ بیل کی شاخیں مجھ پر صرف اتنی مہربانی کر سکتی تھیں کہ جب اوپر چڑھنے لگوں تو مجھے اپنے اندر چھپا لیں۔ ایک بار پھر میں نے دائیں بائیں تیز نگاہوں سے دیکھا۔ جب وہاں کوئی آدمی نظر نہ آیا تو میں بیل میں گھس گیا۔ پائپ کو دونوں ہاتھوں سے پکڑا اور آہستہ آہستہ اوپر چڑھنے لگا۔ بیل کی شاخوں پر بارش کے جو قطرے گر رہے تھے وہ سر پر اور کبھی کبھی آنکھوں پر بھی پڑ رہے تھے۔ میں سنبھل سنبھل کر پائپ کے گرد لگے گول کلمپوں کو اوپر سے پکڑتا اور نیچے ان پر پاؤں جماتا آہستہ آہستہ اوپر چڑھتا جا رہا تھا۔ مجھے صرف ایک ہی منزل اوپر جانا تھا۔ میں نے دوسری منزل والی مطلوبہ کھڑکی کے پاس پہنچ کر بائیں ہاتھ سے اسے اندر کو دھکیلا۔

کھڑکی اندر سے بند تھی۔

میں نے پریشان سا ہو کر دائیں جانب دیکھا۔ دائیں جانب کی کھڑکی ایک ہاتھ کے فاصلے پر تھی۔ اس کمرے کی صرف دو ہی کھڑکیاں تھیں اسے اندر کو دھکیلا تو وہ بھی اند سے بند کی گئی تھی۔ اچانک میری نگاہ کھڑکی سے ذرا آگے پڑی۔ یہاں روشنی بہت دھند دھندلی تھی۔ اور یہ روشنی نیچے کچھ فاصلے پر باغیچے کی باڑہ کے ساتھ کھمبے پر لگی ٹیوب ک روشنی کی تھی۔ میں نے بیل کی شاخوں کو ایک طرف تھوڑا سا ہٹا کر غور سے دیکھا۔ یہا دیوار پر ایک کھلی جگہ تھی۔ شاید یہاں آ کر کمروں کے ساتھ ساتھ جانے والی راہ داری

ریڈار ختم ہوتی تھی۔ میں نے بیل کے اندر سے ایک پاؤں نکال کر دیوار سے ذرا سی ر نکلی ہوئی گھر یعنی بنی پر رکھا۔ ہاتھ سے کھڑکی کی چوکھٹ کو پکڑا اور پھر دوسرا پاؤں ی دیوار کی گھر یعنی باہر نکلی ہوئی بنی پر رکھا اور کھڑکی کے ساتھ چمٹ گیا۔ یہاں میں چے سے دیکھا جا سکتا تھا۔ یہاں زیادہ دیر تک میں کھڑا بھی نہیں رہ سکتا تھا۔ میں دیوار کے تھ چمٹا راہ داری کے خلا کی طرف کھسکنے لگا۔ جہاں راہ داری کا چوکور شگاف تھا اس کے ب آتے ہی میں نے اچھل کر اس پر چھلانگ لگا دی۔ میرے ہاتھ راہ داری کی دیوار کی ڈیر پر جم گئے۔ دوسرے لمحے میں نے ٹانگیں دیوار کے اوپر ڈالیں اور میں راہ داری میں ترتے ہی وہیں بیٹھ گیا۔

یہ کام اتنا آسان نہیں تھا جتنی آسانی سے میں نے لکھا ہے۔ اس کے پیچھے میری ہائی سخت کمانڈو ٹریننگ بھی کام کر رہی تھی۔ راہ داری میں دور تک وال ٹو وال کارپٹ ھا تھا اور چھت میں تھوڑے تھوڑے فاصلہ چھوڑ کر دھیمے دھیمے بلب روشن تھے۔ یہ وریڈار میں دن کے وقت بھی دیکھ چکا تھا جب میں میجر شرت دیوان کے ساتھ اس کمرے ی سیکورٹی کا جائزہ لینے آیا تھا۔ میں اپنے مطلوبہ کمرے یعنی ٹارگٹ کے دروازے کے اس ہی بیٹھا تھا۔ یہاں ہوٹل کا کوئی بھی ملازم کسی بھی وقت آ سکتا تھا یا کسی کمرے کے اندر سے نمودار ہو سکتا تھا۔ چنانچہ میں نے اپنا کام شروع کر دیا۔ جیب سے لوہے کی تار کال کر کمرے کے دروازے پر لگے تالے کے سوراخ میں ڈالی اور اسے خاص طریقے سے ن چار مرتبہ دائیں بائیں گھمایا۔ یہ ایسا طریقہ تھا کہ اس پر عمل کرنے سے دروازے کے اندر لگا ہوا کوئی بھی تالا کھل جاتا تھا۔ چنانچہ تھوڑی سی کوشش کے بعد دروازے کا تالا کھل گیا۔ میں جلدی سے کمرے میں گھس گیا اور دروازہ بند کر دیا۔ دروازہ بند کرتے تالا اپنے آپ لگ گیا۔

کمرے میں پہلے تو اندھیرے کے سوا کچھ دکھائی نہ دیا۔ پھر کمرے کی بند کھڑکیوں کے گے پڑے سفید ریشمی پردوں میں سے باہر کی ہلکی ہلکی دھندلی روشنی اندر آنے لگی۔ میں نے کمرے کو غور سے دیکھا۔ یہ وہی کمرہ تھا جہاں مجھے میجر شرت دیوان دن کے وقت اپنے

ساتھ لایا تھا اور جہاں دوسرے دن رات کو اسرائیلی اور بھارتی جرنیلوں کی خفیہ میٹنگ ہونے والی تھی۔ میجر شرت نے مجھے بتایا تھا کہ یہ میٹنگ فوجی ہیڈ کوارٹر کے آفیسر میس میں اس لئے نہیں رکھی گئی کہ فوج کی ہائی کمانڈ اس میٹنگ میں طے ہونے والے امور کے بارے میں سوائے چند ایک ملٹری انٹیلی جینس کے افسروں کے سوا اور کسی فوجی افسر کو کچھ معلوم نہیں ہونے دینا چاہتی تھی۔ ان امور کو جو ظاہر ہے پاکستان کے خلاف کئے جانے والے جارحانہ حملے کے بارے میں ہی تھے انتہائی خفیہ رکھنا چاہتی تھی۔ اس لئے یہ فیصلہ کیا گیا کہ یہ اہم ترین سیکرٹ میٹنگ کسی ہوٹل کے کمرے میں ہو۔ کمرے میں لمبی میز پڑی تھی۔ اسی طرح میز کے گرد منقش چمکیلی کرسیاں لگی تھیں۔ جب مجھے اپنی پوری تسلی ہو گئی کہ یہ وہی کمرہ ہے جہاں اگلی رات کو فوجی افسروں کی خفیہ میٹنگ ہونے والا ہے تو میں نے اپنا کام شروع کر دیا۔

میں نے کمر کے گرد لپٹی ہوئی دھماکہ خیز ٹیپ نکالی۔ سب سے پہلی کھڑکی کا پردہ ایک طرف ہٹا دیا۔ میں نے دیکھا کہ ٹیپ کا نسواری رنگ کھڑکی کے گہرے براؤن رنگ جیسا ہی تھا۔ دونوں میں رنگ کا ذرا سا بھی فرق نہیں تھا۔ میں نے چوکھٹ کو ٹٹول کر بھی اور نظروں سے بھی غور سے دیکھا اور ٹیپ کھول کر ایک طرف اوپر سے لے کر کھڑکی کے نیچے والی چوکھٹ تک چپکا دی۔ ٹیپ ایسی تھی کہ چوکھٹ سے چپکنے کے بعد بالکل چوکھٹ کے ساتھ مل گئی۔ میں نے ہاتھ لگا کر دیکھا۔ کچھ محسوس نہیں ہوتا تھا کہ یہاں کوئی ٹیپ لگی ہوئی ہے۔ اسی طرح میں نے کھڑکی کی دونوں جانب دھماکہ خیز ٹیپ چپکا دی۔ پھر سفید ریشمی پردے کو کھول کر برابر کر دیا۔ اس کے بعد میں نے دوسری کھڑکی کی چوکھٹ کے ساتھ اسی طرح دھماکہ خیز سکاچ ٹیپ چپکا دی۔ اب میں عقبی دروازے کی طرف بڑھا دروازے پر چنٹ والا سفید ریشمی پردہ پڑا ہوا تھا۔ پردے کو ہٹانے کی بجائے میں پردے کے اندر چلا گیا اور سکاچ ٹیپ کو کھول کر تیزی سے اپنا کام شروع کر دیا۔ مجھے ڈر تھا کہیں ٹیپ ختم نہ ہو جائے مگر ابھی کافی ٹیپ پڑی تھی۔ میں نے دروازے کی چوکھٹ کے ساتھ اوپر سے لے کر نیچے تک دھماکہ خیز ٹیپ چپکا دی۔ اس کے بعد میں کمرے کے صدر

دروازے کی طرف آگیا۔ یہاں دروازے پر کوئی پردہ نہیں پڑا تھا۔ میں نے دروازے کی دونوں جانب چولوں کے ساتھ اوپر سے نیچے تک سکاچ ٹیپ بڑی مہارت سے چپکا دی۔ اس کام سے فارغ ہونے کے بعد میں نے نیم اندھیرے میں چہرہ قریب کر کے اور ٹیپ کو اوپر سے نیچے تک ہاتھ پھیر کر دیکھا۔ ٹیپ بالکل لکڑی کی چوکھٹ اور چولوں کے ساتھ ایک جان ہو گئی تھی اور رنگ بھی دروازے کے رنگ کے ساتھ مل گیا تھا۔

دھماکہ خیز ٹیپ صرف آدھی انچ کے قریب بچ گئی تھی۔ میں نے اسے بھی مین دروازے کی چوکھٹ کے ساتھ ہی اندر کی طرف چپکا دیا۔ کیونکہ ہمارے مجاہد اور خاص آدمی جس کا فرضی نام میں نے گھنشام آپ کو بتایا ہے مجھے سختی سے تاکید کی تھی کہ اس ٹیپ پر چاقو یا قینچی مت لگانا۔ اس کو ہاتھ سے کھینچ کر توڑنے کی بھی کوشش نہ کرنا۔ ایسا کرو گے تو تباہ کن دھماکہ بعد میں ہونا ہو گا وہ اسی وقت ہو جائے گا۔ اس کام سے فارغ ہونے کے بعد میں اس کھڑکی کی طرف آگیا جس کی چوکھٹ پر لگی ٹیپ کے ساتھ مجھے باریک تار چپکا کر تار کو کھڑکی کے باہر لے جانا تھا۔ یہ کھڑکی اندر سے چٹخنی چڑھا کر بند کی گئی تھی۔ میں نے آہستہ سے اس کی چٹخنی اتاری اور اس کا ایک پٹ ذرا سا اندر کی جانب کھول دیا۔ باہر سے ٹھنڈی ہوا کا جھونکا آیا۔ ساتھ ہی مجھے ہلکی بارش کی آواز بھی سنائی دی۔ میں نے کھڑکی کی چوکھٹ کے کونے میں وہ چپکی دھماکہ خیز نسواری ٹیپ کے اوپر باریک تار کو رکھا اور جیب سے دوسری عام سکاچ ٹیپ نکال کر اس کا چھوٹا سا ٹکڑا توڑا اور تار کے اوپر اچھی طرح سے چپکا دیا۔ یہ فالتو عام ٹیپ کا چھوٹا رنگ میں اپنے ساتھ لایا تھا اور اس ٹیپ کا رنگ بھی دھماکہ خیز ٹیپ جیسا یعنی نسواری تھا۔ میں نے باقی تار نلکی پر سے کھولی اور اسے بیل کے ساتھ ساتھ نیچے کی طرف پھینک دیا۔ یہ کام ختم ہو گیا تھا اور اب مجھے وہاں سے واپس دیوار والے پائپ کے ذریعے نہیں بلکہ ہوٹل کے اندر سے ہو کر جانا تھا۔ میں نے کھڑکی کا پٹ بند کر کے چٹخنی دوبارہ لگا دی۔ دونوں کھڑکیوں کے پردے ہٹا کر دھماکہ خیز سکاچ ٹیپ کا معائنہ کیا۔ عقبی دروازے کی ٹیپ کو بھی غور سے دیکھا۔ یہ ٹیپ چوکھٹوں کے ساتھ اس طرح چپک گئی تھی کہ روشنی میں بھی نظر نہیں آسکتی تھی۔ کمرے

کے بڑے دروازے کی طرف آکر میں نے لوہے کے تار سے دروازے کے تالے کو آہ
سے کھولا۔ پھر دروازے کا پٹ ذرا سا کھول کر باہر راہ داری میں جھانک کر دیکھا۔ را
داری دور تک خالی تھی۔ میں جلدی سے باہر آگیا اور دروازے کو اپنی طرف تھوڑا زور ا
کر کھینچا۔ دروازہ بند ہوا اور ساتھ ہی اس کا قفل بھی لگ گیا۔

میں نے راہ داری پر نگاہ ڈالی۔

راہ داری خالی تھی۔ لیکن ہوٹل کا کوئی بھی ملازم وہاں کسی طرف سے نمودار ہو سکتا تھا۔ کچھ فاصلے پر ایک کمرے کے باہر دیوار کے ساتھ ایک ٹرالی لگی ہوئی تھی۔ میں آہستہ آہستہ چلتا ٹرالی کے پاس آگیا۔ ٹرالی پر کچھ برتن پڑے تھے۔ شاید بیرا برتن وہاں رکھ کر کمرے میں دوسرے برتن لینے یا کسی دوسری طرف گیا ہوا تھا۔ میں ٹرالی کو پکڑ کر راہ داری میں چل پڑا۔ ٹرالی کو میں چلائے لئے جا رہا تھا۔ میں نے سر نیچے کو ڈال رکھا تھا کہ اگر سامنے سے کوئی آئے بھی تو ایک تو مجھے بیرا سمجھے اور دوسرے میری شکل کو نہ دیکھے۔ میں اپنا چہرہ ہوٹل والوں سے ہر حالت میں چھپانا چاہتا تھا۔ میں راہ داری کے دوسرے کنارے پر چلا گیا۔ وہاں ایک چھوٹا سا دروازہ تھا۔ یہ فائر سٹیر کیس تھا۔ یعنی آگ لگنے کی صورت میں ہنگامی طور پر نیچے اترنے کا راستہ تھا۔ میں نے ٹرالی وہیں چھوڑی اور دروازہ کھول کر سیڑھیاں اترنے لگا۔ یہ سیڑھیاں نیچے جس دروازے تک لی گئی تھیں وہ پیچھے اسی باغیچے میں جا کر کھلتا تھا جہاں سے میں گزر کر آگے گیا تھا۔ میں دروازہ کھول کر کھلی فضا میں نکل آیا۔ اب بارش باقاعدہ شروع ہو گئی تھی۔

مجھے ابھی ایک ضروری کام کرنا تھا۔ مجھے اس تار کو دیکھنا تھا جو میں نے اوپر والے کمرے سے نیچے لٹکائی تھی۔ میں دیوار کے ساتھ ساتھ دوسری منزل کے اس کمرے کے نیچے آکر دیوار کے ساتھ بیٹھ گیا جس کی کھڑکی میں سے میں نے باریک تار نیچے لٹکائی تھی۔ یہاں نیم اندھیرا تھا۔ تار مجھے نظر نہیں آرہی تھی۔ میں نے اٹھ کر دیوار والے پائپ کے

ساتھ چمٹی بیل میں ہاتھ ادھر ادھر مار کر دیکھا۔ تار میرے ہاتھ میں آگئی۔ میں نے بڑی احتیاط کے ساتھ آہستہ سے تار کو بیل کے اندر اس طرح چھپا دیا کہ وہ دن کی روشنی میں بھی نظر نہیں آسکتی تھی۔ میرا کمانڈو مشن آدھے سے زیادہ مکمل ہو گیا تھا۔ اب میں وہاں ایک سیکنڈ بھی نہیں ٹھہر سکتا تھا۔ چنانچہ میں دوڑ کر گارڈینیا کی جھاڑیوں کی دیوار کے پاس گیا اور جس طرح وہاں آیا تھا اسی طرح جھک کر دیوار کے ساتھ ساتھ چلتا ہوٹل کی عقبی دیوار کے پاس آیا اور وہاں سے دوسری طرف سڑک پھلانگ گیا۔

دوسری طرف اترتے ہی میں وہیں بیٹھا رہا۔ تیز نگاہوں سے چھوٹی سڑک کے دونوں طرف دیکھا۔ سڑک پر کھمبوں پر لگی ٹیوب لائٹس کی روشنی میں بارش گرتی نظر آرہی تھی۔ میں بارش میں بھیگ رہا تھا۔ میں جس رومال میں دھماکہ خیز سکاچ ٹیپ لپیٹ کر لایا تھا اسے کمر کے گرد سے کھول کر منہ صاف کیا۔ رومال کو پتلون کی جیب میں ڈالا اور سڑک پر ناریل کے درختوں کے نیچے نیچے واپس چل پڑا۔ مجھے یقین نہیں آرہا تھا کہ اپنے بہت ہی محدود وسائل کے باوجود میں سارا کام اتنی خوش اسلوبی اور تیزی سے بغیر کسی رکاوٹ کے سرانجام دے کر آگیا تھا۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا۔ اشوکا ہوٹل کی عقبی سڑک پر سے ہوتا ہوا میں بڑی سڑک پر آگیا۔ سڑک بارش میں بھیگ رہی تھی۔ کسی کسی وقت سڑک پر سے کوئی گاڑی سڑک پر ٹھہرا ہوا پانی ادھر ادھر چھینکتی گزر جاتی تھی۔ میرا خیال ہے کہ اس وقت گیارہ ساڑھے گیارہ بجے رات کا ٹائم ہو گا۔ گھڑی میرے پاس نہیں تھی۔ چوک میں ایک جگہ بس سٹاپ کا شیڈ بنا ہوا تھا۔ میں بارش سے بچنے کے لئے اس شیڈ میں آکر بنچ پر بیٹھ گیا۔ دور پیچھے اشوکا ہوٹل کی تھوڑی تھوڑی روشنیاں دکھائی دے رہی تھیں۔ اب مجھے کل رات اس وقت یہاں آنا تھا جب ہوٹل کے تیسرے بلاک کی دوسری منزل والے خاص کمرے میں اسرائیلی اور بھارتی جرنیلوں کی خفیہ میٹنگ ہو رہی ہو گی۔ اس وقت مجھے کسی طریقے سے چھپ کر میٹنگ والے کمرے کے نیچے پہنچ کر بیل کی شاخوں میں چھپائی گئی باریک تار کو جھٹکے سے کھینچنا تھا۔ اس کے بیس منٹ بعد قیامت خیز دھماکوں کے ساتھ دوسری منزل کے کمرے کو اڑ جانا تھا۔ مجھے پیچھے سے ایک موٹر رکشے کی آواز آئی۔ میں

بس شیڈ سے باہر نکل آیا۔ ایک رکشا چلا آرہا تھا۔ اس کی لائیٹ جل رہی تھی۔ معلوم نہیں وہ خالی تھا یا نہیں۔ میں نے ہاتھ دے دیا۔ رکشا میرے قریب آکر رک گیا۔ میں رکشے میں بیٹھ گیا اور اسے اس چوراہے میں چلنے کو کہا جو فوجی ہیڈ کوارٹر سے دو تین بلاک چھوڑ کر تھا۔ رکشا چل پڑا۔ تین چار لمبی سڑکوں پر سے ہوتا ہوا رکشا چوک میں پہنچا تو میں نے اسے پیسے دیئے اور اتر کر پیدل ہی فوجی ہیڈ کوارٹر کی طرف چلنے لگا۔ بارش اسی طرح ہو رہی تھی۔ یہ موسلا دھار بارش نہیں تھی مگر جھڑی لگی ہوئی تھی۔ میں بارش میں بھیگ رہا تھا۔ ہیڈ کوارٹر کے گیٹ پر پہنچا تو دیکھا کہ گیٹ پر جو لوہے کے لمبے پائپ لگا کر بنایا گیا تھا بند تھا۔ اس کی ایک جانب سیکورٹی گارڈ کا فوجی لمبی برساتی پہنے رائفل کندھے سے لگائے اٹن شن کھڑا تھا۔ گیٹ کے اوپر کافی روشنی والا بلب جل رہا تھا۔ میں گیٹ کے قریب گیا تو سیکورٹی گارڈ نے مجھے ہالٹ کہا۔ میں نے کہا۔

”بھیا! میں دھرم ویر ہوں۔ میجر شرت جی کا چھوٹا بھائی۔ فلم کا آخری شو دیکھنے گیا تھا۔ کوئی ٹیکسی رکشا ہی نہیں ملا۔“

سیکورٹی گارڈ نے مجھے پہچان لیا تھا۔ اس نے لوہے کا پائپ اوپر اٹھا دیا۔ میں اندر داخل ہوا تو اس نے پائپ دوبارہ نیچے کر دیا اور بارش میں اٹن شن کھڑا ہو گیا۔ میں جلدی جلدی اپنے کمرے کی طرف چلنے لگا۔ کمرے کے دروازے پر آکر چابی نکال کر دروازہ کھولا اور اندر داخل ہوتے ہی دروازہ بند کیا اور پلنگ پر اس طرح بیٹھ گیا جیسے میں انتہائی خطرناک علاقے سے جان بچا کر نکل آنے میں کامیاب ہو گیا ہوں۔

فوراً گیلے کپڑے اتار کر دوسرے کپڑے پہنے۔ کمرے میں حبس تھا۔ کھڑکی کھول دی۔ بتی میں جلتی چھوڑ گیا تھا۔ بتی بجھائی اور چھت کا پنکھا چلا کر پلنگ پر لیٹ کر آنکھیں بند کر لیں۔ بس اب میں سو جانا چاہتا تھا۔ کچھ سوچنا نہیں چاہتا تھا۔ میں نے اپنے ذہن کو بالکل بند کر دیا اور نیند کی طرف خیال لگا دیا۔ تھوڑی دیر بعد مجھے نیند آگئی اور میں سو گیا۔ صبح عین وقت پر میری آنکھ کھل گئی۔ ناشتہ میں نے کچن میں بنا کر کیا۔ اور فوجی کینٹین میں اپنا ڈیوٹی پر آگیا۔ جگدیش وہاں پہلے سے موجود تھا۔ میری طرف دیکھ کر شرارت سے

مسکرا رہا تھا۔ کہنے لگا۔

"دھرم ویر جی! رات کیسی گزری؟ فلم دیکھنے میں تو بڑا مزا آیا ہو گا۔ فلم کیا دیکھی
گی بس شریمتی جی سے پریم ہوتا رہا ہو گا"

میں نے بھی ہنس کر کہا۔

"نہیں یار۔ ابھی میری اس لڑکی سے اتنی بے تکلفی نہیں ہوئی۔ بس باتیں ہی کر
رہے ساری فلم میں ۔ باہر نکلے تو بارش ہو رہی تھی۔ پہلے لڑکی کو اس کے گھر چھوڑ
واپس آیا تو چوک میں رکشا خراب ہو گیا۔ بارش میں بھیگتا ہوا ہیڈ کوارٹر میں پہنچا۔"

میں جگدیش کو بھی یہ بتا دینا چاہتا تھا کہ میں رات بارش میں بھیگتا ہوا آیا تھا۔ ا
کے بعد ہم اپنے کام میں لگ گئے۔ اس روز سپلائی میں فرانس کی بڑی مشہور وائین کر
ڈی مون بھی آئی تھی۔ میں نے سبز رنگ کی اس مشہور فرنچ وائین کی بوتل اپنے حسا
میں خرید کر لفافے میں ڈال کر رکھ لی۔ جگدیش کہنے لگا۔

"یہ کس کے لئے لے جا رہے ہو۔ تم تو پیتے ہی نہیں۔"

میں نے کہا۔

"یار! اپنے بھیا شرت جی کے لئے لے جا رہا ہوں۔ انہیں یہ وائین بڑی پسند ہے۔"

دوپہر کو لنچ کے وقت میں وائین کی بوتل لے کر میجر شرت دیوان کے پاس چلا آ
فرنچ وائین ایک بہانہ تھا۔ اصل وجہ یہ تھی کہ میں اس کے پاس جانا چاہتا تھا کہ شاید وہ
سے اسرائیلی اور بھارتی جرنیلوں کی ملاقات کے بارے میں کچھ مزید معلومات مل جائیں
اس وقت میجر شرت دیوان کے پاس ایک کالے رنگ کا بھاری جسم والا فوجی بیٹھا تھا۔ ا
کے کندھے پر لگا نشان ظاہر کر رہا تھا کہ وہ کرنل رینک کا ہے۔ میں نے جاتے ہی دونوں
نمسکار کیا۔ میجر شرت نے کرنل سے میرا تعارف کرواتے ہوئے کہا۔

"کرنل صاحب! یہ میرا چھوٹا بھائی دھرم ویر ہے۔ اور دھرم ویر یہ ہمارے بڑے لا
اور سینئر انٹیلی جینس آفیسر کرنل گول والکر صاحب ہیں۔"

کرنل گول والکر نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ میری طرف دیکھ کر ذرا سا سر ہلا

میجر شرت نے میرے ہاتھ میں لفافہ دیکھ کر پوچھا۔

"یہ کیا لائے ہو دھرم ویر؟"

میں نے آنکھوں سے انہیں ایک طرف آجانے کا اشارہ کیا میں کرنل کے سامنے
اسے شراب کی بوتل نہیں دینا چاہتا تھا۔ میجر شرت نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔

"ارے کرنل صاحب ہمارے بڑے مہربان ہیں ہمارے آفیسر بھی ہیں اور دوست بھی
ہیں۔ دکھاؤ کیا لائے ہو"

میں نے لفافہ میجر شرت کو دیتے ہوئے کہا۔

"سر کنٹین میں آپ کی پسند کی چیز آئی تھی۔ سوچا آپ کے لئے لیتا چلو"

میجر شرت نے لفافے میں ہاتھ ڈالتے ہوئے کہا۔

"دھرم ویر! تم میرے چھوٹے بھائی ہو۔ مجھے سر نہ کہا کرو۔ بھیا کہا کرو۔ تم مجھے بھیا
کہتے ہو تو مجھے بڑا اچھا لگتا ہے۔"

اس نے لفافے میں سے بوتل نکال کر دیکھی اور خوش ہو کر کہا۔

"ونڈر فل! کریم ڈی مون تو مجھے بہت پسند ہے۔ اور کرنل صاحب کو بھی یقیناً پسند
ہو گی۔"

میجر شرت دیوان نے وائین کی بوتل لفافے میں دوبارہ ڈالی اور مرہٹہ کرنل گول
والکر کو پیش کرتے ہوئے کہا۔

"سر! یہ میں آپ کو پریزنٹ کرتا ہوں۔"

کرنل گول والکر خوش ہو کر بولا۔

"تھینک یو۔ میجر! تھینک یو۔"

اور میجر شرت نے وائین کی بوتل والا لفافہ کرنل کو پکڑا دیا۔ مرہٹہ کرنل نے لفافہ
اپنے سامنے میز پر رکھ لیا۔ میں کچن کی طرف چل دیا جہاں اردلی کھانا تیار کرنے میں لگا تھا۔
میں نے اردلی سے کہا۔

"اردلی! مجھے ایک کپ چائے بنا دو گے؟"

وہ بولا۔

"صاحب! پانچ منٹ کا ٹائم لگے گا"

میں نے کہا۔

"کوئی بات نہیں۔ میں خود ہی بنا لیتا ہوں"

میں نے دوسرے چولہے پر پانی گرم کرنے کے لئے رکھ دیا اور شیلف میں سے پ
نکال کر اسے صاف کرنے لگا۔ میں جان بوجھ کر کچن میں آ گیا تھا۔ میرے کان میجر شر
اور کرنل گول والکر کی باتوں کی طرف لگے تھے۔ ان کی باتیں کرنے کی ہلکی ہلکی آواز مجھ
پہنچ رہی تھی۔ مگر ان کی باتیں سمجھ میں نہیں آ رہی تھیں۔ میں نے کپ میں چائے
اور کپ لے کر باہر آ کر جہاں میجر شرت اور مرہٹہ کرنل بیٹھے باتیں کر رہے تھے ان
تھوڑی دور چھوٹے ٹیبل پر بیٹھ گیا۔ میجر شرت نے کہا۔

"دھرم ویر لنچ کے وقت چائے کیوں پینے لگے؟"

میں نے کہا۔

"بھیا جی! آج میں بھوجن دیر سے کروں گا دن کو ناشتہ دیر سے کیا تھا۔ بس یہ دو
اخبار رسالے پڑھ کر چلا جاؤں گا۔ جگدیش کو کاؤنٹر پر چھوڑ آیا ہوں۔"

میجر اور مرہٹہ کرنل اپنی باتیں کرنے لگے۔ وہ انگریزی میں باتیں کر رہے تھے۔
نے یہ ظاہر کیا جیسے میں بڑی دلچسپی سے اخبار رسالے دیکھ رہا ہوں اور مجھے ان کی گ
سے کوئی سروکار نہیں ہے۔ وہ لوگ بھی خاص طور پر میجر شرت مجھے بے ضرر سمجھتا
اسے مجھ پر ابھی تک ذرا سا بھی شک شبہ نہیں ہوا تھا۔ میری نظریں اخبار پر تھیں مگر
ان کی باتوں پر لگے ہوئے تھے۔ میں صرف یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ کہیں اسرائیلی
بھارتی فوجی جرنیلوں کی جو میٹنگ ہونے والی تھی کہیں وہ منسوخ تو نہیں ہو گئی۔ لیکن
کی باتوں سے ثابت ہو گیا کہ میٹنگ منسوخ نہیں ہوئی بلکہ اسرائیل کے تینوں جرنیل
ابیب سے دو دن پہلے بھارت کی راج دھانی دلی پہنچ گئے تھے اور کل دن کے گیارہ بجے
ناگ پور کے ہیڈ کوارٹر پہنچ رہے تھے۔ ناگ پور کے ملٹری انٹیلی جنیس ہیڈ کوارٹر کو

اہمیت دی جا رہی تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ بھارت کی فوجی کمانڈ کا ناگ پور کے اس سپیشل
ملٹری ڈیفنس انٹیلی جنیس کے ہیڈ کوارٹر سے براہ راست اور گہرا رشتہ ہے۔ اسی لئے
دونوں پاکستان دشمن ملکوں کی خفیہ میٹنگ کو ناگ پور میں منعقد کیا جا رہا تھا۔ مرہٹہ کرنل
نے سگار سلگاتے ہوئے میجر شرت سے کہا۔

"سیکورٹی انتظامات کو میں کل خود جا کر چیک کروں گا۔ میٹنگ کے وقت وہاں صرف
کیپٹن تک کے رینک کے دو عہدے دار ہوں گے تم بھی میرے ساتھ ہوٹل کی لابی میں
رہو گے۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ دشمن کے جاسوس بھی وہاں ضرور ہوں گے ہماری
لابی میں موجودگی سے انہیں یہی تاثر ملے گا کہ اوپر جو میٹنگ ہو رہی ہے وہ اتنی ٹاپ
سیکرٹ میٹنگ نہیں ہے۔ ہم انہیں یہی تاثر دینا چاہتے ہیں۔"

میجر نے کہا۔

"سر! ہم اس پر سختی سے عمل کریں گے۔ اوپر ہمارے دو کیپٹن کمرے کے باہر
کوریڈور میں ہوں گے ایک کیپٹن مونگا اور دوسرا کیپٹن امریک سنگھ۔ باقی میٹنگ کے
دوران اپنے جرنیلوں کی مدد کے لئے نئی دلی سے انٹیلی جنیس کی مرکزی ڈیفنس برانچ کے
تین میجر کمرے میں موجود ہوں گے۔"

"بالکل ٹھیک ہے۔"

یہ کہہ کر مرہٹہ کرنل گول والکر اٹھ کھڑا ہوا۔ کہنے لگا۔

"اب میں جاتا ہوں۔ کل دس بجے سیکورٹی کی چیکنگ کے لئے تم بھی اشوکا ہوٹل
پہنچ جانا۔"

"اوکے سر!"

میجر شرت دیوان مرہٹہ کرنل کو باہر تک چھوڑنے گیا۔ واپس آیا تو میرے کندھوں پر
بڑے پیار سے ہاتھ رکھ کر بولا۔

"دھرم ویر! تمہیں ماتا جی اور شکنتلا بڑی یاد کرتی ہیں۔ اگلے ہفتے میرے ساتھ
تمہیں چھنداواڑے چلنا ہو گا"

میں نے رسالہ بند کرتے ہوئے کہا۔

"بھیا مجھے بھی شکنتلا اور ماتا جی کی بڑی یاد آتی ہے۔ ضرور چلوں گا۔ اب ماتا جی کی طبیعت کیسی ہے؟"

میجر شرت دوسری میز کی طرف جاتے ہوئے بولا۔

"بس۔ بھگوان انہیں ٹھیک ٹھاک رکھے جوڑوں کا درد نہیں جاتا۔ دوائی باقاعدہ کھا رہی رہیں۔"

میں اٹھ کے اس کے پاس چلا آیا۔ میں نے کہا۔

"اگلے ہفتے مجھے ماتا جی کے درشن کو اپنے ساتھ ضرور لیتے جائیں۔"

میجر نے کہا۔

"ضرور ضرور۔"

مجھے معلوم تھا اگر کل اشوکا ہوٹل میں دھماکہ ہو گیا تو شاید انٹیلی جنس کا محکمہ اسے ہمیشہ کے لئے چھنداوڑے بھیج دے۔ کیونکہ اس خفیہ میٹنگ کی سیکورٹی کی ساری ذمے داری میجر شرت اور کرنل گول والکر کے ذمے تھی۔ میں تھوڑی دیر کے بعد واپس فوجی کینٹین پر آگیا۔ مجھے جس انفارمیشن کی ضرورت تھی وہ مجھے مل گئی تھی۔ صرف ایک دھڑکا لگا تھا کہ کل دس بجے ملٹری انٹیلی جنس کے دو ہائی ریکنگ آفیسر سیکورٹی چیک کرنے جا رہے ہیں کہیں کمرے میں کھڑکیوں اور دروازوں کے ساتھ چپکی ہوئی دھماکہ خیز ٹیپ کا راز فاش نہ ہو جائے۔ لیکن مجھے اپنے آدمی گھنشام نے یقین دلایا تھا کہ اس ٹیپ میں ایک ایسا کیمیکل ملایا گیا ہے جس سے دھماکہ خیز مواد کی نشانیاں دنیا کے کسی جدید ترین آلے سے بھی نہیں پکڑی جا سکتیں۔ پھر بھی میں دل میں دعائیں مانگنے لگا کہ ملٹری انٹیلی جنس کی سیکورٹی ٹیم کو دھماکہ خیز سکاچ ٹیپ کا علم نہ ہونے پائے۔ وہ دن گزر گیا۔ پھر وہ رات آگئی جس رات اشوکا ہوٹل میں پاکستان کے دو دشمن ملکوں یعنی اسرائیل اور بھارت کے تین تین ٹاپ کے فوجی جرنیلوں کی پاکستان پر حملہ کرنے کے بارے میں خفیہ میٹنگ ہونے والی تھی۔ مجھے اسی روز شام کو معلوم ہو گیا تھا کہ سیکورٹی ٹیم نے چیکنگ کرلی تھی اور وہاں

ئی قابل اعتراض بات انہیں نظر نہیں آئی تھی۔ یہ بات بھی میں نے حتمی طور پر معلوم ی تھی کہ رات کے آٹھ بجے اشوکا ہوٹل میں بھارت کے جرنیل اسرائیل کے نیلوں کا خیر مقدم کریں گے۔ اس کے بعد وہ خاص کافی روم میں بیٹھ کر کافی پئیں گے۔ ب نو بجے وہ ہوٹل کے خاص کمرے میں چلے جائیں گے جہاں دس بجے تک ان کی ٹنگ چلے گی اور ٹھیک گیارہ بجے نیچے ہال میں آکر وہ ڈنر کریں گے۔ جو میرے حساب ، وہ کبھی نہ کر سکیں گے اور وہ کافی روم میں جو کافی پئیں گے وہ ان چھ کے چھ جرنیلوں ان کے مددگار سٹاف کی زندگیوں کی آخری کافی ہو گی۔ اس حساب سے مجھے رات کے آٹھ بجے کے بعد اشوکا ہوٹل کے آس پاس منڈلاتے رہنا ہو گا تاکہ جس وقت مجھے دم ہو جائے کہ چھ کے چھ جرنیل خفیہ میٹنگ کے واسطے اس کمرے میں چلے گئے ہیں ان کے لئے مخصوص ہے اور جہاں میں نے دھماکہ خیز مواد لگایا ہوا ہے تو میں اس کے منٹ بعد جس طریقے سے بھی ہو اس کمرے کے نیچے جہاں دیوار کے ساتھ بیل چمٹی ہے جا کر اس بیل میں چھپائی گئی تار کو جھٹکا دے کر ہلا دوں۔

"جگدیش بھیا! اب میں جاتا ہوں۔ پہلے مجھے شہر اپنے وید جی کے پاس دوائی لینے جانا گا۔ اس کے بعد کمرے میں آکر لیٹ جاؤں گا۔ اگر میری ضرورت پڑے تو مجھے بلا ۔"

دراصل ایک روز پہلے نئی سپلائی کا مال آیا تھا اور ان کا اندراج کرتے ہوئے ہمیں دیر تک وہاں رکنا پڑتا تھا۔ جگدیش بولا۔

"بھایا جی آپ بے شک جائیں۔ تھوڑا سا کام باقی رہ گیا ہے۔ میں سنبھال لوں گا۔"

میں اس کو یہ بتانا چاہتا تھا کہ میں آٹھ بجے فوجی ہیڈ کوارٹر سے شہر وید جی سے دوائی گیا تھا اور تھوڑی دیر بعد ہی واپس آگیا تھا۔ میں نے ایک بار پھر کہا۔

"میں زیادہ سے زیادہ ساڑھے آٹھ بجے تک واپس اپنے کمرے میں آجاؤں گا میری رت پڑے تو مجھے بلا لینا"

وہاں سے میں اپنے کمرے میں آیا۔ منہ ہاتھ دھویا۔ چمڑے کی کولہا پوری چپل اتار کر

ربڑ کے فلیٹ شوز پہنے تاکہ اگر وہاں کسی قسم کے ہنگامی حالات پیدا ہو جائیں تو میں آ
سے بھاگ سکوں۔ اور کمرے کا دروازہ بند کر کے فوجی ہیڈ کوارٹر سے نکل گیا۔ مجھے
ٹیکسی لینے کی ضرورت نہیں تھی۔ موسم خراب نہیں تھا۔ بارش نہیں ہو رہی تھ
میرے پاس ایک گھنٹے کا وقت تھا۔ راستہ مجھے آتا تھا۔ چنانچہ میں پیدل ہی اشوکا ہوٹل
طرف چل پڑا۔ وہاں تک پہنچتے پہنچتے مجھے آدھا گھنٹہ لگ گیا۔ میں نے سڑک پر کچھ
کھڑے ہو کر ایک نگاہ اشوکا ہوٹل پر ڈالی۔ وہاں ایسی کوئی غیر معمولی بات مجھے نظر نہ آ
سوائے اس کے کہ باہر ایک جانب ملٹری پولیس کی تین گاڑیاں کھڑی تھیں میرے د
دیکھتے دو فوجی سٹیشن ویگنیں تیزی سے ہوٹل کے احاطے میں داخل ہو گئیں۔

میں اوپر سے ہو کر ہوٹل کے عقب میں آ گیا۔ یہاں ہوٹل کے ملازمین کے چھو
چھوٹے ڈھلواں چھتوں والے کوارٹر تھے جہاں کہیں کہیں بتیاں جل رہی تھیں۔ ہو
کے تیسرے بلاک کی طرف سے ایک وردی پوش بوڑھا بیرا مجھے کوارٹروں کی طرف
نظر آیا۔ میں اس کے پاس آیا۔ میں نے اس سے کہا۔

"میں کرنل گول والکر کے اردلی کا بھائی ہوں۔ کیا فوجی لوگ ہوٹل میں آ گئے؟
مجھے اپنے بھائی سے ملنا ہے۔"

اس دوران میں جان بوجھ کر ایسی جگہ کھڑا ہو گیا تھا جہاں اندھیرا تھا اور بوڑھا
میری شکل اچھی طرح نہیں دیکھ سکتا تھا۔ میں نے حفظ ماتقدم کے طور پر سر پر ایک ر
بھی باندھ لیا تھا۔ بوڑھے بیرے نے چلتے چلتے پیچھے اشارہ کر کے کہا۔

"ادھر جا کر معلوم کرو۔"

اور وہ رکے بغیر کوارٹروں کی طرف چل دیا۔

میں ہوٹل کے پہلے بلاک کے عقب کے قریب پہنچا تو مجھے وہاں دو فوجی کھڑے
آئے۔ ان کے پاس سٹین گنیں تھیں۔ میں وہیں سے واپس مڑ گیا۔ اب مجھے فکر پڑ گئی
کہیں اس جگہ بھی فوجی پہرہ نہ لگا ہوا ہو جہاں مجھے جا کر تار کو کھینچنا تھا۔ میں واپس
سڑک پر آ گیا۔ یہاں سے مجھے باغیچے کے پار دوسری منزل اور اس کے نیچے پہلی منزل

جگہ صاف نظر آ رہی تھی۔ دیوار کے ساتھ چمٹی بیل بھی دکھائی دے رہی تھی۔ مگر وہاں
کوئی فوجی نظر نہیں آ رہا تھا۔ کام خطرناک تھا۔ اپنے آپ کو موت کے منہ میں ڈال کر مجھے
کمانڈو ایکشن کرنا تھا۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ چاہے میں پکڑا جاؤں اور چاہے دھماکے کے
ساتھ میں بھی اڑ جاؤں لیکن میں بیل کے پیچھے چھپی ہوئی تار کو ایک بار ضرور کھینچ دوں
گا۔ آگے جو ہو سو ہو۔ میرے اندازے کے مطابق اس وقت تک رات کے نو بج گئے تھے
اور یہی ٹائم جرنیلوں کا میٹنگ روم میں داخل ہونے کا تھا۔ اتنے میں دو آدمی ہوٹل کے
گیٹ کی طرف سے آتے دکھائی دیئے۔ انہوں نے صرف دھوتی بنیانیں پہن رکھی تھیں
اور ہاتھوں میں بانس کے تھیلے اٹھائے ہوئے تھے۔ وہ آپس میں ہندوستانی میں باتیں بھی کر
رہے تھے۔ میں درخت کے پاس یوں کھڑا ہو گیا جیسے کسی کے آنے کا انتظار کر رہا ہوں۔
وہ میرے قریب سے گزرے تو ان میں سے ایک بولا۔

"فوجی لوگ ابھی میٹنگ کرنے گیا ہے۔ ایک گھنٹہ لگے گا ان کو۔ اس کے بعد گیارہ
بجے کہیں کھانا لگے گا۔ تب تک ہم اچار چٹنی لے آئے گا یار"

قدرت میری مدد کر رہی تھی۔ وہ لوگ شاید مجھے یہی خبر دینے کے لئے عین وقت پر
ادھر سے گزرے تھے کہ فوجی جرنیل میٹنگ روم میں پہنچ گئے ہیں اور میٹنگ شروع ہو
چکی ہے۔ اب مجھے دیر نہیں کرنی تھی۔ کوئی پتہ نہیں تھا کہ میٹنگ جلدی ختم ہو جائے۔
میں نے ایک نظر سامنے والے باغیچے پر ڈالی۔ وہاں اندھیرا بھی تھا اور فوارے کے پاس
روشنی بھی ہو رہی تھی۔ دوسری منزل کے جس کمرے میں میٹنگ ہو رہی تھی اس کے
نیچے کوئی آدمی نہیں تھا۔ میں نے آہستہ سے ہوٹل کی دیوار پھلانگی اور جھاڑیوں کی دیوار
کے ساتھ ساتھ چلتا ہوٹل کے اس آخری بلاک کی دیوار کے پاس آ کر اندھیرے میں بیٹھ
گیا۔

ایک بار پھر میں نے عقابی نظروں سے ماحول کا جائزہ لیا۔ مجھے کچھ فاصلے پر ایک نلکے
کے نیچے بالٹی پڑی ہوئی دکھائی دی۔ فوراً ایک خیال میرے ذہن میں آیا۔ میں جلدی سے
اٹھ کر نلکے کے پاس گیا۔ بالٹی پانی سے بھری ہوئی تھی اور اس میں ایک ڈونگا بھی تھا۔ میں

نے بالٹی اٹھائی اور اپنے آپ کو ہوٹل کا ملازم ظاہر کرتے ہوئے بالٹی لے کر بڑے سکون سے چلتا ہوا ٹارگٹ والے کمرے کے نیچے بیل کے پاس آکر بالٹی زمین پر رکھی اور ڈونگے میں سے پانی نکال نکال کر بیل کو دینے لگا۔ تیسری بار بیل کو پانی دیتے ہوئے میں نے ہاتھ آگے کر دیا۔ مجھے معلوم تھا کہ تار کہاں پر لٹک رہی ہے۔ تار میرے ہاتھ میں آگئی۔ میں نے بسم اللہ پڑھی اور تار کو جتنی زور سے ہمارے آدمی نے کہا تھا اتنے ہی زور سے نیچے کو کھینچ دیا۔ اس کے بعد بالٹی کا پانی بیل پر انڈیلا اور خالی بالٹی اور ڈونگا لے کر نلکے کی طرف چل پڑا۔ کہ اگر کوئی دور سے مجھے دیکھے تو یہی سمجھے کہ میں بیل کو پانی دینے گیا تھا۔

نلکے کے نیچے بالٹی رکھ کر میں جدھر سے آیا تھا اسی طرف چل پڑا۔ جھاڑیوں کی اوٹ میں اندھیرے میں آتے ہی میرے قدم تیز ہو گئے۔ تھوڑی دیر بعد میں ہوٹل کی دیوار پھاند کر عقبی سڑک پر پہنچ چکا تھا۔ میں دوسری طرف چلنے لگا۔ میں ایک چکر کاٹ کر ہوٹل کے سامنے والی سڑک کے عقب میں جو پارک تھا اس میں داخل ہو کر اپنے ٹھکانے یعنی فوجی ہیڈ کوارٹر کی طرف چل پڑا۔ میں جتنی جلدی ہو سکے اس علاقے سے نکل جانا چاہتا تھا۔ ایک جگہ خالی ٹیکسی نظر آئی۔ میں نے اسے روکا اور فوجی ہیڈ کوارٹر سے پہلے جو چوک تھا ڈرائیور کو وہاں چلنے کو کہا۔ ٹھیک پندرہ منٹ بعد دھماکہ ہونا تھا۔ اگر ہر شے اپنی جگہ پر ٹھیک لگائی گئی تھی تو دھماکہ پندرہ منٹ بعد ضرور ہو جانا تھا۔ چار منٹ مجھے دھماکے والی جگہ سے نکل کر ٹیکسی میں بیٹھنے تک لگے ہوں گے۔ ٹیکسی نے مجھے کوئی سات منٹ میں چوک میں پہنچا دیا۔ وہاں سے میں تین منٹ میں پیدل چل کر فوجی ہیڈ کوارٹر کے احاطے میں داخل ہو گیا تھا۔ اس حساب سے دھماکہ ہونے میں صرف ایک منٹ باقی رہ گیا تھا۔ میں اپنے کمرے میں جانے کی بجائے سیدھا فوجی کینٹین پر چلا گیا۔ میں جگدیش کو ایک طرح سے گواہ بنانا چاہتا تھا کہ جس وقت دھماکہ ہوا میں اس کے پاس موجود تھا۔ خوش قسمتی سے کینٹین میں جگدیش اس وقت موجود تھا اور رجسٹروں کو الماری میں بند کر کے تالا لگا رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر بولا۔

”تم نے ویدجی کے پاس اتنی دیر لگا دی؟“

میں نے کہا۔

”نہیں میں تو آدھے گھنٹے بعد ہی دوائی لے کر آگیا تھا۔ کمرے میں اکیلا لیٹے لیٹے تنگ آگیا۔ نیند نہیں آرہی تھی سوچا دیکھتا ہوں شاید تم کینٹین پر مل جاؤ۔ دو چار باتیں ہی کر لیں گے۔“

وہ بولا۔

”بس میں کینٹین بند کرنے ہی والا ہوں چلو میرے کمرے میں آجاؤ۔ کافی بنا کر پئیں گے۔“

میں نے کہا۔

”نہیں یار۔ کافی پی لی تو نیند بالکل ہی غائب ہو جائے گی۔ میرا خیال ہے میں کمرے میں جا کر۔۔۔“

ابھی یہ جملہ میرے منہ میں ہی تھا کہ اچانک زمین ہلی جیسے ہلکا سا بھونچال آگیا ہو۔ اس کے ساتھ ہی ایک بھیانک دھماکے کی گونج سنائی دی۔ آسمان پر پرندوں نے درختوں پر سے اڑ کر شور مچا دیا۔ جگدیش کا حیرت سے منہ کھلا تھا اور وہ میری طرف دیکھ رہا تھا۔

”یہ دھماکہ کیسا ہوا ہے دھرم ویر؟“

دھماکے کی آواز سے میرا دل خوشی سے باغ باغ ہو گیا تھا۔ لیکن میں نے بھی اپنے آپ کو انتہائی پریشان ظاہر کیا اور کہا۔

”بھگوان ہماری رکھشا کرے۔ میرا خیال ہے کسی فیکٹری کا بوائلر پھٹ گیا ہے۔“

اس کے ساتھ ہی ایک اور دھماکہ ہوا۔ یہ دھماکہ پہلے دھماکے سے زیادہ شدید تھا اور اس کی گونج پہلے سے زیادہ تھی اور زمین کو زلزلے کا جھٹکا لگا تھا۔ جگدیش نے جلدی سے کینٹین کا ٹیلی فون اٹھا کر گیٹ پر موجود سیکورٹی گارڈ سے دھماکوں کے بارے میں پوچھا۔ انہوں نے بتایا کہ دھماکے ہم نے بھی سنے ہیں مگر ابھی ان کے بارے میں کچھ نہیں معلوم۔ جگدیش نے فون بند کر کے کہا۔

”دھرم ویر! یہ دھماکے مجھے ایمونیشن پھٹنے کے دھماکے لگتے ہیں۔“

میرا کمانڈو مشن کامیاب رہا تھا۔ پہلا دھماکہ دونوں کھڑکیوں کے ساتھ چپکائی گئی دھماکہ خیز ٹیپ کے پھٹنے کا تھا۔ اس دھماکے کے رد عمل کے بعد سامنے والے دونوں دروازوں پر چپکائی گئی دھماکہ خیز ٹیپ کا بیک وقت دھماکہ ہوا تھا۔ گھنشام نے ٹھیک کہا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ ان دھماکوں کے ساتھ ہی کمرے میں آگ بھڑک اٹھی ہو گی کمرے کے پرخچے اڑ گئے ہوں گے اور اسرائیلی اور بھارتی جرنیل اپنے اپنے سٹاف کے ساتھ بھسم ہو چکے ہوں گے۔ اتنے میں ایک فوجی گاڑی بڑی تیزی سے دوڑتی ہوئی ہمارے سامنے سے گیٹ کی طرف نکل گئی۔ جگدیش بولا۔

"مجھے معاملہ خراب لگتا ہے"

میں نے انجان بنتے ہوئے کہا۔

"تمہارے خیال میں کیا ہو سکتا ہے؟"

جگدیش نے کہا۔

"کہیں اشوکا ہوٹل میں کشمیری کمانڈوز نے دھماکہ نہ کیا ہو۔ میں تو کینٹین بند کر کے اشوکا ہوٹل جاتا ہوں۔ تم بھی میرے ساتھ چلو"

میں اپنے آپ کو جائے واردات سے دور رکھنا چاہتا تھا۔ میں نے کہا۔

"نہیں جگدیش بھیا! مجھے تو ڈر لگتا ہے۔ تم جاؤ۔ میں اپنے کمرے میں بیٹھتا ہوں۔ مجھے آ کر ضرور بتانا کہ یہ دھماکے کہاں ہوئے تھے"

جگدیش کینٹین بند کر کے گیٹ کی طرف چل دیا۔ میں اپنے کمرے میں آ کر بتی بجھا کر بیٹھ گیا اور سوچنے لگا کہ اب مجھے کیا حکمت عملی اختیار کرنی چاہئے۔ اگر حالات خطرناک صورت اختیار نہیں کر جاتے تو میں زیادہ سے زیادہ میجر شرت دیوان کے ساتھ ہی لگا رہنا چاہتا تھا۔ کیونکہ ابھی پاکستان پر بھارت کے جارحانہ حملے کی خفیہ طور پر منصوبہ بندیاں ہو رہی تھیں اور میں اس سلسلے میں زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کرنا چاہتا تھا۔ لیکن کچھ پتہ نہیں تھا کہ حالات کیا شکل اختیار کرتے ہیں اسرائیل کے تین ٹاپ رینک کے فوجی جرنیلوں کے ساتھ بھارت کے سینئر اور تجربہ کار تین جرنیلوں کی ہلاکت کوئی معمولی بات

نہیں تھی۔ ایک بار تو بھارتی فوجی ہائی کمانڈ میں بھونچال آ جائے گا۔ بلکہ بھونچال آ گیا ہو گا۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ اس اہم ترین فوجی مذاکرات سیکورٹی کے انچارج کا کورٹ مارشل ہو جائے۔ انچارج مرہٹہ کرنل گول والکر تھا۔ مگر میجر شرت دیوان پر بھی اس تقریب کی سیکورٹی کی تھوڑی بہت ذمے داری عائد ہوتی تھی۔ ممکن تھا کہ میجر شرت دیوان کو حاضر سروس سے معطل کر کے فوجی تحقیقات شروع ہو جائے۔ رات کی خاموشی میں دور اشوکا ہوٹل کی جانب سے ایمبولینس گاڑیوں کے ہوٹروں کی آوازیں آنے لگی تھیں۔ ہیڈ کوارٹر کے گیٹ کی طرف سے بھی کوئی گاڑی تیزی سے اندر داخل ہوئی تھی۔ میں نے کھڑکی ذرا سی کھول کر نیچے دیکھا۔ یہ دو فوجی گاڑیاں تھیں۔ جو بڑی تیزی سے گزر گئیں۔ میں نے کھڑکی کا پٹ بند کر دیا اور کمرے کی بتی روشن کر دی تا کہ اگر جگدیش واپس آئے تو میرے کمرے کی کھڑکیوں پر اندھیرا دیکھ کر آگے نہ چل دے۔

اس دوران ایسا لگ رہا تھا جیسے سارے فوجی ہیڈ کوارٹر میں ایک افراتفری سی مچی ہوئی ہے۔ مجھے بند کمرے میں فوجی گاڑیوں کے تیزی سے ہارن دے کر گزرنے اور فوجیوں کے ایک دوسرے کو آوازیں دینے اور ادھر ادھر تیز تیز دوڑنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ مجھے یقین نہیں تھا کہ ہمارے ایک عام قسم کے مجاہد ساتھی کی تیار کی ہوئی سکاچ ٹیپ اتنی دھماکہ خیز اور بروقت پھٹ جانے والی ثابت ہو گی۔ واقعی ہمارا یہ مجاہد جو گھنشام کے ہندوانہ نام سے ناگ پور کے ایک بازار میں دکان داری کر رہا تھا دھماکہ خیز اشیاء بنانے میں بے حد ماہر تھا۔

کوئی آدھے گھنٹے بعد جگدیش آ گیا۔ میرے کمرے میں روشنی دیکھ کر وہ سیدھا اوپر میرے پاس آ گیا۔ وہ سخت حواس باختہ ہو رہا تھا۔ اس سے بات نہیں ہو رہی تھی۔ میرے پلنگ پر آتے ہی بیٹھ گیا اور بولا۔

"پانی پلاؤ مجھے پلیز"

میں نے جلدی سے گلاس میں پانی ڈال کر اسے دیا اور خود بھی انتہائی حواس باختگی کی کیفیت اپنے اوپر طاری کر لی اور جگدیش سے پوچھا۔

”کیا ہوا جگدیش؟“

جگدیش نے پانی پی کر گلاس پلنگ پر لڑھکایا اور بولا۔

”دھرم ویر بڑی تباہی ہوئی ہے۔ اشوکا ہوٹل کا ایک پورے کا پورا بلاک اڑ گیا ہے۔ وہاں آگ ہی آگ تھی۔ آسمان پر دھواں ہی دھواں تھا“

میں نے سخت گھبراہٹ کے ساتھ پوچھا۔

”ہے بھگوان! جگدیش بھیا کیا وہاں کسی نے بم لگا دیا تھا؟“

جگدیش اب کچھ کچھ اپنے حواس میں آگیا تھا۔ کہنے لگا۔

”کچھ معلوم نہیں ہو رہا۔ سارے کا سارا بلا دھماکوں سے اڑ گیا ہے۔ کہتے ہیں اسرائیلی اور بھارتی جرنیلوں میں سے کوئی زندہ نہیں بچا۔ ان کا شاف بھی ساتھ ہی ختم ہو گیا ہے۔ کیپٹن امریک سنگھ کی لاش بھی نہیں ملی۔ بہت برا ہوا ہے دھرم ویر۔ بہت برا ہوا ہے۔“

میں نے ہاتھ جوڑ کر چھت کی طرف دیکھ کر کہا۔

”ہے رام! میرے بھیا کو بچالینا“

پھر جگدیش سے پوچھا۔

”میرا بھیا شرت دیوان تو بچ گیا ہے ناں؟“

جگدیش نے کہا۔

”تمہارے بھیا میجر شرت اور مرہٹہ کرنل کو میں نے زخمیوں کو فوجی ایمبولینس میں ڈالتے ہوئے دیکھا تھا۔ وہ سخت پریشان تھے۔“

مجھے معلوم تھا کہ میجر شرت اور مرہٹہ کرنل زندہ بچ گئے ہوں گے۔ انہوں نے میرے سامنے کہا تھا کہ وہ دونوں جرنیلوں کے ساتھ میٹنگ میں شریک نہیں ہوں گے اور سیکورٹی کی خاطر ہوٹل کی لابی میں ہی رہیں گے۔ میں نے بے اختیار ہو کر کہا۔

”ہے بھگوان تیری بڑی کرپا ہے میرا بھائی بچ گیا۔ مگر مجھے اپنی فوج کے جرنیلوں اور دوست ملک اسرائیل کے فوجی جرنیلوں اور اپنے افسروں کے مرنے کا سخت صدمہ ہے

ہے جگدیش۔ اب کیا ہو گا؟“

جگدیش بولا۔

”بھگوان ہی جانے کیا ہو گا۔ یہاں کے انٹیلی جنس سٹاف پر مصیبت آجائے گی۔ پتہ نہیں کس کس کا کورٹ مارشل ہو۔ اچھا بھیا میں چلتا ہوں۔ اب صبح ہی کچھ پتہ چل سکے گا کہ ہمارے کتنے فوجی مارے گئے ہیں۔“

جگدیش چلا گیا۔ میں نے دروازہ اندر سے بند کر لیا اور بتی بجھا کر پلنگ پر لیٹ گیا۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میں نے دشمن کے خلاف ایک بڑی فتح حاصل کی ہے۔ چھت کے ساتھ لگا پنکھا چل رہا تھا۔ میں نے کھڑکی کھول دی تھی۔ باہر سے فوجی گاڑیوں کے تیزی سے گزرنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ مگر اب مجھے ان آوازوں کی کوئی پروانہ نہیں تھی۔ جو کچھ میں نے کرنا تھا کامیابی سے کر چکا تھا۔ آگے جو ہونے والا تھا میں ذہنی طور پر اس کے لئے بھی تیار تھا۔ خطرہ صرف اس بات کا تھا کہ پانڈی چری کے فوجی ہیڈ کوارٹر سے کوئی ایسا افسر تفتیش کے لئے یہاں نہ آجائے جس نے مجھے وہاں دیکھ رکھا ہو۔ مجھے ان بھارتی فوجی افسروں کا زیادہ خطرہ محسوس ہو رہا تھا جنہوں نے مجھے پانڈی چری کے ٹارچر سنٹروں میں ٹارچر کیا تھا۔ وہ میری شکل پہچانتے تھے۔ چونکہ اس سے پہلے پانڈی چری میں ہم بہت تباہ کن دھماکہ کر کے بھارتی بحریہ کے دو جہاز ڈبو چکے تھے اس لئے اس بات کا امکان تھا کہ وہاں سے دو تین فوجی افسر تحقیقات کرنے ناگ پور کے ملٹری ہیڈ کوارٹر میں بھی آجائیں۔ میں نے اپنے آپ کو ہر قسم کے حالات کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار کر لیا ہوا تھا۔

اگلے روز میں صبح صبح میجر شرت کے ہوسٹل کی طرف چل پڑا فوجی کینٹین ابھی نہیں کھلی تھی۔ ہیڈ کوارٹر کی فضا پر ایک گہری سوگوار خاموشی طاری تھی۔ میں میجر شرت کے کمرے میں چہرے کو اداس بنا کر آہستہ سے داخل ہوا تو دیکھا کہ میجر شرت دیوان اور مرہٹہ کرنل گول والکر اخبار سامنے رکھے بیٹھے تھے۔ وہ اپنی فل وردیوں میں تھے اور لگتا تھا کہ ابھی ابھی باہر سے آئے ہیں۔ ان کے چہرے اترے ہوئے تھے۔ میں نے اپنی آواز

کو غم ناک بناتے ہوئے ہاتھ جوڑ کر نمسکار کیا اور دوڑ کر میجر شرت کے گلے لگ گیا اور روہانسی آواز میں کہا۔

"بھیا! یہ کیا ہو گیا ہے۔"

میجر شرت نے بیٹھے بیٹھے میرے کندھے پر ہاتھ پھیر کر آہستہ سے مجھے الگ کیا اور آہستہ سے کہا۔

"تم ابھی کینٹین پر جاؤ۔"

میں نے وہاں بیٹھنا مناسب بھی نہ سمجھا اور خاموشی کے ساتھ کمرے سے باہر نکل گیا۔ حالات بتا رہے تھے کہ ان لوگوں پر ملٹری ایڈمنسٹریشن کی طرف سے کوئی بھاری مصیبت نازل ہو چکی ہے۔ میں اپنے کمرے میں آ گیا۔ ناشتہ بنایا۔ ناشتہ کیا۔ پھر کینٹین پر آ گیا۔ فوجی کینٹین کھل چکی تھی۔ جگدیش انگریزی کا تازہ اخبار پڑھ رہا تھا۔ مجھے آتا دیکھ کر اس نے اخبار میرے آگے کر دیا اور بولا۔

"یہ دیکھو کتنی تباہی ہوئی ہے۔ اخبار نے لکھا ہے کہ کشمیری کمانڈوز کی اس کارروائی میں ملکی اور غیر ملکی جرنیلوں کے ساتھ دس فوجی افسر اور ہوٹل کے سات آدمی بھی مارے گئے ہیں۔"

اخبار میں اشوکا ہوٹل کی تصویر بھی چھپی تھی۔ تصویر میں وہ بلاک جس کے کمرے میں میں نے دھماکہ خیز ٹیپ لگائی تھی اس کے سامنے والے تین کمرے پورے کے پورے اڑ گئے تھے۔ میں جگدیش کے ساتھ افسوس کا اظہار کرتا رہا۔ پھر اس سے کہا۔

"میں شرت بھیا سے مل کر آرہا ہوں۔ وہ چپ چپ تھے۔ انہوں نے مجھ سے کوئی بات نہیں کی۔ جگدیش! کہیں میرے بھیا پر فوج کوئی مقدمہ تو نہیں چلائے گی؟"

جگدیش نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"نہیں نہیں۔ ایسا میرے خیال میں نہیں ہو گا ویسے تھوڑی دیر پہلے ایک لانس نائیک چینی کا پیکٹ لینے آیا تھا۔ اس نے مجھے بتایا ہے کہ دلی اور پانڈی چری کی انٹیلی جنس ٹیمیں یہاں پہنچ رہی ہیں۔"

پانڈی چری کا نام سنتے ہی میں سوچ میں ڈوب گیا۔ پانڈی چری کی انٹیلی جنس کور کے چار پانچ اعلیٰ رینک کے افسر مجھے شکل سے پہچانتے تھے۔ میں نے کئی روز تک ان کے ٹارچر برداشت کئے تھے۔ خاص طور پر بوچڑوں جیسے چہرے والا کیپٹن جوشی تو مجھے دور ہی سے پہچان سکتا تھا۔ اور خطرہ تھا کہ وہ تحقیقاتی ٹیم کے ساتھ ضرور آئے گا۔ وہ پانڈی چری کی ملٹری انٹیلی جنس کا بڑا تجربہ کار افسر تھا۔ میں نے جگدیش سے کہا۔

"مجھے پورا وشواش ہے کہ اشوکا ہوٹل میں تباہی مچانے والے کشمیری اگروادی ضرور پکڑے جائیں گے۔ ویسے تمہارے خیال میں دلی اور پانڈی چری کی انٹیلی جنس کے یہ افسر کب تک یہاں پہنچ جائیں گے۔"

جگدیش نے کاؤنٹر پر سے چائے کے ڈبے اٹھا کر شیلف میں رکھتے ہوئے کہا۔

"یہ لوگ ہوائی جہاز سے آئیں گے۔ میرا خیال ہے آج شام تک پہنچ جائیں گے۔"

مجھے اندیشہ تھا کہ پانڈی چری کی انٹیلی جنس ٹیم میں ایسے فوجی افسر ضرور ہوں گے جو مجھ سے پانڈی چری ٹارچر سنٹر میں انٹروگیشن کرتے رہے ہیں اور میں یہاں گرفتار کر لیا جاؤں گا اور پھر میرا جو حشر ہو گا اس کا اندازہ شاید آپ نہیں لگا سکتے۔ لیکن کمانڈو اپنے ٹارگٹ کو اتنی جلدی چھوڑ کر نہیں بھاگتا۔ میں یہ چانس لینا چاہتا تھا۔ کیونکہ ایک فیصد ہی سہی لیکن اس بات کا بھی امکان تھا کہ تحقیقاتی ٹیم میں میری جان پہچان کا کوئی بھارتی فوجی نہ ہو۔ اصل بات یہ تھی کہ میں ابھی مزید کچھ وقت میجر شرت دیوان کے ساتھ منسلک رہنا چاہتا تھا تاکہ میں مزید فوجی راز حاصل کر سکوں۔

دوپہر کے کھانے کے بعد میں دوبارہ میجر شرت کے پاس گیا۔ وہ اس وقت بھی فوجی وردی میں تھا اور ڈائننگ ٹیبل کی کرسی پر بڑی محویت کے عالم میں آنکھیں بند کئے سر کرسی کی پشت سے ٹکائے بیٹھا تھا۔ سگار اس کے ایک ہاتھ میں سلگ رہا تھا۔ اردلی میز پر سے کھانے کے برتن اٹھا رہا تھا۔ میں خاموشی سے اس کے سامنے والی کرسی پر جا کر بیٹھ گیا۔ میرے قدموں کی آہٹ سے میجر شرت نے آنکھیں کھول دیں۔ مجھے دیکھ کر گہرا سانس بھر کر بولا۔

"تم نے کھانا کھالیا؟"

میرے دل میں میجر شرست کے لئے بڑی ہمدردی پیدا ہو گئی تھی۔ وہ واقعی مجھ اپنے چھوٹے بھائی کی طرح پیار کرنے لگا تھا۔ اس وقت بھی جب کہ اس کا پورا فوجی کیر خطرے میں پڑا ہوا تھا اسے میرا اتنا خیال تھا۔ میں نے کہا۔

"ہاں بھیا!"

وہ بھی خاموشی سے سگار پیتا رہا۔ میں بھی تھوڑی دیر کے لئے خاموش ہو گیا۔ نے سکوت کو توڑتے ہوئے پوچھا۔

"بھیا! یہ جو کچھ ہوا ہے اس کی وجہ سے تم پر تو کوئی برا اثر نہیں پڑے گا ناں؟"

میجر شرست کے ہونٹوں پر ایک اداس تبسم نمودار ہوا۔ سگار کو ایش ٹرے میں بجھا ہوئے بولا۔

"کیوں نہیں اثر پڑے گا۔ آخر ان جرنیلوں کی سیکورٹی کی ذمے داری مجھ پر ہ آتی تھی۔"

جیسا کہ مجھے اس وقت کہنا چاہئے تھا میں نے کہا۔

"بھیا! تم چنتا نہ کرو۔ بھگوان سب جانتا ہے۔ تم دوشی نہیں ہو۔ تمہارا کوئی قص نہیں ہے۔"

اس کے بعد میجر شرست اٹھا اور بولا۔

"مجھے آج رات اشوکا ہوٹل میں تفتیش کے سلسلہ میں گزارنی ہو گی۔ تم اگر چا یہاں میرے کمرے میں رات سو جانا۔ اردلی تمہیں کھانا بنا دے گا۔"

میجر شرست چلا گیا۔ میں نے سوچا اچھا ہے مجھے آج رات میجر کی الماری کی تلاشی کا ایک اور موقع مل جائے گا۔ ہو سکتا ہے الماری میں اس کا بریف کیس بھی ہو اور کوئی نئی معلومات مل جائیں۔ میں نے اردلی سے کہا۔

"ابھی میں کینٹین پر جاتا ہوں۔ شام کو آجاؤں گا۔ تم میرے لئے سبزی بنا دینا۔"

اردلی نے کہا۔

"ٹھیک ہے صاحب"

مجھے پانڈی چری سے آنے والی فوجی تحقیقاتی ٹیم کی فکر لگی تھی۔ میں نے کوئی چار بجے جگدیش سے پوچھا۔

"کیا پانڈی چری والی فوجی ٹیم آگئی ہے جگدیش؟"

جگدیش بولا۔

"تمہیں نہیں معلوم؟ یہاں کینٹین کے سامنے سے ان کی سٹاف کار گزری تھی۔ چھ سات اونچے رینک کے افسر بیٹھے ہوئے تھے۔ پتہ نہیں کس کس کی جان مصیبت میں پھنسے گی۔ میرا خیال ہے ہمارے ہیڈ کوارٹر کے کچھ افسروں کا ضرور کورٹ مارشل ہو گا"

شام ہوتے ہی میں کینٹین میں اپنی ڈیوٹی ختم کر کے سیدھا میجر شرست دیوان کے ہوسٹل میں چلا گیا۔ چائے بھی اردلی سے بنوا کر پی اور رات کا کھانا بھی وہیں کھایا۔ اردلی رات دس بجے چیزیں وغیرہ سمیٹنے کے بعد چلا گیا۔ میں کمرے میں اکیلا رہ گیا تو سوچا میجر کی الماری کی تلاشی لی جائے۔ میں الماری کی طرف بڑھا ہی تھا کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ میں نے ریسیور اٹھایا تو دوسری طرف سے میجر شرست کی بوجھل سی آواز آئی۔

"دھرم ویرا"

میں نے کہا۔

"جی بھیا جی!"

اس نے کہا۔

"اچھا کیا تم آگئے ہو۔ پانڈی چری سے تحقیقاتی ٹیم ہیڈ کوارٹر میں آئی ہوئی ہے۔ ہو سکتا ہے اس ٹیم کا کوئی فوجی افسر میری عدم موجودگی میں کمرے کی تلاشی لینے آئے۔ اسے تلاشی لے لینے دینا۔"

میں نے کہا۔

"ٹھیک ہے بھیا!"

اور میجر شرست نے فون بند کر دیا۔ میں نے لوہے کے تار سے الماری کو کھول کر

دیکھا۔ وہاں میجر کا بریف کیس نہیں تھا۔ عام طور پر ٹاپ سیکرٹ فائلیں وہ اپنے بریف
کیس میں ہی رکھتا تھا۔ الماری کی ایک جانب میجر کے سویلین کپڑے اور استری کی ہوئی
فوجی وردی ٹنگی تھی۔ دوسری طرف خانوں میں الابلا سامان بھرا ہوا تھا۔ اس سامان کے
نیچے مجھے ایک فائل نظر پڑی۔ میں نے اسے باہر نکال کر کھولا اور ورق الٹنے لگا۔ ایک
ورق پر میری نظریں ٹھہر گئیں۔ فل سکیپ ٹائپ شدہ کاغذ کے اوپر ٹاپ سیکرٹ کے
لفظوں میں ٹائپ کیا ہوا تھا۔ میں نے الماری بند کی فائل لے کر میز پر بیٹھ کر اسے غور سے
پڑھنے لگا۔

مجھے وہ خفیہ راز مل گیا تھا جس کی مجھے تلاش تھی۔ اس میں انڈیا کے ڈیفنس
ڈیپارٹمنٹ کے چیف سیکرٹری کی طرف سے ایک خط ملٹری ہائی کمانڈ کے چیف آف سٹاف
کو لکھ کر اس سے پاکستان پر بھارت کے حملے کے مہینے کا تعین کرنے کو کہا گیا تھا۔ دوسرا
انڈیا کی فوجی ہائی کمانڈ کی طرف سے لکھا گیا تھا۔ اس خط میں یہ واضح طور پر کہا گیا تھا کہ
پاکستان پر حملہ ستمبر کے مہینے کے شروع میں کیا جائے گا۔ وہ ستمبر 1965ء کا مہینہ نکلتا تھا۔
میں فائل میں نے لگے ہوئے دوسرے کاغذات کو بھی سرسری نظر سے دیکھا۔ ان میں
انٹیلی جینس کے بعض افسروں کی پرسنل فائلوں میں سے کچھ واقعات لے کر ان کی تربیت
کے سلسلے میں بحث کی گئی تھی۔ میں نے فائل اسی طرح الماری کے خانے میں رکھ دی۔
الماری کو بند کر کے تالا لگایا اور کچن میں آکر کافی بنانے کے لئے پانی گرم کرنا رکھ دیا۔

میں نے سگریٹ سلگایا اور کچن کی کھڑکی میں سے باہر چھوٹے سے باغیچے میں لگی ہوئی
بتیوں اور ان بتیوں کی روشنی میں نظر آنے والی جھاڑیوں اور کیلے کے درختوں کو دیکھتے
ہوئے سوچنے لگا کہ مجھے یہ خبر فوراً سری نگر کمانڈو شیروان کو پہنچا دینی چاہئے۔ الماری میں
میجر شرت کا ٹرانسمیٹر سیٹ نہیں تھا۔ اگر ہوتا تو میں اسی وقت خفیہ کوڈ میں کمانڈو شیروان
کو اطلاع کر دیتا کہ بھارت نے پاکستان پر حملہ کرنے کے لئے ستمبر کے مہینے کا پہلا ہفتہ طے
کیا ہے۔ پھر سوچا کہ کل یا پرسوں کسی وقت الماری کی دوبارہ تلاشی لوں گا ہو سکتا ہے میجر
شرت وہاں ٹرانسمیٹر سیٹ لا کر رکھ دے۔ مجھے خیال نہیں رہا تھا کہ اردلی گیا ہے تو میں اٹھ

کر کمرے کے دروازے کو چٹخنی لگا دوں۔ کافی کے لئے پانی ابلنے لگا تو میں نے کافی بنا کر پیالی
میں ڈالی۔ ریفریجریٹر کھول کر انگریزی چیز کا ایک ٹکڑا نکال کر کاؤنٹر پر رکھ کر چھری سے اس
کا ٹکڑا کاٹ رہا تھا کہ باہر کمرے میں کسی کے فوجی بوٹوں کی آواز آئی۔ ساتھ کسی نے
بھاری بھرکم آواز میں کہا۔

”ہیلو۔ ہیلو۔ میجر شرت جی۔ ہیلو۔“

مجھے ایسا لگا جیسے یہ آواز میرے کانوں نے پہلے بھی کہیں سنی ہے۔ میں نے چھری
ہاتھ سے رکھ دی اور یہ دیکھنے کے لئے کھلے دروازے میں سے ڈرائنگ روم میں کون آگیا
ہے کچن کے دروازے کی طرف بڑھا۔ ابھی میں کچن کے دروازے میں نہیں پہنچا تھا کہ
اچانک ایک فوجی وردی والا آدمی کچن کے دروازے میں میرے سامنے آگیا۔ وہ مسکرا رہا
تھا۔

”ہیلو! میجر شرت جی کہاں۔۔۔“

اس کا جملہ ادھورا رہ گیا۔ کیونکہ اس نے مجھے اور میں نے اسے پہچان لیا تھا۔ وہ
ہاڑی چری کے ٹارچر چیمبر کا وہی کیپٹن جوشی تھا جس نے میرے گال پر نشتر سے لمبا زخم
لگایا تھا ہم دونوں اپنی اپنی جگہوں پر ٹھٹھک کر کھڑے کے کھڑے رہ گئے تھے اور پھٹی پھٹی
آنکھوں سے ایک دوسرے کو تک رہے تھے۔

یہ میرے لئے زندگی اور موت کا لمحہ تھا۔

یہ کیپٹن جوشی کے لئے بھی زندگی اور موت کا لمحہ تھا۔ مجھے پہچان لینے کے بعد وہ یقیناً اس نتیجے پر پہنچ گیا تھا کہ میں ہی وہ کمانڈو ہوں جس نے پانڈی چری میں بھارتی جہازوں کو تباہ کرنے کے بعد اب اشوکا ہوٹل کے ایک کمرے کو چھ منزلوں سمیت دھماکے سے اڑا دیا ہے۔ ایک سیکنڈ کے لئے ہم نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ پہچانا اور اس کے ساتھ ہی کیپٹن جوشی کے منہ سے نکلا۔

"تم؟"

اور اس کا ہاتھ بیلٹ کے ساتھ لگے پستول کے ہولسٹر کی طرف گیا۔ اگر میری جگہ کوئی دوسرا آدمی ہوتا تو شاید وہ کیپٹن جوشی کے پستول کے فائر سے زخمی ہو کر گر پڑتا اور وہ اسے اپنی حراست میں لے لیتا۔ کیونکہ ایسے آدمیوں کو جان سے نہیں مارا کرتے۔ ان سے ملٹری پوچھ گچھ کرنی ہوتی ہے۔ لیکن کیپٹن جوشی کو معلوم نہیں تھا کہ اس کے سامنے کون کھڑا ہے۔ جب مجھے پانڈی چری میں اس کے پاس لایا گیا تھا تو میرے ہاتھ پیچھے بندھے ہوئے تھے اور وحشیانہ تشدد کی وجہ سے میں ادموا ہو رہا تھا لیکن اب میرے ہاتھ بندھے ہوئے نہیں تھے اور میرے ایک ہاتھ میں چھری بھی تھی جس سے میں چیز کاٹ رہا تھا۔

میں نے کیپٹن جوشی کو اتنی مہلت ہی نہ دی کہ اس کا ہاتھ ہولسٹر میں سے پستول نکال سکتا۔ میں چھری سے اس پر وار نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس طرح اس کا خون میرے کپڑوں پر لگ جاتا۔ میں نے اس کے بازو کو نیچے پکڑ کر زور سے اوپر کو ایک جھٹکا دیا۔

کیپٹن جوشی کوئی جوان افسر نہیں تھا۔ ادھیڑ عمر کا ہو چکا تھا۔ صرف اس کے تشدد کے نئے نئے طریقے ایجاد کرنے کی وجہ سے اسے فوج سے ریلیز نہیں کیا گیا تھا۔ دوسرا بازو میں نے آگے کھینچ کر اس کے گلے میں ڈالا اور اس کی گردن اپنی بغل میں لے کر اتنی زور سے اوپر کو جھٹکا دیا کہ کیپٹن جوشی کی گردن کی ہڈی ٹوٹنے کی مجھے صاف آواز آئی۔ میں نے سیدھے ہاتھ کی انگلیوں سے اس کی لٹکتی ہوئی گردن کو ٹٹولا اس کی ہنسلی ٹوٹ چکی تھی۔ میں نے اسے چھوڑ دیا۔ وہ کچن کے فرش پر منہ کے بل گر پڑا۔ وہ مر چکا تھا۔ میں کیپٹن جوشی کی لاش کو میجر شرت کے کمرے میں نہیں رکھنا چاہتا تھا۔ میں اسے بازوؤں سے پکڑ کر گھسیٹتا ہوا زینے میں سے ہو کر اوپر چھوٹے سے سٹور میں آ گیا۔ اس کی کھڑکی دوسری جانب ہیڈ کوارٹر کی دیوار کے ساتھ بہتے ہوئے گندے نالے کی طرف کھلتی تھی۔ میں نے کیپٹن جوشی کی لاش کو کھڑکی میں سے گندے نالے میں پھینک دیا۔ وہاں اندھیرا تھا اور سویلین آبادی وہاں سے دور تھی۔ اس کام سے فارغ ہو کر میں نے نیچے آ کر منہ ہاتھ دھویا۔ اور کافی کی پیالی لے کر کچن والی کرسی پر بیٹھ گیا۔ اور اس جگہ کو غور سے دیکھنے لگا جہاں کیپٹن جوشی کو مرنے کے بعد میں نے فرش پر گرایا تھا۔ فرش پر کسی قسم کا کوئی نشان نہیں تھا۔ میں اٹھ کر کمرے میں آ گیا کمرے میں بھی ہر شے اسی طرح اپنی اپنی جگہ پر پڑی تھی۔ کیپٹن جوشی کی لاش کو عقبی نالے میں پھینکنا میری مجبوری تھی۔ میں اس کی لاش کو فوجی ہیڈ کوارٹر سے نکال کر نہیں لے جا سکتا تھا۔ کہ اسے دور کسی ویرانے میں یا دریا میں پھینک دیتا۔ مجھے معلوم تھا کہ جوشی کی لاش گندے نالے میں گرتے ہی ڈوب جائے گی اور گندے کیچڑ کے ساتھ بہتے بہتے صبح تک وہاں سے کہیں کی کہیں نکل جائے گی۔

لیکن لاش وہیں ایک جگہ کیچڑ میں پھنس کر رکی رہی اور دوسرے دن صبح صبح ہی کیپٹن جوشی کی لاش گندے نالے سے ملٹری پولیس کے آدمی نکال کر لے آئے۔ مجھے پتہ چلا تو میں نے کوئی پروانہ کی کیونکہ کیپٹن جوشی بول کر میرا نام نہیں لے سکتا تھا۔ فوجی ہیڈ کوارٹر میں ایک اور باہر سے آئے ہوئے ملٹری آفیسر کے قتل سے ایک بے چینی سی پھیل گئی تھی۔ مگر مجھے انڈین فوجیوں کی بے چینی سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ جو فوجی کیپٹن

میرے قیمتی اور پاکستان اور کشمیر کی سلامتی کے مشن کو ایک لمحے میں تباہ و برباد کر سکتا تھا میں نے اس کو ختم کر دیا تھا۔ ایک بار پھر میجر شرت کی سیکرٹ فائل تک میرا راستہ صاف ہو گیا تھا۔

رات کو میں میجر شرت کے کمرے میں ہی سویا۔ صبح وہاں سے ہی نہا دھو کر کپڑے پہن کر سیدھا کنٹین پر آ گیا۔ دن کے گیارہ بجے کے قریب فوج کے دو سپاہی کنٹین پر آئے ان کے پاس سٹامپ پیڈ اور ایک کاپی تھی۔ ان میں ایک صوبیدار میجر تھا اس نے آتے ہی کہا۔

"لاؤ بھئی اپنی انگلیوں کے نشان یہاں دو۔ یہاں کے سب سویلین ملازموں کے نئے شناختی کارڈ بن رہے ہیں جن پر ہر ایک کی انگلیوں کے نشان بھی ہوں گے۔"

میں نے اور جگدیش نے اپنی اپنی انگلیوں کے نشان ان کی سفید کاپی پر لگا دیئے۔ جگدیش نے پوچھا۔

"یہ کس لئے ہو رہا ہے۔ ہمارے پاس تو پہلے ہی شناختی کارڈ موجود ہیں۔"

صوبیدار میجر بولا۔

"سیکورٹی کے نئے رولز ریگولیشنز نافذ کئے جا رہے ہیں۔ اب یہاں ہیڈ کوارٹر میں جو سویلین کام کرتا ہے اس کو اس کے انگلیوں کے نشان والا شناختی کارڈ دیا جائے گا۔ پرانے شناختی کارڈ کنڈم ہو جائیں گے۔"

اور وہ سٹامپ پیڈ اور ہماری انگلیوں کے نشان والی کاپی سنبھال کر چلے گئے۔ جگدیش کہنے لگا۔

"شہر میں کشمیری کمانڈوز کی دہشت گردی کی وجہ سے ایسا ہو رہا ہے۔ اچھا ہے اب کوئی دشمن کا جاسوس ہمارے ہیڈ کوارٹر میں نہیں گھس سکے گا۔ گیٹ پر اس کے شناختی کارڈ پر اس کی انگلیوں کے نشان بھی چیک کئے جائیں گے۔ تمہیں معلوم ہے دنیا میں کسی ایک آدمی کی انگلیوں کے نشان دوسرے آدمی کی انگلیوں کے نشان سے نہیں ملتے۔"

میں نے بھی یہی سمجھا۔ لیکن اصل معاملہ کچھ اور تھا۔ اصل معاملہ اگلے روز کھلا

جب میجر شرت دیوان نے مجھے اردلی بھیج کر اپنے کمرے میں بلایا۔ میں اس کے کمرے میں گیا تو وہ ایک کاغذ سامنے رکھے بیٹھا اسے غور سے دیکھ رہا تھا۔ میں اس کے پاس گیا تو اس نے کاغذ پرے ہٹا دیا اور مجھ سے بیٹھنے کو کہا۔ میں اس کے سامنے والی کرسی پر میز کے پاس بیٹھ گیا۔ میں نے ترچھی نگاہوں سے دیکھا۔ کاغذ پر کسی کی انگلیوں اور انگوٹھے کے نشان تھے۔ میں کچھ سمجھ نہ سکا۔

میجر شرت نے میری طرف غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"کل رات نو دس بجے کے بعد تم کہاں تھے؟"

اس کی نظروں میں پہلی بار میں اجنبیت کی جھلک دیکھ رہا تھا۔ مجھے ایک لمحے کے لئے ایسا لگا جیسے میں کسی ٹارچر سنٹر میں فوجی افسر کے سامنے بیٹھا ہوں اور مجھ سے پوچھ گچھ ہو رہی ہے۔ میں نے اپنے چہرے پر کسی قسم کی پریشانی کے اثرات نہ آنے دیئے اور جس طرح اپنائیت کے ساتھ میں میجر شرت سے بات کرنے کا عادی تھا اسی انداز میں کہا۔

"بھیا! کل رات نو بجے کے بعد میں اسی کمرے میں تھا۔ اردلی چلا گیا تھا۔ میں نے کھانا کھایا۔ کچھ دیر تک رسالے دیکھتا رہا پھر سو گیا۔ کیوں؟ کیا بات ہے بھیا؟"

میجر شرت کے چہرے سے بھی اجنبیت کے اثرات جو تھوڑی دیر پہلے نمودار ہوئے تھے غائب ہو گئے۔ کرسی سے ٹیک لگاتے ہوئے بولا۔

"ان لوگوں سے کچھ غلطی ہو گئی ہے"

میں نے اصرار کرتے ہوئے پوچھا۔

"بھیا بات کیا ہے؟"

اس نے انگلیوں کے نشانات والا کاغذ آگے کر لیا اور میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

"بات یہ ہے کہ پانڈی چری سے ایک فوجی ٹیم دھماکے کی تحقیقات کرنے یہاں آئی تھی۔ ان میں ایک کیپٹن جوشی بھی تھا۔ کسی نے کیپٹن جوشی کو قتل کر دیا ہے۔ اس کی لاش ہیڈ کوارٹر کے گندے نالے سے ملی ہے"

میں نے مصنوعی حیرت و رنج کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

"ہے بھگوان! مگر یہ کیسے ہو گیا؟ کیا قاتل پکڑا گیا ہے؟"

میجر شرت بولا۔

"اسی کو پکڑنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ چونکہ کیپٹن کی لاش اپنے ہیڈ کوارٹر نالے سے ملی ہے خیال یہی ہے کہ اسے اپنے ہیڈ کوارٹر کے کسی آدمی نے قتل کر کے لا نالے میں پھینک دی ہے۔ پوسٹ مارٹم کرتے وقت دیکھا گیا ہے کہ کیپٹن جوشی کی گرد پر کسی کی انگلیوں کے نشان تھے۔ یہ نشان قاتل کے ہی ہو سکتے ہیں۔ چنانچہ لاش کی گرد پر انگلیوں کے نشان ہم نے لے لئے اور ہیڈ کوارٹر کے تمام ملازمین کی انگلیوں کے نشا بھی دو گھنٹے کے اندر اندر اکٹھے کر لئے۔"

"پھر کیا قاتل مل گیا بھیا؟"

میجر شرت غور سے سامنے پڑے کاغذ کو دیکھ رہا تھا کہنے لگا۔

"حیرانی کی بات ہے کہ لاش کی گردن پر انگلیوں کے جو نشان تھے وہ ہو بہو تمہار انگلیوں کے نشان سے ملتے ہیں۔ یہ دیکھو"

اس نے کاغذ میرے آگے کر دیا۔ مجھے یاد آ گیا کہ جب میں کیپٹن جوشی کی لاش ٹھکانے لگانے لگا تھا تو میں نے دونوں ہاتھوں سے اس کی گردن کو ٹٹول کر دیکھا تھا کہ ا کی گردن کی ہڈی ٹوٹ چکی ہے یا نہیں۔ کیونکہ میں کسی حالت میں اسے زندہ نہیں رکھ چاہتا تھا۔ کیونکہ اس نے مجھے وہاں دیکھ لیا تھا۔ میں نے کاغذ کو دیکھا۔ ایک طرف کیپٹ جوشی کی گردن پر سے لئے گئے انگلیوں کے نشان تھے اور دوسری طرف میری انگلیوں نشان تھے۔ یہ وہ نشان تھے جو دو فوجی نئے شناختی کارڈ بنوانے کے بہانے کنٹین پر آ کر میر انگلیوں پر سیاہی لگا کر کاپی پر چپکا کر لے گئے تھے۔ ڈرامہ اپنے خطرناک موڑ پر پہنچ گیا تھا اب مجھے انتہائی ہوشیاری اور عیاری سے کام لینے کی ضرورت تھی کہ میجر شرت ایسا ملٹر انٹیلی جنیس کا تجربہ کار افسر بھی میرے چہرے پر فکر و تردد کا کوئی نشان نہ دیکھ سکے۔ مگر بہت بڑا ثبوت میرے سامنے تھا جو مجھے کیپٹن جوشی کا قاتل ثابت کر رہا تھا۔ میں نے حیرا سے کہا۔

"بھیا! یہ کیسے ہو سکتا ہے میرا خیال ہے یہ کسی نے تمہارے اور میرے خلاف سازش کی ہے"

"کیسی سازش؟" میجر شرت کے لہجے میں سرد پن تھا میں نے کہا۔

"ہو سکتا ہے میری انگلیوں کے پرنٹ لے کر ہمارے کسی دشمن نے یہی نشان لاش کی گردن پر ڈال دیئے ہوں بھیا! یہاں کچھ لوگ ہم دونوں بھائیوں کے پیار محبت کو حسد کی نظروں سے دیکھتے ہیں۔"

میجر شرت کہنے لگا۔

"نہیں ایسا نہیں ہو سکتا۔ کسی کاغذ پر سے انگلیوں کے نشان اٹھا کر لاش کی گردن پر پرنٹ نہیں کئے جا سکتے۔"

میں نے کہا۔

"تو بھیا کیا میں نے کیپٹن صاحب کو قتل کیا ہے؟ کیا تم ایسا سمجھتے ہو؟"

میجر نے انگلیوں کے پرنٹ والا کاغذ ایک طرف کرتے ہوئے سگار کا کش لگاتے ہوئے کہا۔

"میں تو ایسا نہیں سمجھنا چاہتا۔ مگر وہ بڑے بڑے افسر جو کیپٹن جوشی کے قتل کی انکوائری کر رہے ہیں انہیں یقین ہے کہ قاتل یہی شخص ہے جس کی انگلیوں کے نشان کاغذ پر لئے گئے ہیں۔"

میرے گرد گھیرا تنگ ہوتا جا رہا تھا۔ مجھ سے لاش کی گردن کو ٹٹولنے کی وجہ سے جو غلطی ہو گئی تھی اس نے میرے لئے پھندا تیار کر دیا تھا اور میں اس موت کے پھندے کے قریب ہوتا جا رہا تھا۔ لیکن میں آخری لمحے تک مقابلہ کرنے والا' لڑنے والا کمانڈو تھا۔ میں نے کہا۔

"بھیا! کیا تم بھی ایسا سمجھتے ہو کہ کیپٹن کو میں نے قتل کیا ہے؟ بھیا! مجھے کسی کو قتل کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ میری کیپٹن صاحب سے کیا دشمنی ہو سکتی ہے۔ میں نے تو آج تک ان کی شکل بھی نہیں دیکھی۔"

میجر شرت نے سگار ایش ٹرے میں مسلتے ہوئے کہا۔

"میں خود اسی الجھن میں پڑا ہوں کہ ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔ ملٹری پولیس تو تمہیں گرفتار کرنے کے لئے میرے ساتھ یہاں آ رہی تھی مگر میں نے اپنے اثر ورسوخ سے انہیں روک لیا اور کہا کہ پہلے مجھے اپنے طور پر معلوم کر لینے دو۔"

میں نے دونوں ہاتھوں سے اپنے سر کو پکڑ لیا اور اپنی طرف سے بے حد معصوم اور بے گناہ بنتے ہوئے کہا۔

"ہے بھگوان! تو ہی انتریامی ہے۔ تو جانتا ہے کہ میں دوشی نہیں ہوں"

میجر شرت نے انگلیوں کے پرنٹ والا کاغذ تہہ کر کے اپنی جیب میں رکھ لیا اور مجھ سے کہا۔

"دھرم ویر! پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں ایک بار پھر جا کر انکوائری کمیٹی کو لاش کی گردن پر پڑے ہوئے انگلیوں کے نشانوں کے دوبارہ معائنے کے لئے کہتا ہوں۔ بہرحال تم یہیں رہنا۔"

کمرے سے باہر جاتے ہوئے اس شخص کے دل میں بھائیوں والا پیار بیدار ہو گیا۔ اس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"گھبراؤ نہیں دھرم! میں جانتا ہوں تم ایسا نہیں کر سکتے۔ کہیں کوئی غلطی ضرور لگ گئی ہے۔ میں سارا کیس دوبارہ چیک کراؤں گا۔"

وہ کمرے سے باہر نکل گیا۔ میں نے دروازہ بند کر دیا۔ مگر چٹخنی نہ لگائی۔ اب میرے سامنے ایک ہی کام تھا کہ جیسے اور جس طرح سے بھی ہو سکے میں اس فوجی ہیڈ کوارٹر سے فوراً نکل جاؤں۔ موت کا پھندا میری آنکھوں کے سامنے لٹکنے لگا تھا۔ میں بچ نہیں سکتا تھا۔ تفتیش کرنے والی فوجی ٹیم اصولی طور پر مجھے کیپٹن جوشی کا قاتل قرار دے چکی تھی۔ اگر میجر شرت دیوان نہ ہوتا تو میں اب تک ملٹری پولیس کی حراست میں آ چکا ہوتا۔ ہیڈ کوارٹر کے مین گیٹ سے میں باہر نہیں نکل سکتا تھا۔ بہت ممکن تھا کہ انہیں میرے بارے میں اطلاع مل چکی ہو اور وہیں پکڑ لیا جاتا۔ میرا دماغ انتہائی تیزی سے کام کر رہا تھا۔ فوجی

ہیڈ کوارٹر کا ایک چھوٹا راستہ بھی تھا۔ جو عقب میں تھا مگر وہاں بھی ہر وقت ملٹری پولیس کا پہرہ لگا رہتا تھا۔ اس طرف سے جانا بھی خطرناک تھا۔ میری سمجھ میں اس وقت کوئی تدبیر فرار کی نہیں آ رہی تھی۔ سوچا کہ کھڑکی میں سے پیچھے گندے نالے میں چھلانگ لگا دیتا ہوں۔ میں نے بیڈ روم میں جا کر کھڑکی کھول کر نیچے دیکھا۔ گندا نالہ کیچڑ سے بھرا ہوا تھا اور یہ کیچڑ بھرا بوجھل پانی بڑے بے معلوم انداز میں بہہ رہا تھا۔ اگر اس میں چھلانگ لگاتا ہوں تو کیچڑ کی دلدل میں دھنسنے کے بعد وہاں سے نکلنا آسان نہیں تھا۔ ویسے بھی نالے کے دوسرے کنارے پر لوگ آ جا رہے تھے۔ وہاں شور مچ جاتا۔ لوگ جمع ہو جاتے اور گیٹ چونکہ تھوڑا آگے ہی تھا۔ قدرتی بات تھی کہ وہاں سے ملٹری پولیس کے سپاہی بھی آ جاتے اور میں پکڑا جاتا۔ میں تیزی سے بیڈ روم سے نکل کر ڈرائنگ روم میں آیا۔ دروازے کو ذرا سا کھول کر باہر دیکھا۔ آسمان پر گہرے بادل چھائے ہوئے تھے۔ مجھے جو کچھ بھی کرنا تھا ایک دو منٹ کے اندر اندر کرنا تھا کیونکہ میجر شرت دیوان کیپٹن جوشی کے قاتل کی تحقیقات کرنے والی ٹیم کو یہ کہہ کر قائل نہیں کر سکتا تھا کہ یہ نشان میرے بھائی کی انگلیوں کے نہیں ہے۔ چنانچہ مجھے باقاعدہ گرفتار کرنے کے واسطے ملٹری پولیس کے آدمی کسی بھی لمحے وہاں آ سکتے تھے۔

دروازے کے باہر دیکھا تو مجھے تھوڑے فاصلے پر ایک سویلین ٹرک دیوار کے ساتھ کھڑا دکھائی دیا۔ میں اس ٹرک کو بڑی اچھی طرح سے پہچانتا تھا۔ میں آپ کو اس سے پہلے بتا چکا ہوں کہ ہماری فوجی کنٹین میجر شرت دیوان کے کمرے سے زیادہ دور نہیں تھی۔ فاصلہ یہی کوئی ایک بلاک کا تھا۔ جو سویلین ٹرک فوجی کنٹین کے باہر دیوار کے ساتھ کھڑا تھا وہ فوجی کنٹین کے سویلین ٹھیکیدار مہتہ جی کا تھا۔ مہتہ جی کی ناگ پور شہر کے اندر غلہ منڈی میں اجناس خوردنی کی ہول سیل کی دکان تھی۔ یہ ٹرک وہاں سے ہر ہفتے آٹا' چاول' گھی' چائے' چینی' کا سٹاک لے کر کنٹین پر آتا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ آج سپلائی لے کر ٹرک آنے والا ہے۔ چنانچہ یہ وہی ٹرک تھا۔ بس میرے فرار کی یہی ایک صورت تھی جو اس وقت میرے ذہن نے مجھے پیش کر دی۔

میں نے غور سے ٹرک کو دوبارہ دیکھا۔ ٹرک میں سے سپلائی اتاری جا چکی تھی اور اب اس میں خالی ڈرم اور لکڑی اور گتے کے خالی کھوکھے رکھے جا رہے تھے۔ ٹرک کا دروازہ پیچھے تھا جو کھلا تھا۔ اس دروازے کا رخ دیوار کی طرف تھا۔ ٹرک کا کلینر اور ڈرائیور مجھے جانتا تھا۔ مگر میں ان پر اپنا آپ ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا۔ مجھے جو کچھ کرنا تھا میں نے سوچ لیا تھا۔

بس اللہ کا نام لے کر سر جھکائے خاموشی سے میجر شرت کے ڈرائنگ روم سے نکلا اور برآمدے میں سے اتر کر گملوں اور کیاریوں کے قریب سے ہوتا ہوا ٹرک کی طرف چلنے لگا۔ میں نے چور نظروں سے ماحول کا پورا جائزہ لے لیا تھا۔ اس وقت وہاں کوئی نہیں تھا۔ میں نے اپنے قدم تیز کر دیئے۔ فاصلہ زیادہ بالکل نہیں تھا جیسے ہی میں ٹرک کے عقب میں آیا۔ میں کھلے دروازے میں سے اس کے اندر گھس گیا۔ ٹرک میں خالی ڈرم ڈبے اور لکڑی کے خالی کریٹ تقریباً بھرے ہوئے تھے۔ کفایت شعار بلکہ کنجوس ٹھیکیدار مہتہ جی کا آرڈر تھا کہ کنٹین کو سپلائی پہنچانے کے بعد وہاں سے خالی کریٹ ڈرم وغیرہ واپس دکان پر پہنچا دیئے جائیں۔ میں لکڑی کے ڈبوں اور خالی ڈرموں کے پیچھے چھپ گیا۔ اس وقت میرے دل کی دھڑکن واقعی کچھ تیز ہو رہی تھی۔ یہ کوئی عام قسم کی سویلین جیل نہیں تھی۔ ایک فوجی ہیڈ کوارٹر سے بھاگنا تھا جہاں ہر کسی کے پاس اسلحہ تھا۔

اتنے میں مجھے ٹرک کے کلینر شمبھو ناتھ کی آواز آئی اس نے ڈرائیور ہری رام کو اونچی آواز میں کہا۔

"ہریا! چلو"

کلینر شمبھو ناتھ نے ٹرک کے پیچھے آکر زور سے دروازے کے پٹ بند کئے اور پھر مجھے اس کے کھڑکی کھول کر ڈرائیور کی سیٹ کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھنے اور ڈرائیور سے باتیں کرنے کی آواز آئی۔ ٹرک کا انجن سٹارٹ ہوا۔ ڈرائیور نے گیئر لگایا۔ انجن کو گیس دی اور ٹرک فوجی کنٹین کی دیوار سے نکل کر گیٹ کی طرف آہستہ آہستہ چل پڑا۔ آگے کا مرحلہ بڑا نازک مرحلہ تھا۔ گیٹ پر اس ٹرک کی چیکنگ ہو سکتی تھی۔ میں جانتا تھا کہ

کنٹین کی سپلائی لانے لے جانے والے ٹرک کی چیکنگ نہیں ہوا کرتی مگر یہاں معاملہ مختلف شکل اختیار کر چکا تھا۔ ممکن تھا گیٹ پر ڈیوٹی گارڈ کو آرڈر کر دیا گیا ہو کہ باہر نکلنے والی گاڑیوں کی چیکنگ کی جائے۔ اتنی دیر میں ٹرک گیٹ کے پاس پہنچ گیا تھا۔ مجھے اس کا احساس اس وجہ سے ہوا کہ ڈرائیور ہری رام نے گیٹ پر موجود سیکورٹی گارڈ کو نمسکار کیا تھا اور کہا تھا۔

"رام رام بھیا جی!"

اس کے ساتھ ہی ٹرک گیٹ کی معمولی سی ڈھلان اترنے کے بعد بائیں جانب ٹرن لے کر سڑک پر سیدھا ہو گیا اور اس کی رفتار آہستہ آہستہ تیز ہونا شروع ہو گئی۔ پھانسی کا وہ پھندا جو تھوڑی دیر پہلے میری آنکھوں کے بالکل سامنے لٹک رہا تھا اب مجھ سے دور ہو گیا تھا۔ ٹرک سڑک پر اپنی معمول کی رفتار کے ساتھ چل پڑا تھا۔ میرے ذہن میں طرح طرح کے خدشات پیدا ہو رہے تھے۔ یہ خیال بھی آیا کہ چند لمحوں کے بعد ملٹری پولیس میجر شرت کے ہوسٹل پر مجھے گرفتار کرنے کے لئے پہنچنے والی تھی۔ اگر وہاں آکر اسے معلوم ہوا ہوگا کہ میں وہاں نہیں ہوں تو مجھے میرے کمرے میں دیکھا جائے گا۔ وہاں بھی نہ ہوا تو جب انہیں پتہ چلے گا کہ تھوڑی دیر پہلے سپلائی والا سویلین ٹرک وہاں سے نکلا تھا تو ملٹری پولیس کی جیپ تیزی سے تعاقب کرتی ٹرک تک پہنچ جائے گی اور ٹرک کھڑا کر کے تلاشی لے گی اور میں پکڑ لیا جاؤں گا۔

تو کیا مجھے راستے میں ہی کسی جگہ اتر جانا چاہئے؟ میں ٹرک راستے میں کسی جگہ رکوا سکتا تھا۔ ڈرائیور اور کلینر مجھے جانتے تھے۔ میں انہیں کہہ سکتا تھا کہ یار میں خالی ڈبے ٹرک میں رکھنے گیا تو تم لوگوں نے ٹرک چلا دیا۔ میں نے سوچا کہ چلو شہر کی تھوڑی سیر ہی کر لیتے ہیں۔ اگرچہ انہیں میری بات پر یقین نہیں آسکتا تھا مگر مجھے انہیں یقین دلانے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ کیونکہ اس کے بعد مجھے ان سے ہمیشہ کے لئے جدا ہو جانا تھا۔ آخر غلہ منڈی پہنچنے کے بعد بھی جب ٹرک رک جاتا تو مجھے یہی ڈرامہ کرنا تھا۔ میں نے راستے میں اتر جانے کا فیصلہ کر لیا۔

ٹرک مختلف سڑکوں پر سے گزر چکا تھا۔ جب مجھے محسوس ہوا کہ میں فوجی ہیڈ کوارٹر سے کافی دور نکل آیا ہوں تو میں ڈرموں اور ڈبوں کے پیچھے سے نکل کر ٹرک کے پچھلے دروازے کے پاس آیا۔ اس کو باہر سے کنڈا لگا کر بند کیا گیا تھا جسے میں اندر سے نہیں کھول سکتا تھا۔ یہ بھی ایک مسئلہ تھا میں نے درزوں میں سے سڑک پر پیچھے کی جانب دیکھا۔ مجھے دور تک کوئی فوجی گاڑی نظر نہ آئی۔ اس کے فوراً بعد میں نے ٹرک کی اس لوہے کی چادر والی دیوار پر زور زور سے ہاتھ مارنے شروع کر دیئے جس کی دوسری جانب ڈرائیور کی سیٹ تھی۔ ساتھ ہی میں نے اونچی آواز میں کہا۔

"ارے ہری رام! ٹرک روکو۔ ٹرک روکو"

ٹرک کی رفتار ایک دم ہلکی ہو گئی اور وہ سڑک کے کنارے کی طرف ہونے لگا۔ ڈرائیور کی آواز آئی۔

"اندر کون ہے بے؟"

میں نے اونچی آواز میں کہا۔

"میں ہوں دھرم ویر۔ کنٹین کا منیجر"

ٹرک کو فوراً بریک لگی۔ ٹرک رک گیا۔ ڈرائیور ہری رام اور شمبھو ناتھ جلدی سے پیچھے آئے۔ انہوں نے ٹرک کا دروازہ کھول دیا۔ مجھے دیکھا تو حیران ہوئے۔ میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

"یارا میں ٹرک میں یہ دیکھنے کے لئے گیا تھا کہ سپلائی کی کوئی چیز تو نہیں رہ گئی کہ تم لوگوں نے ٹرک چلا دیا میں نے سوچا کہ چلو تھوڑی سیر ہی کر لیتے ہیں۔"

دونوں ہنسنے لگے۔ لیکن وہ حیران اسی طرح تھے انہیں میری وضاحت پر یقین نہیں آیا تھا۔ مجھے انہیں یقین دلانے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ میں نے پتلون قمیض پہنی ہوئی تھی۔ قمیض کی آستین کو ذرا سا جھاڑتے ہوئے میں نے کہا۔

"اب تم لوگ جاؤ۔ میں ادھر مارکیٹ سے ہوتا ہوا واپس کنٹین پر چلا جاؤں گا۔"

"اچھا بابو۔ چلو شمبھو"

ڈرائیور یہ کہہ کر اپنی سیٹ کی طرف بڑھ گیا۔ کلینر نے دروازہ بند کر کے کنڈی لگائی اور ٹرک کی دیوار پر زور سے ہاتھ مار کر بولا۔

"چلو ہرا جی"

اور ٹرک جس کا انجن چل رہا تھا سڑک پر آ کر آگے روانہ ہو گیا۔ میں نے ایک نگاہ سڑک پر پیچھے کی جانب ڈالی۔ سڑک پر دوسری گاڑیاں وغیرہ آ رہی تھیں۔ مگر مجھے کوئی فوجی گاڑی آتی دکھائی نہ دی۔ میں جلدی سے سڑک پار کر کے دوسری طرف آیا اور فٹ پاتھ پر پتلون کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے تیز تیز چلنے لگا۔ ایک چوک آیا تو میں وہاں سے دوسرے بازار میں داخل ہو گیا۔ یہاں کافی ٹریفک تھا۔ میں نے اس دوران اپنی جیبوں کو ٹٹول کو دیکھ لیا تھا۔ میرے پاس نقدی کی شکل میں صرف پندرہ بیس روپے ہی تھے۔ ایک رومال تھا اور کچھ نہیں تھا۔ میں سب سے پہلے اپنے ساتھی جاسوس گھنشام کو فون پر اپنے آنے کی اطلاع کرنا چاہتا تھا۔ میں صرف وہیں چھپ سکتا تھا۔ کیونکہ اس شہر میں ملٹری پولیس بہت جلد میری تلاش میں نکلنے والی تھی۔ جب ملٹری پولیس کو پتہ چلے گا کہ میں فرار ہو چکا ہوں تو انہیں یقین ہو جائے گا کہ کیپٹن جوشی کا قاتل میں ہی ہوں۔ اس کے بعد میجر شرت پر جو مصیبت آنی تھی مجھے اب اس سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ لیکن شہر میں میری تلاش بھی تیزی سے شروع ہو جانی تھی۔ ملٹری پولیس نے سول پولیس کو خبردار کر دینا تھا۔ اور میری تلاش اور مجھے پکڑنے کے لئے جگہ جگہ چھاپے پڑنے شروع ہو جانے تھے۔ مجھے اس کارروائی کے شروع ہونے سے پہلے پہلے اپنے جاسوس کے پاس روپوش ہو جانا تھا۔ وہاں مجھے کسی جگہ کوئی پبلک ٹیلی فون بوتھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں ایک بڑے سٹور میں داخل ہو گیا۔ میں نے وہاں سے اپنے جاسوس گھنشام کو فون کیا۔ وہ دکان پر ہی تھا میں نے خفیہ الفاظ میں اسے کہا کہ خطرناک صورت حال پیدا ہو گئی ہے اور میں آ رہا ہوں۔ اس نے کہا۔

"آ جاؤ"

میں نے سٹور سے باہر آ کر ایک موٹر رکشا پکڑا اور اس علاقے کی طرف روانہ ہو گیا

جہاں ایک بازار میں گھنشام کی دکان تھی۔ وہ اسی طرح دکان کے اندر اپنے کاؤنٹر کے پیچھے بیٹھا حساب کتاب دیکھ رہا تھا۔ اس کا نوکر چیزوں کو ادھر ادھر سنبھال کر لگا رہا تھا۔ یاد رہے کہ میں نے جان بوجھ کر آپ کو یہ نہیں بتایا کہ ہمارے جاسوس کی دکان پر کیا چیزیں فروخت ہوتی تھیں۔ ان باتوں کا میری کہانی سے کوئی براہ راست تعلق بھی نہیں ہے۔ یہ بھی یاد کراتا چلوں کہ ہمارے مجاہد کا نام گھنشام نہیں تھا۔ وہ مسلمان کشمیری نژاد تھا اور اس کا نام کچھ اور تھا مگر وہ وہاں ہندوانہ نام سے کئی سال سے دکان کر رہا تھا۔ اس کا ہندوانہ نام بھی کچھ اور تھا میں نے گھنشام اس کا فرضی نام رکھا ہوا ہے۔ گھنشام نے مجھے دکان میں داخل ہوتے دیکھ لیا تھا۔ میں نے اس سے کوئی بات نہ کی اور لکڑی کا تنگ زینہ چڑھ کر اوپر والی کوٹھڑی میں چلا آیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ بھی آگیا۔ اس نے اندر داخل ہوتے ہی دروازہ بند کر دیا اور مجھے گلے لگالیا۔ میں نے کہا۔

"تمہارے ایکسپلوسویز نے کمال کر دکھایا"

اس نے مجھے چارپائی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ خود میرے سامنے بیٹھ گیا۔ کہنے لگا۔

"تم نے جو کارنامہ کر دکھایا ہے اس نے دلی کی حکومت کو بھی ہلا کر رکھ دیا ہے۔ اسرائیلی جرنیلوں کی ہلاکت کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ اس سے دونوں کے تعلقات میں کشیدگی پیدا ہو سکتی ہے۔ اور ہم یہی چاہتے ہیں اور کچھ نہیں تو کم از کم اسرائیلی حکومت یہ سوچ کر محتاط ضرور ہو جائے گی کہ بھارت میں ان کے فوجی افسروں کی زندگی محفوظ نہیں ہے۔"

میں نے کہا۔

"ان میں سے کوئی بھی زندہ نہیں بچا"۔

گھنشام بولا۔

"میں نے اخبار میں ساری خبر پڑھ لی تھی۔ مجھے یہ بتانے کی تمہیں ضرورت نہیں کہ تم نے دھماکہ خیز سکاچ ٹیپ کس طرح جا کر وہاں لگائی تھی۔ لیکن میں تمہیں تمہاری ہوشیاری اور جرات کی داد ضرور دوں گا۔ ہمیں کشمیر کی جدوجہد آزادی میں کامیاب

ہونے کے لئے تم ایسے مجاہد کمانڈوز کی ہی ضرورت ہے۔ اب مجھے بتاؤ کہ اس دھماکے کے بعد کیا ہوا اور تم نے جو فون پر کہا تھا کہ حالات خطرناک صورت اختیار کر گئے ہیں تو اصل بات کیا ہوئی ہے۔"

میں نے گھنشام کو سارے واقعات شروع سے آخر تک سنا دیئے اور کہا۔

"اگر میں ذرا دیر کر دیتا یا اس وقت اتفاق سے کنٹین کا ٹرک وہاں موجود نہ ہوتا تو میرا فوجی ہیڈ کوارٹر سے بچ کر نکل آنا ناممکن تھا۔"

گھنشام کہنے لگا۔

"اللہ کا بڑا کرم ہوا ہے۔ اب ایسا ہے کہ تمہیں کچھ دنوں کے لئے باہر نہیں نکلنا ہوگا۔ ان لوگوں کے پاس تمہارے شناختی کارڈ کی تصویر ضرور ہوگی۔ یہ تصویر ملٹری پولیس کے علاوہ شہر کی پولیس کو بھی سپلائی کر دی جائے گی۔ ہو سکتا ہے تمہاری تصویر اخباروں میں پولیس کی جانب سے دیئے گئے کسی اشتہار میں بھی چھپ جائے۔ لیکن میرا خیال ہے چونکہ تمہارے فوجی ہیڈ کوارٹر سے فرار ہونے میں فوج کی بدنامی کا پہلو نکلتا ہے اس لئے ممکن ہے تمہاری تصویر اخباروں میں نہ چھپے اور اشتہار بھی نہ چھپے پھر بھی تمہیں یہی سمجھنا چاہئے کہ شہر کا ہر سپاہی اور ملٹری پولیس کا ہر فوجی تمہاری شکل کو پہچانتا ہے اور تمہیں ان کے سامنے ہرگز نہیں جانا۔"

میں نے کہا۔

"لیکن میں اس کوٹھڑی میں بھی زیادہ دیر تک نہیں چھپ سکتا۔ اس میں بھی خطرے کا پہلو نکلتا ہے۔"

گھنشام کہنے لگا۔

"میں تمہیں یہاں نہیں رکھوں گا۔ میرے پاس ایک اور جگہ ہے۔ میں تمہیں رات کو وہاں لے جاؤں گا۔ پہلے تم مجھے یہ بتاؤ کہ تمہارا اگلا پروگرام کیا ہے۔"

میں نے کہا۔

"میں یہاں سے سیدھا کمانڈو شیروان کے پاس سری نگر جانا چاہتا ہوں تاکہ کشمیر اور

پاکستان پر انڈیا کے چار ماہ بعد متوقع حملے کے بارے میں گفتگو کروں"

پھر میں نے گھنشام کو بتایا کہ بھارت پاکستان پر اگست کے اواخر میں یا ستمبر کے شروع میں پاکستان پر حملہ کر دے گا۔

"یہ بھی میجر شرت کی ٹاپ سیکرٹ فائل میں خود پڑھ چکا ہوں۔"

گھنشام کہنے لگا۔

"اس میں دیر سویر بھی ہو سکتی ہے۔ لیکن تمہارا فوری طور پر سری نگر پہنچنا ضروری ہے۔ اس کا بندوبست بھی ہو جائے گا۔ ابھی تم یہیں بیٹھو۔ سونا چاہتے ہو تو بے شک سو جاؤ۔ میں کچھ دیر بعد تمہارے پاس آؤں گا۔"

گھنشام نیچے چلا گیا۔ کافی دیر تک میں اسی چھوٹی سی کوٹھڑی میں لیٹا اگلے پروگرام کے خدشات اور امکانات پر غور و فکر کرتا رہا۔ اس وقت تک ناگ پور کے فوجی ہیڈ کوارٹر میں میرے فرار کا علم سب کو ہو چکا تھا۔ شہر کے ہر چوک پر بس سٹینڈ اور ریلوے سٹیشن میرے لئے خطرناک شکل اختیار کر چکا تھا۔ فوجی حکام کو اب تک یہ بھی علم ہو گیا ہو گا کہ میں نے ہی اشوکا ہوٹل میں دھماکہ کیا ہے اور کیپٹن جوشی کا قاتل بھی میں ہی ہوں اور پانڈی چری والے جہازوں کی تباہی میں بھی میرا ہی ہاتھ تھا۔ اور میں دھرم ویر نہیں ہوں بلکہ انتہائی دلیر اور خطرناک کشمیری کمانڈو ہوں۔

گھنشام میرے لئے چائے کا گلاس لے کر آیا۔ کہنے لگا۔

"ہمارے ایک آدمی نے مجھے اطلاع دی ہے کہ اس نے شہر کی سڑکوں پر ملٹری پولیس اور سول پولیس کی گاڑیاں گزرتی دیکھی ہیں۔ ظاہر ہے انہیں تمہاری تلاش ہے۔

وہ میرے لئے سگریٹ بھی لایا تھا۔ میں نے سگریٹ سلگا لیا اور چائے پینے لگا۔ وہ یہ کہہ کر چلا گیا کہ شام کو آئے گا۔ اس وقت دن کے دو بج رہے تھے۔ میں شام تک کوٹھڑی میں ہی چھپا رہا۔ شام کو وہ میرے لئے کھانا لایا۔

"تم کھانا کھاؤ۔ میں تمہارے پاس زیادہ دیر نہیں بیٹھنا چاہتا۔ دکان کے باہر میں نے پولیس کے دو سپاہی منڈلاتے دیکھے ہیں۔ پہلے یہاں پولیس نہیں آتی تھی۔ بہرحال تم فکر

نہ کرو ہم رات میں کسی وقت یہاں سے نکلیں گے۔"

جب رات کے نو بجے تو مجھے نیچے سے گھنشام کی آواز سنائی دی۔ وہ دکان کے ملازم سے کہہ رہا تھا کہ تمہیں گھر جانا ہے تو چلے جاؤ۔ میں دکان خود ہی بند کر لوں گا۔ اس کے بعد پھر نیچے خاموشی چھا گئی۔ کوٹھڑی میں کمزور سی روشنی والا بلب جل رہا تھا۔ ایک تپائی پر ٹائم پیس رکھا ہوا تھا۔ میں اسی ٹائم پیس سے وقت کا اندازہ کر لیتا تھا۔ کافی دیر بعد مجھے دکان کا دروازہ بند کرنے کی آواز سنائی دی۔ میں یہی سمجھا کہ گھنشام دکان بند کر کے چلا گیا ہے اور اس وقت مجھے لے جانے کے لئے آئے گا جب رات کافی گہری ہو گئی ہو گی۔ مگر وہ دکان کے اندر ہی تھا۔ مجھے لکڑی کے زینے پر قدموں کی آہٹ آئی گھنشام کوٹھڑی میں آ کر میرے پاس بیٹھ گیا اور تپائی پر رکھی گھڑی کو دیکھ کر بولا۔

"ہم رات کے ایک بجے کے بعد یہاں سے نکلیں گے"

میں نے پوچھا۔

"کیا اس وقت بازار میں پہرے دار یا پولیس کا کوئی آدمی تو نہیں ہو گا"۔

وہ سر کو اثبات میں آہستہ آہستہ ہلاتے ہوئے کہنے لگا۔

"دونوں باتیں ہو سکتی ہیں۔ لیکن اس کے سوا دوسرا کوئی راستہ بھی نہیں ہے۔ دن کے وقت یا رات کے وقت لوگوں کی موجودگی میں یہاں سے نکلو گے تو پکڑے جا سکتے ہو۔ تمہاری شکل سے واقف کوئی نہ کوئی خفیہ پولیس کا آدمی بازار میں ضرور ہو گا۔ رات ایک بجے کے بعد بازار بالکل خالی ہو جاتا ہے۔ ایک چوکیدار ضرور پھرتا ہے مگر اس کا چکر کافی سا ہوتا ہے۔ باقی رہا خفیہ پولیس کا خطرہ تو اس سلسلے میں میں اپنی تسلی کرنے کے بعد تمہیں یہاں سے نکالوں گا۔"

میں نے اس سے کہا کہ میرے پاس کسی قسم کا کوئی اسلحہ بھی نہیں ہے۔

"میں چاہتا تھا کہ سری نگر تک جانا ہے راستے میں جگہ جگہ خطرہ ہے۔ کسی طرح کے بھی حالات پیش آ سکتے ہیں۔ اگر کہیں سے مجھے کمانڈو چاقو ہی مل جاتا تو میں اپنا دفاع کر سکتا تھا۔"

گھنشام کہنے لگا۔

"میں تمہیں ایک ایسی نایاب شے دوں گا کہ پھر تمہیں کمانڈو چاقو یا پستول وغیرہ کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوگی۔"

میں جان گیا تھا کہ یہ شخص اسلحہ اور دھماکہ خیز اشیاء تیار کرنے کا بے حد ماہر اور تجربہ کار ہے۔ میں نے پوچھا۔ وہ کونسی چیز ہے؟"

گھنشام نے کہا۔

"یہ تمہیں بتاؤں گا نہیں۔ دکھاؤں گا اور جب دکھاؤں گا تو اس وقت بتاؤں گا کہ جو چیز تم دیکھ رہے ہو اصل میں وہ کیا ہے"

ہم دیر تک بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ اس دوران ہم نے ایک ایک پیالی چائے بھی پی جو گھنشام نے وہیں بجلی کے چولہے پر بنائی تھی۔ اس دوران گھنشام نے اپنی اس حیرت انگیز ایجاد کے بارے میں کوئی بات نہ کی جو اس نے تیار کر رکھی تھی اور جو وہ مجھے اپنی حفاظت کے لئے دینے والا تھا۔ جب رات کا پورا ایک بج گیا تو وہ یہ کہہ کر نیچے دکان میں گیا کہ میں دیکھ کر آتا ہوں بازار میں چوکیدار تو نہیں پھر رہا۔ جب واپس آیا تو بولا۔

"آجاؤ۔ میدان بظاہر خالی ہے"

اس نے مجھے نسواری رنگ کی چادر دے کر کہا۔

"اسے اپنے سر منہ پر لپیٹ لو"

میں نے ایسا ہی کیا۔ گھنشام نے خود وہاں کا ہندوانہ لباس یعنی لنگی کرتا چپل پہن رکھی تھی۔ دکان سے باہر نکلتے وقت اس نے چھتری بھی لے لی تھی۔ بازار سنسان پڑا تھا ساری دکانیں بند تھیں۔ بازار میں تھوڑی دور تک چلنے کے بعد ہم ایک بغلی گلی میں داخل ہو گئے۔ پھر ایک گلی سے دوسری گلی میں سے گزرتے ہوئے ایک غیر آباد جگہ پر نکل آئے سامنے دور کسی آبادی کی بتیاں جلتی نظر آرہی تھیں۔ گھنشام کہنے لگا۔

"وہ سامنے والی آبادی ریلوے کالونی ہے۔ یہاں ناگ پور ریلوے کے دوسرے درجے کے سٹاف کے مکانات ہیں۔"

ہم ایک کھیت میں سے گزر رہے تھے۔ میں نے گھنشام سے بالکل نہ پوچھا کہ ہم کہاں جا رہے ہیں۔ ظاہر ہے وہ مجھے کسی ایسی جگہ لے جا رہا تھا جہاں اس نے کوئی خفیہ کمین گاہ بنا رکھی تھی۔ دشمن ملک میں جو کمانڈو سپاہی یا جاسوس اپنے ملک کے لئے کام کرتے ہیں ان کے لئے اس قسم کی کوئی خفیہ کمین گاہ بڑی ضروری ہوتی ہے۔ یہاں وہ اپنے جاسوسی کے مشن میں کام آنے والی ضروری اشیاء جن میں دھماکہ خیز چیزیں' فالتو کرنسی' بھیس بدلنے والا سامان اور ریڈیو ٹرانسمیٹر وغیرہ شامل ہوتے ہیں چھپا کر رکھتے ہیں۔ ایسی ہی خفیہ جگہوں سے جاسوس اپنے ملک کو ٹرانسمیٹر کے ذریعے یا دشمن ملک میں ہی اپنے دوسرے ساتھیوں کو خفیہ کوڈ میں ضروری پیغام پہنچاتے ہیں۔

چلتے چلتے ہم ایک ریلوے لائن پر آگئے۔ رات کے اندھیرے میں مجھے ادھر ادھر چھوٹے بڑے ٹیلوں کے خاکے نظر آرہے تھے۔ ہم ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ گھنشام نے کہا۔

"یہ ناگ پور ورنگل کی مین لائن ہے۔ یہ سیدھی مدراس تک چلی جاتی ہے۔"

ہم جنوب کے رخ یعنی مدراس کی جانب ہی جا رہے تھے۔ ایک جگہ سے ایک لائن ایک طرف گھوم گئی۔ ہم اسی لائن پر آگئے وہ کہنے لگا۔

"یہ لائن یہاں سے صوبہ کرناٹک کی طرف جاتی ہے۔"

میں نے پوچھا۔

"ہم کہاں جا رہے ہیں؟"

گھنشام اندھیرے میں ہنس پڑا۔ بولا۔

"اتنی جلدی تھک گئے۔ جہاں ہم جا رہے ہیں وہ جگہ یہاں سے زیادہ دور نہیں ہے۔"

ایک چھوٹی پہاڑی کا خاکہ قریب آتا جا رہا تھا۔ یہاں پہنچ کر ریلوے لائن پہاڑی کی سرنگ میں داخل ہو جاتی تھی۔ سرنگ کے باہر سگنل کا کھمبا لگا تھا جس کی بتی سرخ تھی۔ میں گھنشام کے پیچھے پیچھے سرنگ میں داخل ہوگیا۔ سرنگ میں بہت آگے جا کر ایک جگہ روشنی

ہو رہی تھی۔ اس روشنی میں لائن کی پٹڑیاں ہی نظر آ رہی تھیں۔ سرنگ کی دیوار کے ساتھ ساتھ چلنے کے لئے راستہ بنا ہوا تھا۔ ہم اس راستے پر سرنگ کی دیوار کے ساتھ لگ کر چل رہے تھے۔ سرنگ ختم ہوئی تو گھنشام نے جو آگے آگے چل رہا تھا۔ پہلی بار جیب سے چھوٹی ٹارچ نکال کر اس کی روشنی ڈالی۔ لوہے کے جنگلے والی سیڑھی نیچے گھاٹی میں اترتی تھی۔ گھنشام بولا۔

"احتیاط سے سیڑھی اترنا"

یہاں گھپ اندھیرا نہیں تھا۔ چونکہ فضا کشادہ اور جنگل کی تھی اس لئے بادلوں بھرے آسمان کے باوجود چیزوں کے دھندلے دھندلے خاکے دکھائی دے رہے تھے۔ لوہے کی سیڑھی اترنے کے بعد گھنشام نے پہاڑی کی دیوار کی طرف روشنی ڈالی تو مجھے ایک چھوٹا سا پلیٹ فارم دکھائی دیا جس کے سامنے کوئی ریلوے لائن نہیں تھی۔ پہاڑی کی دیوار میں ساتھ ساتھ دو کوٹھڑی سی بنی ہوئی تھیں جن میں سے ایک کا دروازہ غائب تھا۔ دوسری کوٹھڑی کے آگے لکڑی کا تختہ لگا دیا گیا تھا۔ گھنشام اس کوٹھڑی کی طرف بڑھا کہنے لگا۔

"کبھی یہاں ایک پہاڑی ریلوے سٹیشن ہوا کرتا تھا۔ پھر ایسا ہوا کہ اردگرد کے جنگلوں میں آدم خور شیروں کا ایک جوڑا کہیں سے آگیا۔ انہوں نے ریلوے کوارٹروں میں آکر لوگوں کو ہڑپ کرنا شروع کر دیا۔ شکاری بلوایا گیا۔ ایک شیر مارا گیا۔ پھر ویسا ہی ایک اور آدم خور شیر کہیں سے آگیا۔ یہاں دن کے وقت بھی ٹرین رکتی تو شیر حملہ کر دیتے۔ رفتہ رفتہ اس سٹیشن کو یہاں سے اٹھا کر دس پندرہ میل آگے لے جایا گیا۔ تب سے یہ جگہ ویران ہے۔ میں نے اپنی خفیہ کمین گاہ کے لئے اس جگہ کو چنا کیونکہ اس طرف سے اب دن کے وقت بھی کوئی نہیں گزرتا۔"

اس نے کوٹھڑی کے آگے سے تختہ تھوڑا سا ہٹا دیا۔ یہ کوٹھڑی پہاڑی کے اندر دیوار کو کھود کر بنائی گئی تھی۔ اس نے ٹارچ اور چھتری مجھے پکڑا دی۔ ایک موم بتی کہیں سے نکال کر روشن کی۔ کوٹھڑی چھوٹی سی تھی۔ دیوار کے ساتھ ایک طرف چٹائی بچھی ہوئی

تھی۔ گھنشام نے موم بتی دیوار کے طاق میں لگا دی۔ چٹائی کو ایک طرف ہٹا دیا۔ اس کے نیچے لکڑی کا تختہ تھا۔ تختے کو ہٹایا اور ایک تنگ زینہ نیچے جاتا نظر آیا۔ ہم زینہ اتر گئے۔ نیچے ایک کوٹھڑی سے چھوٹا تہہ خانہ تھا۔ ٹارچ گھنشام کے ہاتھ میں تھی۔ ٹارچ کی روشنی میں میں نے ایک طرف لکڑی کے تخت پر ایک صندوق دیکھا۔ صندوق کا ڈھکنا کھول کر گھنشام نے اندر سے ایک چھوٹا ٹرانسمیٹر نکال کر دکھایا۔ کہنے لگا۔

"یہ بڑا طاقتور ٹرانسمیٹر ہے"

اس کے علاوہ صندوق میں بھیس بدلنے کا مختلف سامان کپڑے اور دھماکہ خیز آلات بنانے کی چیزیں بھی تھیں۔ گھنشام نے مجھے ایک پوائنٹ فائیو کا آٹو میٹک پستول دکھایا۔ جس کے آگے سائی لینسر لگا تھا۔ کہنے لگا۔

"تم اگر چاہو تو کمانڈو شیروان کو ٹرانسمیٹر پر پیغام پہنچا سکتے ہو۔"

مجھے اس کی ضرورت بھی تھی۔ میں نے فوراً ٹرانسمیٹر اون کیا سگنل کوڈ مجھے معلوم تھا۔ اس وقت رات بھی آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی۔ کمانڈو شیروان سے ٹرانسمیٹر پر رابطہ پیدا کرنے کا یہی وقت تھا۔ میں نے فریکوئنسی ملا کر خفیہ سگنل دینے شروع کر دیئے۔ فوراً دوسری طرف سے بھی خفیہ سگنل موصول ہو گیا۔ میرا اور شیروان کا رابطہ قائم ہو گیا۔ میں نے اسے خفیہ کوڈ میں مختصر الفاظ میں اشوکا ہوٹل کی تباہی اور اسرائیلی اور بھارتی جرنیلوں کی ہلاکت کے بارے میں بتایا اور کہا کہ باقی کی تفصیلات میں خود سری نگر آکر بیان کروں گا۔ اس نے مجھے بتایا کہ کمانڈو اورنگ زیب میرے پاس سری نگر پہنچنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ اس کی مجھے خوشی ہوئی۔ اس کے بعد میں نے رابطہ منقطع کر کے ٹرانسمیٹر بند کر دیا۔ اپنا آدمی گھنشام بولا۔

"یہاں باہر کوئی فوجی انسٹلائزیشن وغیرہ نہیں ہے۔ اس لئے کوئی ہمارے سگنل ڈی ٹیکٹ نہیں کر سکتا۔"

اس کے بعد ہم اوپر کوٹھڑی میں آکر چٹائی پر بیٹھ کر باتیں کرنے لگے۔ گھنشام نے کہا۔

"یہاں دن کے وقت بھی کوئی نہیں آتا۔ یہ بالکل ویران علاقہ ہے۔"

میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"کیا آدم خور شیر بھی نہیں آتے؟"

وہ ہنس کر کہنے لگا۔

"جب ریلوے والے یہاں سے سٹیشن اٹھا کر آگے لے گئے تھے تو اس کے ساتھ آدم خور شیر بھی آگے چلے گئے تھے۔ لیکن پھر ایک انگریز شکاری کہیں سے آگیا۔ اس نے ان آدم خوروں کو ہلاک کر دیا۔ اب یہاں کبھی کوئی شیر نہیں دیکھا گیا۔"

میں نے گھنشام سے کہا۔

"میں یہاں زیادہ دیر نہیں رہنا چاہتا۔ میں چاہتا ہوں کہ تم جتنی جلدی ہو سکے کوئی ایسا بندوبست کر دو کہ میں ناگ پور کے علاقے سے نکل جاؤں۔ ایک بار اس خطرے والے علاقے سے نکل گیا تو آگے سری نگر میں اپنے آپ چلا جاؤں گا۔"

گھنشام بولا۔

"جس قسم کے حالات یہاں پیدا ہو گئے ہیں ان کے مطابق میرے خیال میں تمہیں کم از کم تین چار دن تک یہاں چھپے رہنا ہو گا۔ اس کے بعد میں تمہیں یہاں سے نکال دوں گا۔ ابھی خطرہ ہے۔"

میں نے کہا۔

"میں تین چار دن گزار لوں گا۔"

گھنشام کہنے لگا۔

"میں منہ اندھیرے یہاں آکر تمہیں کھانے پینے کو دے جایا کروں گا۔ تم کوشش کرنا کہ دن کے وقت باہر مت نکلو۔ رات کو بے شک باہر نکل کر چہل قدمی کر لیا کرنا۔"

گھنشام آتی دفعہ تہہ خانے سے آٹومیٹک پستول لیتا آیا تھا۔ اس نے پستول حفاظت کے لئے مجھے دے دیا اور کچھ دیر میرے پاس بیٹھے رہنے کے بعد صبح منہ اندھیرے آنے کا کہہ کر چلا گیا۔ کوٹھڑی میں موم بتی کی دھیمی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ میں چٹائی پر بیٹھا آٹومیٹک

پستول کا معائنہ کر رہا تھا۔ ایک بات میں نے اپنے ان مجاہد کمانڈوز اور جاسوسوں میں دیکھی تھی کہ وہ ایک دوسرے کے بارے میں زیادہ بات نہیں کرتے تھے۔ کمانڈو شیروان نے مجھ سے وائرلیس پر بالکل نہیں پوچھا تھا کہ میں ناگ پور میں اپنے کس آدمی کے پاس روپوش ہوں۔ اسی طرح گھنشام نے مجھ سے سوامی گورکھ ناتھ کے بارے میں کوئی بات نہیں کی تھی۔ ہر مجاہد دشمن کے پیٹ میں گھس کر اپنی جان خطرے میں ڈال کر وطن کی آزادی کے لئے خاموشی سے اپنی اپنی ڈیوٹی ادا کر رہا تھا۔ یہ کمانڈو اور جاسوس کا ڈسپلن ہوتا ہے اس ڈسپلن کا ہر کمانڈو' ہر جاسوس بے حد خیال رکھتا ہے اور اسے خیال رکھنا پڑتا ہے ورنہ اس کی اپنی سلامتی اور اس کے مشن کی کامیابی خطرے میں پڑ جاتی ہے۔

میں نے اٹھ کر کوٹھڑی کا تختہ ذرا سا ہٹایا اور باہر نکل آیا۔ بارش کی باریک سی پھوار پڑ رہی تھی۔ یہ وسطی ہند کی برسات کی جھڑی تھی۔ فضا میں خنکی ہو گئی تھی۔ سامنے ایک طرف اونچی پہاڑیوں کے ہیبت ناک ہیولے کھڑے تھے۔ دوسری جانب دور کسی جگہ روشنی جھلملا رہی تھی۔ پستول میرے ہاتھ میں تھا۔ کھلی فضا میں چند لمحے ٹھہرنے کے بعد میں کوٹھڑی میں واپس آکر چٹائی پر لیٹ گیا۔ مجھے ایک عجیب سی مگر مانوس بو کا احساس ہوا۔ میں اٹھ کر بیٹھ گیا میں نے اس بو کو پہچان لیا تھا۔ یہ سیندور کی بو تھی اور میری دشمن چندریکا کی بدروح کی بو تھی۔ میں نے آہستہ سے کہا۔

"چندریکا! کیا تم ہو؟"

کوٹھڑی میں خاموشی چھائی رہی۔ میں نے ایک بار پھر یہی سوال دہرایا۔ اس بار بھی کوئی جواب نہ ملا۔ مگر بدروح کی بو تیز ہو گئی تھی۔ ضاف ظاہر تھا کہ چندریکا وہاں موجود ہے۔ یہ خیال میرے تحت الشعور میں ہر وقت رہتا تھا کہ نظام الدین اولیاء" کے علاقے میں جو مغل شہزادے کی خانقاہ تھی وہاں مغل شہزادے کی نیک روح نے عالم رویا میں مجھ سے ہم کلام ہو کر مجھے خبردار کیا تھا کہ آئندہ کسی بھی وقت مجھ پر ایک ایسی ناگہانی آفت نازل ہو گی جس کا علاج میرے پاس نہیں ہو گا۔ اور اس کے لئے مجھے نجیب آباد کے پتھر گڑھ قلعے کے جنگل میں شہید مسلمان خاتون کے گمنام مزار پر جانا ہو گا۔

جب کوٹھڑی میں چندریکا کی بدروح کی بو آئی تو میں سمجھ گیا کہ میری ناگہانی آفت کا وقت آن پہنچا ہے۔ چندریکا کی بدروح نے ناگ پور کی ملٹری انٹیلی جینس کو میرے بارے میں سب کچھ بتا دیا ہوگا۔ اور بہت ممکن ہے سرنگ میں انڈین فوج کی پوری کمپنی مجھے پکڑنے کے لئے موجود ہو۔ میں نے چندریکا کی نظر نہ آنے والی بدروح کو مخاطب کر کے کہا۔

"چندریکا! میں جانتا ہوں تم میری جان کی دشمن بن چکی ہو۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ تم مجھے کسی بھی وقت میرے دشمنوں کے حوالے کر سکتی ہو۔ لیکن ایک بات میں تمہیں بھی بتا دینا چاہتا ہوں کہ میں مسلمان ہوں۔ بت پرست نہیں ہوں' بت شکن ہوں۔ ایک خدا ایک رسول پاک ﷺ کا ماننے والا مجاہد ہوں تمہارا کوئی ناپاک حربہ مجھ پر کامیاب نہیں ہوگا۔ اسلام نے ہمیشہ کفر کو ہر میدان میں شکست دی ہے۔ میں بھی تمہیں ہر جگہ شکست دوں گا۔"

میں چپ ہوگیا۔ خیال تھا کہ چندریکا کی بدروح آگے سے کچھ بولے گی۔ مگر وہ بالکل خاموش رہی۔ تھوڑی دیر بعد اس کی تیز بو کم ہونے لگی۔ پھر کم ہوتے ہوئے بالکل غائب ہوگئی۔ میری دشمن چندریکا کی بدروح جا چکی تھی۔ میں نے موم بتی کو اسی طرح جلتے رہنے دیا اور کلمہ شریف پڑھ کر سو گیا۔

میں تھوڑی دیر تک ہی سویا ہوں گا۔

گھنشام وعدے کے مطابق منہ اندھیرے میرے لئے کھانا لے کر آگیا۔ وہ ایک تھرمس میں پانی اور ایک تھرمس میں چائے لایا تھا۔ کہنے لگا۔

"شہر میں پولیس جگہ جگہ تمہیں تلاش کر رہی ہے۔ شہر سے باہر جانے والے تمام راستوں کی ناکہ بندی کر دی گئی ہے۔ میں تمہیں ٹھیک وقت پر یہاں لے آیا"

میں نے اس سے پوچھا۔

"تمہارے خیال میں میری تلاش کا یہ سلسلہ کتنی دیر تک جاری رہے گا۔"

وہ بولا۔

"کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ بہرحال جیسے ہی حالات ذرا نارمل ہوئے میں تمہیں یہاں سے نکال دوں گا۔ اب میں جاتا ہوں۔ صبح ہونے سے پہلے پہلے اپنی جگہ پہنچنا ضروری ہے۔"

"وہ چلا گیا۔ موم بتی اس نے آتے ہی نئی روشن کر دی تھی۔ میں نے برتن میں سے تھوڑے سے چاول نکال کر کھائے۔ پانی پیا' پھر گرم گرم چائے تھرمس میں سے نکال کر پی۔ برتنوں کو رومال میں باندھ کر کونے میں ایک طرف رکھ دیا اور موم بتی بجھا کر تختہ ذرا سا ہٹا کر باہر کھلی فضا میں نکل آیا۔ باہر دن کی روشنی ابھی پوری طرح سے نہیں پھیلی تھی۔ آسمان پر چھائے ہوئے بادلوں میں سے پو پھٹنے کے وقت جو دھندلی سی سفیدی نمودار ہوتی ہے وہ ظاہر ہونا شروع ہو گئی تھی۔ بارش رکی ہوئی تھی۔ میں تازہ ہوا میں لمبے لمبے سانس لینے لگا۔ اتنے میں مجھے دور سے بھاپ سے چلنے والے انجن کی سیٹی کی آواز سنائی

دی۔ ناگ پور شہر کی جانب سے کوئی ٹرین آ رہی تھی۔ میں ایک طرف باہر کو نکلی ہوئی چٹان کی اوٹ میں ہو گیا ریلوے لائن ہماری کوٹھڑی کے اوپر تھوڑے سے فاصلے پر سے گزرتی تھی۔ مجھے سرنگ کا دہانہ یعنی وہ جگہ نظر نہیں آ رہی تھی جہاں سے ٹرین نے سرنگ میں داخل ہونا تھا۔ اوپر سرنگ کا وہ منہ نظر آ رہا تھا جہاں سے ٹرین نے باہر نکلنا تھا۔ سرنگ میں داخل ہونے سے پہلے ٹرین کا انجن مسلسل سیٹیاں بجا رہا تھا۔ پھر اس کی گڑگڑاہٹ کی گونج مدھم ہو گئی۔ ٹرین سرنگ میں داخل ہو چکی تھی۔ میری آنکھیں پچھلے پہر کے نیم اندھیرے میں سرنگ کے دوسرے دہانے پر لگی تھیں۔ وہاں سے ٹرین کے انجن کی سیٹیاں سنائی دینے لگیں۔ پھر روشنی باہر نکلنے لگی۔ روشنی تیز ہوتی گئی۔ اس کے بعد ایک بہت بڑی ریل گاڑی کا انجن چیختا چنگھاڑتا' دھڑدھڑاتا ہوا ٹرین کے ڈبوں کو لے کر تیز رفتاری سے سرنگ میں سے نکل آیا۔ زمین ہلنے لگی۔ ٹرین کے ڈبوں کی روشنیاں تیزی سے آگے کو جا رہی تھیں۔

میرے دل میں خیال آیا۔ کاش میں بھی اس ٹرین میں کہیں چھپ کر بیٹھا ہوتا اور اس شہر سے دور ہوتا چلا جاتا۔ لیکن مقدر نے میرے نامہ اعمال میں کچھ ایسی باتیں لکھ دیں تھیں۔ جن کا پورا ہونا ضروری تھا۔ ٹرین گزرنے کے بعد بھی میں کچھ دیر تک اسی جگہ ان ہی خیالات میں گم بیٹھا رہا۔ پھر صبح ہو گئی ابر آلود صبح کی روشنی میں میں نے آس پاس کے ماحول کو دیکھا۔ یہ شہر سے باہر کا نیم سطح مرتفع کا علاقہ تھا۔ سامنے کی جانب دو تین بلند پہاڑیاں تھیں۔ آگے میدان دور تک چلے گئے تھے۔ اس خیال سے کہ کوئی مجھے وہاں بیٹھا دیکھ نہ لے۔ میں کوٹھڑی میں آ گیا۔ وہ دن بھی گزر گیا۔ رات کے پچھلے پہر گھنشام نے آ کر بتایا کہ حالات کچھ بہتر ہو گئے ہیں اور اب تمہیں یہاں سے نکالنے کی کوشش کی جا سکتی ہے۔ میں نے اسے کہا۔

"تم نے مجھے کہا تھا کہ تم مجھے اپنی ایک ایسی ایجاد دکھانا چاہتے ہو جس کو دیکھ کر میں حیران رہ جاؤں گا۔"

گھنشام بولا۔

"مجھے یاد ہے۔ اپنی یہ خاص ایجاد میں تمہیں یہاں سے رخصت ہوتے وقت دینا چاہتا تھا۔ میں کل صبح منہ اندھیرے آؤں گا۔ اس وقت تم سے بات ہو گئی۔"

"کیا کل صبح میں یہاں سے کوچ کر جاؤں گا؟"

وہ بولا۔

"یہ میں تمہیں کل ہی بتاؤں گا۔"

وہ چلا گیا۔ اگلے روز منہ اندھیرے سے کچھ پہلے آ گیا۔ اس وقت میں کوٹھڑی میں سو رہا تھا۔ اس نے آ کر مجھے جگایا اور کہنے لگا۔

"آج تمہیں یہاں سے نکال کر لے جاؤں گا"

پھر اس نے چٹائی ہٹائی۔ تختہ ایک طرف کر کے نیچے تہہ خانے میں گیا اور ایک چھوٹا سا ڈبہ اٹھا کر لے آیا۔ ڈبے میں سے اس نے ایک سیاہ رنگ کا بال پوائنٹ نکال کر مجھے دیا اور بولا۔

"یہ کیا ہے؟"

میں نے کہا۔

"بال پوائنٹ ہے"

میں نے اسے کھولا اور گتے کے باہر انگریزی میں شہر ناگ پور کا نام لکھا۔ وہ بولا۔

"تم ہی نہیں جو کوئی بھی اسے دیکھے گا یہی کہے گا کہ یہ ایک بال پوائنٹ پین ہے"

میں نے کہا۔

"تو کیا یہ بال پوائنٹ پن نہیں ہے؟"

وہ بولا۔

"یہ بال پوائنٹ پن ہی ہے۔ مگر ایک عام بال پوائنٹ پن اور اس میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ دوسرا بال پوائنٹ پین صرف لکھ سکتا ہے مگر یہ بال پوائنٹ لکھ بھی سکتا ہے اور دشمن کی جان بھی لے سکتا ہے۔"

میں نے حیران ہو کر کہا۔

"میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا۔"

گھنشام نے بال پوائنٹ میرے ہاتھ سے لے لیا۔ اس نے اسے تھوڑا سا گھما کر اس کا سرے والا حصہ الگ کر دیا۔ پھر اس نے مجھے سرے والی لمبی سلاخ کے نیچے لگی ہوئی ایک اور پتلی سی نالی دکھائی۔ کہنے لگا۔

"اس نالی کو غور سے دیکھو۔"

موم بتی جل رہی تھی۔ گھنشام نے ٹارچ کی روشنی بھی ڈالی۔ میں نے غور سے دیکھا تو مجھے بال پوائنٹ کے سرے والی نالی کے نیچے چپکی ہوئی دوسری پتلی سی نالی میں چاول کے دانوں کے برابر آگے پیچھے لگی ہوئی سوئیاں سی نظر آئیں۔ گھنشام کہنے لگا۔

"اب بال پوائنٹ کو پہلے کی طرح بند کر دو۔"

میں نے اسے بند کر دیا۔ گھنشام نے دیوار کے ساتھ گتے کے ڈبے کو سیدھا کھڑا کر کے لگا دیا اور بولا۔

"بال پوائنٹ کا رخ اس گتے کی طرف کر دو"

میں نے ایسا ہی کیا۔ پھر اس نے کہا۔

"بال پوائنٹ کے اوپر کی جانب اس کی کیپ کے نیچے تمہیں ایک دانے کی طرح کا بٹن ابھرا ہوا نظر آئے گا۔ اسے دبا دو۔"

میں نے بال پوائنٹ کی کیپ کے نیچے انگلی پھیری۔ وہاں ایک دال کے دانے کے برابر بٹن ابھرا ہوا تھا۔ جس کا رنگ بال پوائنٹ کے رنگ ایسا ہی تھا اور دیکھنے سے بالکل دکھائی نہیں دیتا تھا۔ میں نے بال پوائنٹ کا رخ دیوار کے ساتھ لگے گتے کے ڈبے کی طرف پہلے ہی سے کیا ہوا تھا۔ اب اس کا بٹن دبایا تو بڑی معمولی سی ایسی آواز آئی جیسے کوئی شے بال پوائنٹ کے اندر سے نکل گئی ہو۔ گھنشام نے دیوار کے ساتھ لگے گتے کے ڈبے کو اٹھایا اور اسے میرے آگے کرتے ہوئے کہا۔

"یہ دیکھو۔ یہاں ایک سوراخ ہو گیا ہے۔ یہ سوراخ پہلے نہیں تھا۔ جانتے ہو یہ سوراخ کس کا ہے؟"

تب اس نے مجھے بتایا کہ بال پوائنٹ کا بٹن دبانے سے اس کے اندر سے چاول کے دانے کے سائز کی سوئی نکل کر اس گتے کے اندر جا چکی ہے۔ اس نے گتے کے ڈھکن کو الگ کیا۔ اندر ایک سوئی پڑی تھی۔ یہ وہی سوئی تھی جو میں نے بال پوائنٹ کی سرے والی سلاخ کے نیچے لگی ہوئی فالتو نالی کے اندر دوسری سوئیوں کے ساتھ چپکی ہوئی دیکھی تھی۔ گھنشام نے کہا۔

"یہ بال پوائنٹ ایک بڑا خطرناک پستول ہے۔ جب تم اسے دشمن کے قریب لے جا کر بٹن دباؤ گے تو اس میں سے یہ زہریلی سوئی نکل کر دشمن کے جسم میں داخل ہوتے ہی اسے ہلاک کر دے گی۔ اس وقت اس بال پوائنٹ پستول کے اندر پچاس زہریلی سوئیاں بھری ہوئی ہیں۔ یہ ساری کی ساری سوئیاں سائی نائیڈ زہر میں بجھی ہوئی ہیں۔ سائی نائیڈ سب سے زیادہ ہلاکت خیز زہر ہے۔ انسان کے جسم میں داخل ہوتے ہی یہ اسے موت کی نیند سلا دیتا ہے۔ زہریلی سوئی اس قدر رفتار کے ساتھ بال پوائنٹ کے سوراخ میں سے نکلتی ہے کہ دشمن نے اگر اوور کوٹ بھی پہن رکھا ہو تو یہ اس کو چیرتی ہوئی دشمن کے جسم میں اتر جائے گی۔ اس کی رینج پچاس فٹ تک کی ہے اگر آدمی کا نشانہ درست ہو تو یہ پچاس فٹ کی دوری سے دشمن کے جسم کو ہٹ کر کے اسے ہمیشہ کی نیند سلا دے گی۔"

اس نے بال پوائنٹ مجھے دے کر کہا۔

"یہ اب تم اپنے پاس رکھو گے۔ ہو سکتا ہے تمہیں راستے میں اس کی ضرورت پڑ جائے۔ میں تمہیں کچھ فالتو سوئیاں بھی دے سکتا ہوں۔ لیکن میرا خیال ہے کہ تمہیں ان کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ پچاس زہریلی سوئیاں بال پوائنٹ میں بھری ہوئی ہیں میرے اندازے کے مطابق یہ ایک مدت تک تمہارے کام آئیں گی۔ اس کے بعد اگر ضرورت پڑی تو تمہیں جہاں تم ہو گے پہنچا دی جائیں گی۔"

میں نے بال پوائنٹ کو کھول کر دوبارہ اس کا معائنہ کیا۔ اسے کیپ لگائی۔ اور پتلون کی جیب میں سنبھال کر رکھ لیا۔ گھنشام نے جیب سے ریلوے کا ایک ٹکٹ نکال کر مجھے دیا۔ یہ زرد رنگ کا گتے کا چھوٹا سا ٹکٹ تھا۔ اس پر انگریزی اور ہندی میں لکھا تھا۔

"ساؤتھ انڈیا ریلوے ناگ پور سے دلی تک"

گھنشام بولا۔

"یہ تمہارا دلی تک کا ریلوے کا تھرڈ کلاس کا ٹکٹ ہے۔ یہ سو روپے تم اپنے پاس رکھو گے"

اس نے آٹومیٹک پستول مجھ سے لے لیا۔ کہنے لگا۔

"بال پوائنٹ پستول کے ہوتے ہوئے تمہیں اس پستول کی ضرورت نہیں رہی۔ یہاں سے آگے ایک سٹیشن ہے جس کا نام جھریالی ہے۔ جھریالی سٹیشن پر گاڑی رکتی ہے۔ ابھی ناگ پور سے گاڑی کے آنے میں ایک گھنٹہ ہے۔ اتنی دیر میں ہم جھریالی پہنچ جائیں گے۔ اب اللہ کا نام لے کر یہاں سے نکل چلو۔"

ہم پتھر کی سیڑھیاں چڑھ کر اوپر ریلوے لائن پر آگئے۔ وقت وہی رات کا پچھلا پہر تھا اور مجھے اسی گاڑی کو پکڑنا تھا جسے میں نے پچھلی رات سرنگ میں سے نکل کر آگے جاتے دیکھا تھا۔ گھنشام کچھ دور تک ریلوے لائن کے ساتھ چلنے کے بعد ایک جگہ پر دوسری طرف سے نیچے اتر گیا۔ یہاں سے ہم رات کے اندھیرے میں ٹیلوں کے درمیان آگئے۔ یہ ریلوے لائن پہاڑیوں اور میدانوں میں چکر لگانے کے بعد آگے جا کر ایک برساتی نالے کے اوپر سے گزرتی تھی۔ جھریالی کا ریلوے سٹیشن اس برساتی نالے کے پل کے آگے تھا۔ ہم کوئی پون گھنٹے میں وہاں پہنچ گئے۔ اس دوران ہمیں دو ایک بار اپنے عقب میں ٹیلوں کے پیچھے سے ریلوے انجن کی سیٹیوں کی آواز سنائی دی۔ گھنشام بولا۔

"ریل ہماری کمین گاہ کی سرنگ میں سے نکل آئی ہے۔"

جھریالی سٹیشن تک پہنچتے پہنچتے صبح ہو گئی تھی۔

آسمان پر بادل کل کی طرح جھکے ہوئے تھے۔ رات کو بارش ہوئی تھی۔ یہ چھوٹا سا دیہاتی سٹیشن تھا۔ ٹکٹ میری جیب میں تھا۔ بارش میں بھیگا ہوا پلیٹ فارم خالی پڑا تھا۔ صرف ریلوے کا ایک آدمی ہاتھ میں سبز اور سرخ جھنڈیاں لپیٹے کھڑا تھا۔ گھنشام نے مجھ سے ہاتھ ملایا اور کہا۔

"دوست! اب میں جاتا ہوں۔ میں نے اپنا فرض پورا کر دیا۔ اب خدا کرے کہ تم بھی اپنا فرض پورا کر سکو۔ خدا حافظ!"

یہ کہہ کر وہ مجھ سے رخصت ہو گیا۔ اس دوران دور سے ریل گاڑی نظر آنے لگی تھی۔ سٹیشن کے چھوٹے سے کمرے میں سے ایک قلی ٹرالی میں کچھ تھیلے لادے باہر نکل آیا اور پہلے سے کھڑے ریلوے افسر کے پاس آکر رک گیا۔ یہ تھیلے اس ٹرین میں لادے جانے والے تھے۔ میں ان لوگوں سے کچھ فاصلے پر کھڑا تھا۔ ٹرین آکر رک گئی۔ میں تھرڈ کلاس کے ایک ڈبے میں سوار ہو گیا۔ کوئی دو منٹ بعد انجن نے سیٹی دی۔ گارڈ نے بھی سیٹی دی اور ٹرین چل پڑی۔ اس ٹرین نے مجھے اگلے روز رات کے دو بجے دلی پہنچا دیا۔

یہاں سے مجھے دوسری گاڑی پکڑ کر پنجاب اور وہاں سے جموں کی طرف روانہ ہونا تھا۔ معلوم ہوا کہ پنجاب کی طرف گاڑی صبح سوا سات بجے چھوٹے گی۔ یہ وقت میں نے دلی کے سٹیشن پر ہی گزارنے کا فیصلہ کیا۔ ایک ٹی سٹال سے چائے پی اور پلیٹ فارم پر ایک ویران سی جگہ پر جا کر بیٹھ گیا۔ میرا حلیہ یہ تھا کہ مونچھیں پہلے ہی میں نے رکھ لی ہوئی تھیں۔ کئی روز سے شیو نہیں کیا تھا جس کی وجہ سے ڈاڑھی بڑھ آئی تھی۔ وہی پتلون قمیض پہن رکھی تھی جو اب میلی ہو رہی تھی۔ میں نے سوچا کہ اب سری نگر پہنچ کر ایک بار ہی کپڑے بدلوں گا۔ رات گزرتی جا رہی تھی۔ میں پلیٹ فارم کے آخر میں ایک جگہ سامان کی اوٹ میں بیٹھا تھا۔ سامنے ریلوے لائن پر سگنل کی سرخ اور سبز بتیاں روشن تھیں۔ میں ان کی طرف دیکھ رہا تھا کہ اچانک ساری روشنیاں بجھ گئیں۔ میں بڑا حیران ہوا کہ یہ بتیاں کیسے بجھ گئیں۔ میں نے آنکھیں پوری طرح سے کھول کر دیکھا۔ سارے سٹیشن پر اندھیرا چھا گیا تھا۔ میں نے سمجھا کہ بجلی کا بریک ڈاؤن ہو گیا ہے۔ جیسے ہی میں نے اپنی آنکھیں نیچی کیں تو مجھے اپنا جسم بھی دکھائی نہ دیا۔ میں نے ہاتھ اٹھا کر آنکھوں کے سامنے کیا۔ مجھے اپنا ہاتھ نظر نہ آیا۔

میں گھبرا کر اٹھ کھڑا ہوا۔

میری جیب میں سگریٹ کا پیکٹ اور ماچس پڑی تھی۔ میں نے ماچس نکال کر جلائی۔

مجھے ماچس کا شعلہ نظر نہ آیا۔ میں نے ہاتھ آگے کیا۔ مجھے شعلے کی گرمی محسوس ہوئی۔ ماچس کی تیلی جل رہی تھی مگر مجھے نظر نہیں آرہی تھی۔ میں نے جلدی سے تیلی ایک طرف پھینکی اور وہیں بیٹھ کر سوچنے لگا میری بینائی تو نہیں جاتی رہی۔ میں نے گردن گھما کر چاروں طرف دیکھا۔ مجھے سوائے اندھیرے کے اور کچھ نظر نہیں آرہا تھا۔ اب مجھے یقین ہو گیا کہ میری بینائی جاتی رہی ہے اور میں اندھا ہو گیا ہوں۔ ان حالات میں اس سے بڑی مصیبت مجھ پر نازل نہیں ہو سکتی تھی۔ اچانک مجھے مغل شہزادے کی روح کی پیشین گوئی یاد آگئی۔ اس نے کہا تھا کہ عنقریب مجھ پر ایک بھاری آفت نازل ہونے والی ہے۔ یا اللہ! کیا یہ وہی آفت ہے جس کی پیشین گوئی مغل شہزادے کی نیک روح نے کی تھی؟ اچانک مجھے چندریکا کی بدروح کی مخصوص بو محسوس ہوئی۔ میں فوراً سمجھ گیا کہ یہ آفت چندریکا کی بدروح کی طرف سے مجھ پر نازل ہوئی ہے اور اس نے مجھ سے انتقام لیا ہے۔ میں نے دانت پیس کر آہستہ سے کہا۔

"چندریکا! بدروح چندریکا! تم نے آخر مجھ پر وار کر دیا ہے۔ لیکن یاد رکھو۔ میرا خدا مجھے اس آفت سے نکال لے گا۔ اس کے بعد میں تمہیں ایسے جہنم کی آگ میں پہنچا دوں گا کہ جہاں سے تم کبھی بھی نہ نکل سکو گی۔"

مجھے چندریکا کے ہلکے سے فاتحانہ قہقہے کی آواز سنائی دی۔ اور یہ آواز دور ہوتے ہوتے غائب ہو گئی۔ اس کے ساتھ ہی چندریکا بدروح کی بو بھی غائب ہو گئی۔ میں نے زور زور سے آنکھیں جھپک کر دیکھنے کی کوشش کی۔ مگر میں بالکل اندھا ہو چکا تھا۔ مجھے مغل شہزادے کی ہدایت فوراً یاد آگئی تھی۔ اس کی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے مجھے نجیب آباد میں پتھر گڑھ کے قلعے کے قریبی جنگل میں شہید مسلمان خاتون کی قبر پر جا کر اس کی روح کے لئے مغفرت کی دعا کرنی تھی۔ اس کے بعد مغل شہزادے کے کہنے کے مطابق شہید خاتون کی روح نے مجھے اس ناگہانی آفت سے نکلنے کا راستہ بتانا تھا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ مجھے تو کچھ نظر نہیں آتا۔ اور میں دشمنوں میں گھرا ہوا ہوں۔ نجیب آباد کے پتھر گڑھ قلعے میں کیسے پہنچوں گا۔

اتنے میں میری آنکھوں کے آگے روشنیاں سی ابھرنے لگیں۔ میں نے زور سے آنکھیں ملیں۔ اب آنکھوں کو جھپکا تو ریلوے سگنلوں اور دلی سٹیشن کی روشنیاں پھر سے نظر آنا شروع ہو گئیں۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ چندریکا کی بدروح کی بددعا کا اثر ختم ہو گیا تھا۔ اب میں اچھی طرح دیکھ سکتا تھا۔ میری بینائی واپس آچکی تھی۔ میں جلدی سے سٹیشن کے باہر گیا۔ نجیب آباد کا ریل کا ٹکٹ خریدا اور معلوم کیا کہ دلی سے نجیب آباد گاڑی کون سے پلیٹ فارم سے کس وقت روانہ ہو گی۔ یہ ساری معلومات لے کر میں مطلوبہ پلیٹ فارم پر آکر ایک جگہ اوٹ میں ہو کر بیٹھ گیا۔ نجیب آباد میں اس لئے جانا چاہتا تھا کہ مجھے معلوم تھا چندریکا کی بدروح دوبارہ حملہ کرے گی اس لئے بہتر یہی ہے کہ مجھے سری نگر سے جو نجیب آباد جانا پڑے گا۔ ابھی کیوں نہ وہاں جا کر اس آفت کا توڑ معلوم کروں اور چندریکا کی بدروح کا قصہ ہمیشہ کے لئے پاک کر دوں۔

میرا اندازہ بالکل درست تھا۔ مجھے وہاں بیٹھے بمشکل دس منٹ گزرے ہوں گے کہ ایک بار پھر میری بینائی نے جواب دے دیا اور میری آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا۔ میں پریشان ہو کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ مجھے کچھ بھی نظر نہیں آتا تھا۔ یا اللہ! میری مدد فرما۔ یہ کیسی مصیبت مجھ پر نازل ہو رہی ہے۔ یہ اندھے پن کی حالت مجھ پر کوئی پندرہ بیس منٹ تک طاری رہی۔ اس کے بعد مجھے پھر سے دکھائی دینا شروع ہو گیا۔ اب میرا نجیب آباد کے پتھر گڑھ قلعے کی طرف جانا ضروری ہو گیا تھا۔ دن نکلنے کے بعد مجھے نجیب آباد والی گاڑی ملی۔

اس وقت مجھے سب کچھ نظر آرہا تھا۔ میں ڈبے میں باتھ روم کے پاس والی سیٹ پر بیٹھ گیا کہ اگر راستے میں میری بینائی جاتی رہی تو کم از کم باتھ روم میں تو پکڑ پکڑ کر داخل ہو سکوں گا۔ ٹرین چل پڑی۔ آدھ گھنٹے کے وقفے کے بعد ایک بار پھر میری آنکھوں کی روشنی بجھ گئی۔ پریشانی کی حالت میں سیٹ پر منہ باہر کئے بیٹھا رہا۔ دن کا وقت تھا۔ ٹرین تیزی سے جا رہی تھی۔ مگر مجھے کھڑکی کے باہر سوائے اندھیرے کے اور کچھ نظر نہیں آرہا تھا۔ یہ حالت آدھ گھنٹے تک رہی۔ اس کے بعد ایک بار پھر میری بینائی واپس آگئی۔ اب یہ ہوتا

کہ کبھی آدھے گھنٹے بعد اور کبھی ایک گھنٹے بعد میں اندھا ہو جاتا۔ یہ حالت کبھی پندرہ منٹ کبھی آدھا گھنٹہ طاری رہتی۔ اس کے بعد پھر مجھے سب کچھ دکھائی دینے لگ جاتا۔ اسی اندھیرے اجالے' بینائی اور نابینائی کی حالت میں میں آخر نجیب آباد پہنچ گیا۔ خدا کا شکر ہے کہ اس دوران کسی کو مجھ پر شک نہ ہوا۔ کوئی سی آئی ڈی اور ملٹری انٹیلی جینس کا آدمی بھی مجھے نہ ملا۔ نجیب آباد میں بھی آسمان بادلوں میں چھپا ہوا تھا۔ دن کا وقت تھا۔ ابھی شام ہونے میں کافی دیر تھی۔ میں چپکے سے سٹیشن سے باہر نکل آیا۔ یہ سٹیشن اور اس کے آس پاس کا علاقہ میرا دیکھا ہوا تھا۔ مغل شہزادے کی روح نے کہا تھا۔

"پتھر گڑھ قلعے کے عقب میں نجیب آباد کے گھنے جنگل شروع ہو جاتے ہیں۔ یہاں ایک بڑا گھنا دشوار گزار جنگل ہے جس کو کجلی بن کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ کجلی بن کے جنگل میں ایک ٹیلہ ہے جس کو لال پہاڑی کہتے ہیں۔ اس کی نشانی یہ ہے کہ اس کی چوٹی پر دو سرخ رنگ کی مخروطی چٹانیں ایک دوسری کے پہلو میں کھڑی ہیں۔ جب تم پر ناگہانی آفت نازل ہو تو تم کجلی بن کی اس لال پہاڑی کے دامن میں پہنچ جانا۔ یہاں ایک پرانا کنواں ہے۔ اس کنوئیں کے پاس بانس اور ہوا درختوں کے درمیان ایک قبر بنی ہوئی ہے۔ اس قبر کا نشان زمین سے ابھرے ہوئے دو تین پتھر ہی باقی رہ گئے ہیں۔ یہ اس بہادر مسلمان خاتون کی قبر ہے جو اس جنگل میں کفر و اسلام کی جنگ میں ہندو مرہٹوں کا مقابلہ کرتی شہید ہو گئی تھی۔ تم وہاں دعائے مغفرت کرنا۔ اس کے بعد وہاں کچھ دیر بیٹھے رہنا۔ اگر خدا کو منظور ہوا تو اللہ کے حکم سے شہید خاتون کی روح وہاں آکر تمہیں بتائے گی کہ تم پر جو مصیبت نازل ہوئی ہے اس سے تم کس طرح نجات حاصل کر سکتے ہو۔"

مجھے مغل شہزادے کی ساری باتیں یاد تھیں۔ چنانچہ نجیب آباد کے ریلوے سٹیشن سے نکلتے ہی میں نے تانگہ پکڑا اور سیدھا پتھر گڑھ کے قلعے میں آگیا۔ یہاں تانگے سے اترا اور قلعے کے پیچھے کجلی بن کا جو جنگل مجھے بتایا گیا تھا اس طرف چل پڑا۔ قلعہ پتھر گڑھ کے پیچھے گھنے جنگل شروع ہو گئے۔ میں وہیں ایک طرف درختوں کے نیچے چھوٹی سی پلی بنی ہوئی تھی وہاں بیٹھ گیا۔ میں یونہی اتنے خطرناک اور گھنے جنگلوں میں داخل نہیں ہونا چاہتا

تھا۔ وہاں بھٹکے جانے کا ڈر تھا۔ ایک پوربی کسان سر پر درختوں کی ٹہنیاں لادے میرے قریب سے گزرا تو میں نے اس سے کجلی بن کے بارے میں پوچھا تو وہ رک گیا اور ایک طرف اشارہ کر کے بولا۔

"ادھر کو جاؤ گے تو ایک ندیا آئے گی ندیا کے پار کجلی بن شروع ہو جاتا ہے۔"

میں اٹھ کر اسی طرف چلنے لگا۔ اس جنگل کی دہشت کے بارے میں میں نے بہت کچھ سن رکھا تھا۔ آپ نے بھی ضرور سنا ہو گا۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ اماوس کی رات کو یعنی جو مہینے کی سب سے زیادہ اندھیری رات ہوتی ہے اس رات کو جب کجلی بن پر بھیانک خاموشی طاری ہوتی ہے تو کوئی بلا ڈراؤنی آوازیں دیتی جنگل میں نمودار ہوتی ہے۔ اس کی آواز سے ڈر کر درختوں پر پرندے اور کچھاروں میں شیر تک سہم جاتے ہیں۔ یہ بلا سارے جنگل میں آوازیں دیتی پھرتی ہے۔ اگر کوئی بھولا بھٹکا انجان مسافر اس کی آواز پر جواب دے دے تو یہ اسی وقت وہاں پہنچ کر اس انسان کو ہڑپ کر جاتی ہے۔ کہتے ہیں کہ اس بلا کو دنیا کے سارے انسانوں کے نام معلوم ہیں اور وہ ان کے نام لے لے کر ان کی جانی پہچانی آوازوں میں اپنی طرف بلاتی ہے۔

مگر مجھے اپنے اللہ پر بھروسہ تھا۔ میرا ایمان چٹان کی طرح مضبوط تھا اور مجھے یقین تھا کہ دنیا کی کوئی بلا مجھے کچھ نہیں کہہ سکتی۔ میں کجلی بن میں داخل ہو چکا تھا۔ یہ تمام توہمات میرے ذہن میں تھے اور میں اس بلا کا مقابلہ کرنے کو تیار تھا۔ مگر نہ تو وہ رات کا وقت تھا اور نہ اماوس کی رات تھی۔ وہ دن کا تیسرا پہر تھا اور کجلی بن کی بلا کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ صرف اماوس کی تاریک رات کو ہی نمودار ہوتی ہے۔ لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ کجلی بن کا جنگل واقعی بڑا ڈراؤنا تھا۔ ایسے ایسے درخت تھے کہ جن کو دیکھ کر جن بھوتوں کا خیال آتا تھا۔ ان درختوں پر کانٹے دار بیلیں چڑھی ہوئی تھیں۔ اگرچہ دن کا وقت تھا مگر ان درختوں کا گھنا پن اتنا شدید تھا کہ ان کی شاخوں پر آکر دن کی روشنی رک جاتی تھی اور درختوں کے نیچے سارے جنگل میں اندھیرا چھایا ہوا تھا۔

بہر حال میں کسی نہ کسی طرح راستہ بناتا کجلی بن کے جنگل میں کافی دور نکل گیا۔ مجھے

اس پہاڑی کی تلاش تھی جس کی چوٹی پر دو سرخ چٹانیں ساتھ ساتھ کھڑی تھیں۔ اور جسے لال پہاڑی کہا جاتا تھا۔ مغل شہزادے کی روح نے کہا تھا کہ اس پہاڑی کے پیچھے ایک جگہ شہید خاتون کی قبر ہے۔ اس قبر پر جا کر مجھے فاتحہ پڑھنا تھا اس دوران دوبار میری آنکھوں کی بینائی پر چندریکا کی بدروح کا حملہ ہوا اور مجھے نظر آنا بند ہو گیا۔ میں کچھ دیر کے لئے وہیں بیٹھ جاتا اور جب بینائی واپس آتی تو اٹھ کر چلنے لگتا۔ یہ ایسی آفت تھی کہ اس کا میرے پاس کوئی علاج نہیں تھا اور یہ ناگہانی آفت میرے کمانڈو مشن کو تباہ و برباد کر سکتی تھی۔

جب میں کجلی بن کے گھنے درختوں میں سے باہر نکلا تو مجھے ایک طرف چھوٹی سی پہاڑی نظر آئی جس کے اوپر دو مخروطی چٹانیں بالکل ساتھ ساتھ کھڑی تھیں میں ٹھیک منزل پر پہنچ گیا تھا۔ اس پہاڑی کے پیچھے کسی جگہ شہید خاتون کی قبر کے بارے میں مجھے بتایا گیا تھا مجھے اس کی تلاش تھی۔ میں چلتے چلتے پہاڑی کے پیچھے آگیا۔ یہاں زمین اونچی نیچی تھی اونچی اونچی گھاس جگہ جگہ اگی ہوئی تھی۔ میں نے نسواری رنگ کی بڑی بڑی چٹانوں کے درمیان ایک چشمہ بہتے دیکھا۔ چشمے پر آکر میں نے منہ ہاتھ دھویا۔ وضو کیا کیونکہ مجھے شہید خاتون کی قبر تلاش کر کے فاتحہ پڑھنا تھا۔ یہاں درخت دور دور تھے اور زمین خالی تھی۔ سوائے گھاس اور بکھرے ہوئے پتھروں کے اور کچھ نہیں تھا۔ میں بڑے غور سے چاروں طرف دیکھتا شہید خاتون کی قبر کو تلاش کرتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ مجھے ایک جگہ بانس اور مہوا کے درختوں کے نیچے زمین میں سے دو تین ابھرے ہوئے پتھر نظر آئے۔ میں قریب گیا۔ یہ پتھر اس ترتیب سے لگے تھے جیسے یہاں کسی کو دفن کر کے مرقد بنا دیا گیا ہو۔ سب نشانیاں مجھے مل گئی تھیں۔ مجھے یقین ہو گیا کہ یہی شہید خاتون کی قبر ہے۔

میں قبر کے پہلو میں ایک طرف ہو کر بیٹھ گیا اور دعائے فاتحہ کے لئے ہاتھ اٹھائے۔ فاتحہ پڑھ کر شہید کی روح کے درجات کی بلندی کے لئے دعا مانگی اور اسی جگہ خاموش بیٹھا رہا۔ مغل شہزادے کی روح نے ہدایت کی تھی کہ قبر پر فاتحہ پڑھنے کے بعد کچھ دیر بیٹھنا

دن کی روشنی بادلوں کے پیچھے آہستہ آہستہ ماند پڑ رہی تھی۔ سورج غروب ہو رہا تھا۔ کجلی بن کی طرف سے درختوں پر پرندوں کے بولنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ اچانک بوندیں پڑنے لگیں۔ بارش دوبارہ شروع ہو گئی۔ میں اٹھ کر درخت کے نیچے آگیا۔ یہاں بارش سے بچاؤ ہو سکتا تھا۔ درخت کی شاخوں اور پتوں پر بارش کی بوندیں گرنے سے ٹپ ٹپ کی آوازیں آرہی تھیں۔ پھر یہ آوازیں تیز ہو گئیں۔ اب بارش کے قطرے مجھ پر بھی گرنے لگے تھے۔ میں نے ادھر ادھر دیکھا کہ کوئی ایسی جگہ مل جائے جہاں تھوڑی دیر کے لئے بارش سے بچاؤ کیا جا سکے۔ دائیں جانب کوئی چھ قدموں کے فاصلے پر مجھے درختوں کے نیچے ایک جھونپڑی سی نظر آئی۔ میں دوڑ کر وہاں پہنچ گیا۔ یہ جھونپڑی ناریل اور بانس کی شاخوں کو جوڑ کر بنائی گئی تھی اور بالکل خالی پڑی تھی۔ میں جھونپڑی میں زمین پر بیٹھ گیا۔ جھونپڑی کی بانس اور ناریل کی شاخوں والی چھت پر بارش کے گرنے کی آواز آرہی تھی۔ بارش زیادہ تیز نہیں تھی۔ یعنی موسلادھار نہیں ہو رہی تھی۔ پرندوں کی آوازیں اب خاموش ہو گئی تھیں۔ جھونپڑی کا دروازہ نہیں تھا۔ یہاں سے مجھے شہید خاتون کی قبر کے ابھرے ہوئے پتھر دکھائی دے رہے تھے۔

میں ان پتھروں کو بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔ میرا خیال تھا کہ اگر یہ شہید خاتون کی قبر ہے تو یہاں سے اس کی روح ضرور اٹھے گی۔ مگر یہ میرا خیال غلط تھا۔ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی راہ میں شہید ہونے والے شہداء کی ارواح کے مقام بہت بلند ہوتے ہیں۔ ان کے درجات بہت بلند ہوتے ہیں۔ دنیا سے رخصت ہونے کے بعد ان کی روحیں سیدھی جنت میں چلی جاتی ہیں۔ لیکن چونکہ میں کفار کے خلاف جہاد میں شریک تھا اور مجھ پر جو ناگہانی آفت آئی تھی اس سے میں صرف اپنے لئے نجات حاصل نہیں کرنا چاہتا تھا۔ بلکہ اس لئے نجات حاصل کرنا چاہتا تھا کہ میں صحت مند ہو کر دوبارہ تحریک آزادی کشمیر کے جہاد میں شریک ہو سکوں اور بھارتی غاصب فوج مظلوم کشمیریوں کا حق خود اختیاری دبا کر ان پر جو ظلم و ستم توڑ رہی ہے اس کے خلاف بطور ایک کمانڈو کے جنگ کر سکوں۔

اس میں میری ذاتی غرض نہیں تھی۔ اس لئے خیال تھا کہ شاید شہید خاتون کی روح اسلام اور مظلوم کشمیریوں کے خیال سے مجھ سے ہم کلام ہونے جنت سے نیچے ہماری دنیا میں تھوڑی دیر کے لئے آجائے۔ اور ایسا ہی ہوا۔ میں جھونپڑی کے دروازے میں سے قبر کے پتھر کو دیکھ رہا تھا کہ اچانک میری آنکھوں کے آگے ایک بار پھر اندھیرا چھا گیا۔ چندریکا کی بدروح نے ایک بار پھر حملہ کر دیا تھا۔ مجھے نظر آنا بند ہو گیا۔ میں نے آنکھیں بار بار جھپکا کر دیکھنے کی بہت کوشش کی مگر سوائے اندھیرے کے میری آنکھوں میں اور کچھ نہیں تھا۔ میں بے بس و مجبور ہو کر سر جھکا کر بیٹھا خدا کو یاد کرنے اور اپنی مغفرت کے لئے اس کے حضور دعائیں مانگنے لگا۔ مجھے صرف بارش کی آواز آرہی تھی۔ میں بارش کو دیکھ نہیں سکتا تھا۔ میرے لئے چاروں طرف تاریک رات ہو گئی تھی۔ حالانکہ ابھی جنگل میں دن کی صاف شفاف روشنی باقی تھی۔

مجھ پر اندھے پن کی یہ حالت کوئی گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے تک رہی پھر اچانک مجھے نظر آنا شروع ہو گیا۔ میں نے دیکھا کہ جنگل میں دن کی روشنی شام کے سرمئی اندھیروں میں گھل مل گئی ہے۔ بارش ہو رہی تھی۔ قریب ہی کوئی تالاب وغیرہ ہو گا۔ وہاں سے ایسی آواز آرہی تھی جیسے کوئی جنگلی جانور وہاں پانی پی رہا ہو۔ اب مجھے قبر کے پتھر بالکل نظر نہیں آرہے تھے کیونکہ درختوں کے نیچے قبر پر اندھیرا چھا گیا ہوا تھا۔ بارش پہلے سے زیادہ تیز ہو گئی تھی۔ میں نے سوچا اگر بارش اسی طرح موسلا دھار ہوتی رہی اور خاتون شہید کی روح کی جانب سے مجھے کوئی راہ نمائی بھی نہ ملی تو مجھے ساری رات اس جھونپڑی میں ہی گزارنی ہو گی۔ اتنی موسلا دھار بارش میں اور بارش کے بعد بھی میں کجلی بن کے دہشت ناک اور خطرناک اندھیروں میں سے نہیں گزرنا چاہتا تھا۔

دیکھتے دیکھتے شام اور پھر رات ہو گئی۔ میں جھونپڑی کے اندر ہی بیٹھا رہا۔ کچھ خبر نہیں تھی کہ رات کتنی گزر گئی ہے۔ بارش آہستہ آہستہ ہلکی ہونے لگی۔ پھر رک گئی۔ اب صرف درختوں پر سے بارش کے رکے ہوئے قطروں کے ٹپکنے کی آوازیں کبھی کبھی سنائی دے جاتی تھیں۔ کچھ وقت گزر جانے کے بعد یہ آواز بھی رک گئی۔ جنگل پر ایک

بھیانک خاموشی چھا گئی۔ میں شہید خاتون کی راہنمائی کی جانب سے مایوس ہو چکا تھا۔ لیکن میری نظریں قبر کی جانب لگی تھیں۔ مجھے رات کے اندھیرے میں صرف درختوں کے سائے سے ہی نظر آرہے تھے۔ اچانک چندریکا کی بدروح کی لائی ہوئی آفت نے پھر حملہ کر دیا اور مجھے درختوں کے سائے سے نظر آنا بھی بند ہو گئے۔ میری آنکھوں کی بینائی ایک بار پھر معطل ہو گئی تھی۔ میں قدرتی طور پر پریشان ہو کر جھونپڑی میں اٹھ کھڑا ہوا۔ سر باہر نکال کر دیکھنے کی کوشش کی مگر گھپ اندھیرے کے سوا کچھ نظر نہ آیا۔ آنکھوں کی روشنی جاتی رہی تھی۔ وقتی طور پر ہی سہی لیکن میں نے محسوس کیا تھا کہ اب میری بینائی کے معطل ہو جانے کا وقفہ زیادہ ہوتا جا رہا تھا۔ پہلے پندرہ بیس منٹ بعد بینائی واپس آجاتی تھی۔ ایک گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے بعد واپس آتی تھی۔ کچھ پتہ نہیں تھا کہ اگر یہ سلسلہ جاری رہا تو ایک وقت وہ بھی آجائے گا کہ میری بینائی ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائے۔ دراصل چندریکا کی بدروح اس طرح میری تمام کمانڈو سرگرمیوں کو ختم کر دینا چاہتی تھی۔ جو مجھے کسی صورت میں بھی گوارا نہیں تھا۔

میں مایوس سا ہو کر جھونپڑی میں بیٹھ گیا اور خدا کے حضور اس آفت سے نجات کی دعائیں مانگنے لگا۔ رات گزرتی جا رہی تھی۔ پھر ایسا ہوا کہ مجھے اندھیرے میں درختوں کے دھبے نظر آنا شروع ہو گئے۔ میری بینائی ایک بار پھر واپس آنا شروع ہو گئی تھی۔ اس دفعہ میرے قیاس کے مطابق بینائی کو واپس آنے میں کچھ نہیں تو دو گھنٹے ضرور لگے تھے۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا اور سوچنے لگا کہ شہید خاتون کی روح کی جانب سے مجھے کوئی راہ نمائی نہیں ملی۔ اس لئے اب مجھے یہاں سے واپس سری نگر جا کر اپنی آنکھوں کا ڈاکٹری علاج کروانا چاہئے۔ ہو سکتا ہے ڈاکٹری علاج سے میں ٹھیک ہو جاؤں۔ نیند بالکل غائب تھی۔ پھر بھی محض تھوڑا آرام کرنے کی غرض سے میں نے جھونپڑی کی بانس کی دیوار سے ٹیک لگا دی۔ جنگل خاموش تھا۔ کسی پرندے جھینگر مینڈک یا درندے کی آواز بھی نہیں آرہی تھی۔ میں بانس کی دیوار سے ٹیک لگائے جھونپڑے کے کھلے دروازے میں سے باہر اندھیرے میں درختوں اور چٹانوں کے ہیولوں کو تک رہا تھا کہ اچانک مجھے ایک خوشبو کا

احساس ہوا۔ میں نے دیوار سے ٹیک ہٹالی۔ یہ خوشبو چنبیلی کے پھولوں ایسی خوشبو تھی۔ میری آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ یہ میری شہید بہن کلثوم کی روح کی خوشبو تھی جیسے سن 47ء کے فسادات میں سکھوں نے میری آنکھوں کے سامنے گردن پر تلوار مار کر شہید کر دیا تھا۔ میری بہن کلثوم سر میں چنبیلی کا تیل لگایا کرتی تھی۔ آپ پڑھ چکے ہیں کہ اس کی روح جب کبھی میرے پاس آتی تو پہلے چنبیلی کے پھولوں کی خوشبو آتی تھی۔ اگرچہ میری شہید بہن کی روح نے مجھ سے کبھی کوئی بات نہیں کی تھی مگر جب وہ آتی تو اس کی روح کی خوشبو سے میرے دل کو بڑی تسکین ہوتی تھی۔ مگر اپنی شہید بہن کی کھیتوں میں پڑی کٹی ہوئی گردن والی لاش کو یاد کر کے میری آنکھوں میں آنسو بھی آجاتے تھے۔ میں نے کلثوم سے کہا۔

"میری پیاری شہید بہن! تیرا بھائی تجھے کبھی نہیں بھول سکتا۔ میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ جنت الفردوس میں تیری روح کے درجات بلند کرے۔"

چنبیلی کی خوشبو تیز ہو کر آہستہ آہستہ غائب ہو گئی اور اس کی جگہ ایک بالکل نئی خوشبو محسوس ہونے لگی۔ یہ اجنبی خوشبو تھی اور اس سے پہلے میں نے اسے کبھی محسوس نہیں کیا تھا۔ اس خوشبو کے آنے کے ساتھ ہی جھونپڑی میں گلاب ایسے رنگ کی مدھم مدھم نورانی روشنی سی پھیل گئی۔ یہ روشنی نہیں تھی بلکہ روشنی کا غبار تھا۔ یا پھر روشنی کا عکس تھا۔ میں فوراً سمجھ گیا کہ یہ شہید خاتون کی روح کی خوشبو اور روشنی ہے۔ میں سنبھل کر بیٹھ گیا اور دل میں کلمہ شریف پڑھنے لگا۔ جھونپڑی ایک نورانی روشنی میں منور ہو رہی تھی۔ فضا جنت کی خوشبو سے لبریز تھی۔ مگر مجھے شہید خاتون کی روح کہیں دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ میں اپنے اندر اتنی ہمت نہیں پا رہا تھا کہ میں شہید خاتون کی روح کو مخاطب کر سکوں۔ ایک عجیب سا جلال جھونپڑی کی نورانی فضا میں طاری تھا۔ میں ہونٹ بند کئے ادب سے بیٹھا اپنے دل میں برابر کلمہ شریف کا ورد کر رہا تھا۔

اچانک مجھے اپنے کانوں میں ایک آواز محسوس ہوئی۔ یہ بڑی پرسکون اور دل میں نور بن کر اتر جانے والی آواز تھی۔ آواز جیسے بڑی دور سے آ رہی تھی مگر مجھے یہ آواز اور اس

کا ایک ایک لفظ بڑا صاف سنائی دے رہا تھا۔ یہ یقیناً شہید خاتون کی روح کی آواز تھی۔

"تم اللہ کی راہ میں جہاد کرنے گھر سے نکلے ہو۔ تم اسلام کی سربلندی کشمیر کی آزادی اور پاکستان کی سلامتی کے نیک مقاصد دل میں لے کر یہاں آئے ہو۔ اللہ کی جانب سے مجھے حکم ملا ہے کہ میں تمہاری راہنمائی کروں۔"

میری آنکھیں شدت جذبات سے بھر آئیں۔ میں نے کپکپاتے ہوئے ہونٹوں سے کہا۔

"میری جان اللہ اور رسول ﷺ کے نام پر ہزار بار قربان۔ لاکھ بار قربان میں اس قابل کہاں تھا کہ ایک شہید کی مقدس روح اللہ کے حکم سے میری راہنمائی کو آتی۔ مگر یہ توفیق بھی میرے رب نے مجھے عطا کی ہے۔ میں اپنی خوش بختی پر جس قدر ناز کروں کم ہے۔ اے مقدس اور برگزیدہ روح! مجھ پر دشمن اسلام چندریکا نے ایک آفت نازل کر دی ہے"

شہید خاتون کی روح نے آہستہ سے کہا۔

"تمہیں یہ سب بتانے کی ضرورت نہیں۔ ہمیں سب معلوم ہے۔ میں تمہاری راہنمائی کے لئے ہی یہاں بھیجی گئی ہوں۔ میری بات غور سے سنو۔ تم پر جو آفت نازل ہو چکی ہے اس کا علاج اللہ کا ایک برگزیدہ پیغمبر کرے گا۔"

میں یہ سن کر حیران ہو گیا۔ میں نے کہا۔

"اے مقدس روح! زمین پر نبی آخر الزماں ﷺ کی تشریف آوری کے ساتھ ہی پیغمبروں کی آمد کا سلسلہ اللہ کی طرف سے بند ہو گیا ہے۔ یہ برگزیدہ پیغمبر مجھے کہاں ملے گا؟"

شہید خاتون کی آواز آئی۔

"بے شک حضور اکرم ﷺ اللہ تعالیٰ کی طرف سے زمین پر بھیجے گئے آخری نبی تھے۔ ان کے بعد زمین پر کوئی پیغمبر نہیں آئے گا۔ جس برگزیدہ پیغمبر کا میں نے ذکر کیا ہے اس سے ملنے کے لئے تمہیں ماضی کے زمانے میں آج سے چار ہزار سال پیچھے جانا ہو گا۔"

میری زبان پر جیسے خاموشی کی مہر سی لگ گئی۔ یہ بات میری سمجھ میں بھی آ ہی نہیں سکتی تھی کہ کوئی انسان ماضی کے زمانے میں بھی جا سکتا ہے۔ اور پھر کوئی سال دو سال ماضی کے زمانے میں نہیں بلکہ چار ہزار سال پیچھے۔ شہید خاتون نے کہا۔

"حضور اکرم ﷺ کے تشریف لانے سے پہلے اللہ کی طرف سے زمین پر کئی پیغمبر بھیجے گئے تاکہ وہ انسانوں کو برائیوں سے بچنے اور اللہ کے راستے پر چلنے کی تلقین کریں۔ یہ پیغمبر بھی ماضی کے زمانے میں اللہ کے بھیجے ہوئے پیغمبروں میں سے ایک پیغمبر تھے۔ ان کی ایک خاص بات یہ تھی کہ انہوں نے اپنی امت کو حضور پاک ﷺ نبی آخر الزماں کے دنیا میں تشریف لانے کی بشارت بھی دی تھی۔ اور کہا تھا کہ حضور پاک ﷺ کے تشریف لانے کے ساتھ ہی اللہ کا دین دنیا پر مکمل ہو جائے گا۔ تمہاری آفت کا علاج انہی برگزیدہ پیغمبر کے پاس ہے"

میں نے حیرت کے عالم میں پوچھا۔

"لیکن اے مقدس روح! میں آج سے چار ہزار سال ماضی کے زمانے میں کیسے جاؤں گا؟ یہ بات میری عقل سے باہر ہے"

مقدس روح نے کہا۔

"اللہ ہر شے پر قادر ہے۔ تم اللہ کے حکم سے ماضی کے زمانے میں جاؤ گے۔ سنو۔ یہاں سے تم شہید اسلام نجیب الدولہ کے بنائے ہوئے پتھر گڑھ کے قلعے میں جاؤ گے۔ وہاں تم سارا دن گزارو گے۔ قلعے کی چوتھی برجی کے نیچے ایک پرانا دروازہ ہے جو ہمیشہ بند رہتا ہے۔ تم رات کے وقت اس دروازے کے پاس جا کر کھڑے ہو جانا اور دل میں پانچ بار اللہ تعالیٰ کا کلمہ پاک دہرانا۔ وہاں تمہیں ایک بزرگ ملیں گے۔ تمہارے ماضی کے سفر کا انتظام ان ہی بزرگ کو سونپا گیا ہے۔ تم پر اللہ کی رحمت ہو"

اس کے ساتھ ہی جھونپڑی میں پھیلی ہوئی روشنی کا غبار ہلکا ہوتے ہوئے غائب ہو گیا۔ جنت کی خوشبوئیں بھی رخصت ہو گئیں۔ جھونپڑی میں ایک بار پھر اندھیرا چھا گیا۔ شہید خاتون کی روح کی ایک ایک بات میرے دل پر نقش ہو گئی تھی۔ لیکن ہزار بار سوچنے

کے بعد بھی میں اس معمے کو حل نہ کر سکا کہ میں ماڈرن اور سائنسی دور میں سے نکل کر ماضی کے زمانے میں کیسے پہنچوں گا۔ مجھے یقین تھا کہ جو بزرگ مجھے قلعہ پتھر گڑھ کی تیسری برجی کے دروازے پر ملے گا وہی مجھے میرے مصیبت کا علاج بتا دے گا۔ مگر شہید کی روح کبھی غلط بیانی نہیں کر سکتی تھی۔

میں نے رات کا باقی حصہ وہیں جھونپڑی میں ہی گزارا اور جب دن کی روشنی چاروں طرف پھیل گئی اور درختوں پر پرندے اللہ پاک کی حمد وثناء کرنے لگے تو میں جھونپڑی سے نکل کھڑا ہوا۔ مجھے ایک بار پھر کجلی بن میں سے گزر کر نجیب آباد کے مشہور تاریخی قلعہ پتھر گڑھ میں جانا تھا۔ کجلی بن میں جس راستے سے آیا تھا اسی راستے پر چل کر میں واپس اس سڑک پر آ گیا جس کی ایک جانب پتھر گڑھ کے دیو پیکر عظیم الشان قلعے کی عقبی دیوار تھی۔ یہ دیوار ایک پہاڑی کی طرح اوپر ہی اوپر اٹھتی چلی گئی تھی۔ دیوار اور سڑک کے درمیان ایک کھائی تھی جس میں پانی کی بجائے جھاڑیاں اگی ہوئی تھیں۔ سڑک رات بھر کی بارش سے بھیگی ہوئی تھی۔ دو رکشے اور ایک موٹر گاڑی میرے قریب سے گزر گئی۔ میں سڑک کے کنارے کنارے قلعے کے بڑے گیٹ کی طرف چلا جا رہا تھا۔ ایک جگہ سڑک کے کنارے چائے سگریٹ کی چھوٹی سی دکان تھی جس کے باہر پولیس کا ایک سپاہی جو وردی میں تھا سٹول پر بیٹھا گلاس میں چائے پی رہا تھا۔

اس کا منہ میری طرف تھا۔ میرا رخ بھی اس کی طرف تھا۔ مجھے لامحالہ اس کے قریب سے ہو کر گزرنا تھا۔ میں نے اس کا زیادہ خیال نہ کیا۔ کیونکہ میرے سارے کمانڈو آپریشنز نجیب آباد شہر سے دور دور ہوئے تھے۔ میں نے یہی سوچا کہ یہاں کی پولیس کو میرے بارے میں کچھ معلوم نہیں ہو گا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ میری تصویر نجیب آباد کے پولیس ہیڈ کوارٹر میں بھی پہنچ چکی ہے۔ دن کا وقت تھا۔ میں پولیس کانسٹیبل کے قریب سے گزرا تو اس نے چائے پیتے ہوئے مجھے بڑے غور سے دیکھا۔ اچانک مجھے احساس ہوا کہ یہ شخص مجھے پہچاننے کی کوشش کر رہا ہے۔ میرا حلیہ کافی بدلا ہوا تھا۔ بال اور ڈاڑھی بڑھی ہوئی تھی۔ پھر بھی ایک تجربہ کار پولیس کانسٹیبل جس نے میری ڈاڑھی کے بغیر تصو

دیکھ رکھی ہو مجھے پہچان سکتا تھا۔

میرے قدم خود بخود تیز ہو گئے۔ قلعہ پتھر گڑھ کا اونچا محرابی دروازہ میری بائیں جانب تھوڑے فاصلے پر ہی تھا۔ میں نے دیکھا کہ اس قلعے کے دروازے کے باہر پولیس اور ملٹری پولیس کی دو گاڑیاں کھڑی تھیں۔ خدا جانے یہاں کیا ہو رہا تھا۔ لیکن میں محتاط ہوگیا۔ چنانچہ میں قلعے کے دروازے کی طرف جانے کی بجائے نجیب آباد شہر کی آبادی کی طرف جاتی سڑک پر ہوگیا۔ چند قدم چلنے کے بعد ہی میری چھٹی حس نے مجھے بتادیا کہ میں نگاہوں میں آگیا ہوں اور میرا پیچھا کیا جا رہا ہے۔ پیچھے مڑ کر دیکھنا تعاقب کرنے والے کے شک شبے کو یقین میں بدلنے کے برابر تھا۔ میں سڑک کے کنارے چلتا گیا۔ کچھ فاصلے پر شہر کی آبادی نظر آرہی تھی۔ یہ نجیب آباد کے قدیم تاریخی شہر کی آبادی تھی۔ جسے اسلام کے سرفروش شہید اور مجاہد نواب نجیب الدولہ نے آباد کیا تھا۔ میں ایک بڑی سڑک پر آگیا۔ یہ شہر کے باہر کا سول ایریا تھا۔ یہاں انگریزوں کے زمانے کی پرانی کوٹھیاں بھی تھیں جن کے آگے چھوٹے چھوٹے باغیچے تھے اور کچھ نئی طرز کی کمرشل اور رہائشی عمارتیں بھی نظر آرہی تھیں۔

اس سڑک پر آتے ہوئے میں نے سڑک پار کرنے کے بہانے پیچھے مڑ کر دیکھا تو مجھے وہی کانسٹیبل دکھائی دیا جسے میں نے چائے کی دکان کے باہر سٹول پر بیٹھے چائے پیتے دیکھا تھا۔ میری تیز نگاہوں نے کانسٹیبل کے عقب میں سڑک پر پولیس کی گاڑی کو دیکھا جو آہستہ آہستہ چلی آرہی تھی۔ گویا مجھے پکڑنے کے لئے سارا انتظام کرلیا گیا تھا۔ اب صرف مجھے موقع پا کر دبوچنا ہی باقی تھا۔ ادھر مجھے یہ فکر بھی لگی ہوئی تھی کہ اگر اس حالت میں اچانک مجھ پر بدروح کا حملہ ہوگیا اور میری بینائی معطل ہوگئی تو پھر کیا ہوگا؟ اس کے بعد تو مجھے کچھ بھی دکھائی نہ دیتا۔ میں کسی طرف فرار بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ خدا کا شکر تھا کہ ابھی تک میری بینائی کام کر رہی تھی۔ لیکن یہ کسی بھی وقت میری آنکھوں کے آگے گھپ اندھیرا کر کے میرا ساتھ چھوڑ سکتی تھی۔ میرا ایک ہاتھ پتلون کی جیب میں تھا۔ اسی جیب میں بال پوائنٹ پستول بھی تھا۔ میں نے بال پوائنٹ کو اپنی گرفت میں لے رکھا تھا۔

اس کی سائی نائیڈ زہر میں بجھی ایک سوئی بال پوائنٹ کے منہ میں آچکی تھی۔ اب صرف مجھے بال پوائنٹ کے خفیہ بٹن کو ہی دبانا تھا۔

میں سڑک کراس کر کے دوسری طرف فٹ پاتھ پر آگیا۔ یہاں بس سٹاپ پر کچھ لوگ کھڑے بس کا انتظار کر رہے تھے۔ میں بھی وہاں کھڑا ہوگیا۔ دراصل میں پیچھے ایک نظر دیکھنے کی خاطر رکا تھا۔ میں نے دیکھا کہ کانسٹیبل بھی مجھے رکتے دیکھ کر رک گیا تھا۔ پیچھے جو پولیس کی گاڑی آرہی تھی وہ آہستہ آہستہ سڑک کے کنارے کنارے چلی آرہی تھی۔ کسی طرح ان لوگوں کی نظروں سے روپوش ہوجانا اب ضروری ہوگیا تھا۔ میرے پاس اتنا وقت نہیں رہ گیا تھا۔ میری بینائی بھی اب کسی وقت مجھ سے جدا ہوسکتی تھی۔ میں نے دیکھا کہ یہ ایک کمرشل ایریا تھا۔ سڑک سے ہٹ کر کمرشل عمارتیں تھیں جن کے باہر سکوٹر اور گاڑیاں وغیرہ کھڑی تھیں۔ لوگ بھی ادھر ادھر آجا رہے تھے۔

میں بس سٹاپ کو چھوڑ کر ان عمارتوں کی طرف ہوگیا۔ یہاں لوگوں کے ہجوم اور شاپنگ سنٹر اور سٹورز وغیرہ کے درمیان سے گزرتی راہ داریوں میں میں روپوش ہو سکتا تھا۔ اچانک میری آنکھوں پر کچھ بوجھ سا پڑنے لگا۔ اب ایسا ہوتا تھا کہ اندھا ہونے سے پہلے میری آنکھوں پر ہلکا ہلکا دباؤ پڑنا شروع ہوجاتا تھا۔ میں پریشان ہوگیا۔ میرے اندھے ہونے کا وقت ایک بار پھر آن پہنچا تھا۔ میں نے سامنے والی عمارتوں کا جائزہ لیا تاکہ اندھا ہونے سے پہلے پہلے یہ تعین کرلوں کہ مجھے اندازے سے کس طرف کو بھاگنا ہوگا۔ سامنے سٹوروں کے درمیان ایک چھتا ہوا راستہ اس کمرشل بلڈنگ کے اندر جاتا تھا۔ میں دوڑ کر وہاں آگیا۔ راہ داری میں دونوں جانب دکانیں تھیں۔ میں نے ایک نظر پیچھے دیکھا۔ پولیس کانسٹیبل بھی دوڑ کر عمارت میں داخل ہو رہا تھا۔ میں دوڑنے کی بجائے تیز تیز چلنے لگا۔ یہاں کچھ لوگ خرید و فروخت میں مصروف تھے ان میں عورتیں بھی تھیں۔ میری آنکھوں کے آگے تارے ناچنے لگے۔ میری بینائی رخصت ہونے ہی والی تھی۔ میرا خیال تھا کہ میں دوسری طرف کسی بلڈنگ میں نکل جاؤں گا مگر آگے راستہ بند تھا۔ اور ایک ڈور تھا جس کے باہر آنکھوں کا ہسپتال کا بورڈ لگا تھا۔ میں اس کے اندر گھس گیا اب مجھے

بہت دھندلا دھندلا نظر آرہا تھا۔ یہ نظر کی عینکوں کا سٹور تھا۔ کاؤنٹر پر ایک آدمی کھڑا کسی عورت کی نظر ٹیسٹ کر رہا تھا۔ اس میں سے ایک راستہ باہر کو جاتا تھا۔ میں تیز تیز قدم چلتا باہر نکل گیا۔ باہر ایک جانب ایک ایمبولینس کھڑی تھی۔ میں دوڑ کر اس میں جا بیٹھا۔ ڈرائیور تھوڑی دیر کے لئے شاید کہیں گیا تھا اور گاڑی کی چابی لگی ہوئی تھی۔ میں نے جلدی سے چابی گھمائی۔ انجن سٹارٹ کیا اور گیئر لگا کر تیزی سے گاڑی کو کمرشل بلڈنگ کے عقبی احاطے سے باہر جاتی سڑک پر ڈال دیا۔ جیسے ہی میں گاڑی لے کر سڑک پر آیا۔ میری آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا۔

اس سے پہلے میں نے سڑک کا جائزہ لے لیا تھا۔ آخری منظر جو میری آنکھوں نے دیکھا وہ یہ تھا کہ سڑک پر سامنے کی طرف سے ایک ٹرک آرہا تھا۔ یہ بڑا خوفناک منظر تھا میں اندھا ہو چکا تھا اور جب اندھا گاڑی چلا رہا ہو اور سامنے سے ایک ٹرک آرہا ہو تو اس کا جو انجام ہوتا ہے اس کا آپ بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں۔ اسی دوران مجھے پیچھے سے پولیس کی گاڑی کے ہوٹر کی آوازیں بھی آنے لگیں۔ میں اندازے سے گاڑی سڑک کی ایک طرف لے گیا اور بریک لگادی۔ بریکیں لگاتے لگاتے میری ایمبولینس گاڑی ایک درخت سے ٹکرا گئی۔ یہ زیادہ زور سے نہیں ٹکرائی تھی۔ میں نے صرف اتنا کام کیا کہ جیب سے بال پوائنٹ پستول نکال کر اپنے جوتے کے اندر چھپا دی تا کہ تلاشی لیتے وقت کوئی پولیس والا بال پوائنٹ مال غنیمت سمجھ کر اسے اپنی جیب میں نہ لگالے۔ پولیس کی گاڑی کی چیخیں میری گاڑی کے قریب آکر رک گئیں۔ سپاہیوں کی آوازیں آنے لگیں۔ پھر کسی نے ایمبولینس کا دروازہ کھول کر مجھے کھینچ کر باہر نکال لیا۔ مجھے کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ ابھی تک نجیب آباد کے ان پولیس والوں کو بھی معلوم نہیں ہوا تھا کہ میں اندھا ہوں۔ کسی نے بارعب آواز میں مجھ سے پوچھا۔

"تیرا نام کیا ہے؟"

میں نے اپنا ہندوانہ فرضی نام بتادیا۔ ایک آدمی دونوں ہاتھوں سے میری تلاشی لے رہا تھا۔ اس نے میری جیب سے روپے وغیرہ نکال لئے تھے۔ پہلی والی بارعب آواز نے

کہا۔

"چلو آگے چلو"

میں ایک طرف چلا تو کسی نے مجھے بازو سے پکڑ کر سیدھا کر کے کہا۔

"ادھر کہاں جا رہے ہو۔ ادھر چلو"

تب میں نے کہا۔

"بھائیو! مجھے کیوں پریشان کر رہے ہو۔ میں تو اندھا ہوں۔ ڈاکٹر صاحب کے پاس آنکھوں کے علاج کے لئے آیا تھا۔"

وہاں ایک لمحے کے لئے خاموشی چھا گئی۔

"اندھے ہو تو گاڑی کیسے چلا رہے تھے؟"

"یہ جھوٹ بکتا ہے۔ اسے سب کچھ نظر آرہا ہے"

"اسے پولیس ہیڈ کوارٹر لے چلو"

مجھے ایک گاڑی میں بٹھا دیا گیا۔ میں دل میں خدا کا شکر ادا کر رہا تھا کہ ابھی تک کسی نے میرے جوتے میں سے بال پوائنٹ پستول نہیں نکالا تھا۔ خدا جانے کہاں کہاں سے ہو کر گاڑی ایک جگہ رک گئی۔ یہ پولیس سٹیشن یا پولیس ہیڈ کوارٹر ہی ہو سکتا تھا۔ مجھے تو کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ دو آدمیوں نے مجھے بازوؤں سے پکڑ رکھا تھا۔ مجھے دوسرے لوگوں کی آوازیں بھی سنائی دے رہی تھیں۔ تین چار سیڑھیاں چڑھنے کے بعد مجھے ایک جگہ دھکیل کر کہا گیا کہ یہاں بیٹھ جاؤ۔ میں اندھوں کی طرح ہاتھوں سے ٹٹولنے لگا کہ یہ مجھے کس جگہ بیٹھنے کو کہہ رہے ہیں۔ پھر کسی نے زور سے میری گردن پر مکا مارا۔ مجھے یہ ضرب ہر حالت میں برداشت کرنی تھی۔ میں اسے برداشت کر گیا۔

"یہاں بیٹھو نقلی اندھے"

انہوں نے مجھے دھکا دے کر ایک بنچ پر بٹھا دیا۔

"انسپکٹر صاحب کو رپورٹ کرو کیلاش"

کوئی بھاری قدموں سے چلتا کمرے سے باہر نکل گیا۔ وہی آواز پھر سنائی دی۔

"ہمیں معلوم ہے کہ تم مسلمان ہو اور پاکستانی کمانڈو ہو۔ ہمارے پاس تمہاری فل رپورٹ تمہاری تصویر کے ساتھ موجود ہے۔ انسپکٹر بدری پرشاد آرہے ہیں ان کے سامنے مردہ بھی بول پڑتا ہے۔ تمہارے لئے یہی بہتر ہے کہ وہ تم سے جو پوچھیں وہ سب سچ سچ بتادو۔ انسپکٹر بدری پرشاد تمہیں کچھ نہیں کہیں گے۔"

میں نے کہا۔

"میں اندھا ہوں۔ دلی سے آنکھوں کا علاج کرانے نجیب آباد آیا تھا۔"

"تمہیں راستے میں کوئی آنکھوں کا ہسپتال نہیں ملا؟"

میرے پاس حقیقت یہ تھی کہ کوئی معقول جواب یا اپنے آپ کو بے گناہ ثابت کرنے کی کوئی دلیل نہیں تھی۔ میں اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں ہی مار سکتا تھا اور میں یہی کچھ کر رہا تھا۔ کچھ آدمی بھاری قدموں کے ساتھ کمرے میں داخل ہوئے۔ مجھے کسی کے ایڑیاں بجا کر سلیوٹ کرنے کی آواز آئی۔

"سر! یہ ہے پاکستانی کمانڈو"

یہ انسپکٹر بدری پرشاد ہی ہو سکتا تھا۔ مجھے اس کی کرخت لہجے والی آواز آئی۔

"حلیہ بدلا ہوا ہے مگر تصویر سے ملتا ہے"

اس آدمی نے مجھے بازو سے پکڑا اور جھنجھوڑتے ہوئے پوچھا۔

"تم نجیب آباد کہاں دھماکہ کرنے آرہے تھے؟ تمہارے دوسرے پاکستانی ساتھی کمانڈو یہاں کہاں چھپے ہوئے ہیں۔"

میں نے بے دلی سے وہی عذر پیش کیا کہ میں بے قصور ہوں۔ میں ہندو ہوں۔ دلی کا رہنے والا ہوں۔ یہاں ایک ڈاکٹر کی بڑی تعریف سنی تھی۔ اس کے پاس علاج کرانے کے لئے آیا تھا۔ سب سے پہلے تو میری پتلون اتار کر میرا معائنہ کیا گیا۔ میرا مسلمان ہونا ثابت ہو گیا۔ انسپکٹر بدری پرشاد نے مجھے گالی دی اور کہا۔

"اب تم انکار نہیں کر سکتے کہ تم مسلمان ہو اور پاکستان سے بھارت میں تخریب کاری کے لئے آئے ہو۔ تم نے اشوکا ہوٹل میں دھماکہ کر کے ہمارے اور ہمارے دوست

ملک اسرائیل کے چھ اعلیٰ ترین جرنیل ہلاک کئے ہیں۔ تم نے ہی اپنے ساتھی کمانڈوز سے مل کر پانڈی چری کی کھاڑی میں ہماری بحریہ کے دو جہاز غرق کئے تھے۔ ہمارے پاس تمہاری فل رپورٹ پہنچ چکی ہے۔ تم دھرم ویر کے جعلی ہندو نام سے میجر شرت دیوان کے پاس ناگپور ہیڈ کوارٹر میں رہ رہے تھے۔ تمہارے لئے یہی اچھا ہے کہ سچ بول دو اور ہمیں اپنے ساتھیوں کے نام اور نجیب آباد میں اپنے ٹارگٹ کے بارے میں بتادو۔"

میں نے کہا کہ میں مسلمان ضرور ہوں مگر میرا پاکستانی کمانڈوز سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ انہیں مجھ سے اس قسم کے جواب کی توقع تھی۔ لیکن جس چیز نے انہیں مخمصے میں ڈال رکھا تھا وہ یہ تھا کہ میں اگر اندھا ہوں تو پھر کمانڈو سرگرمیاں میں نے کس طرح کیں؟ وہ آپس میں باتیں کرنے لگے۔ کسی نے کہا۔

"سر! ڈاکٹر میجر شرما سے اس کی آنکھوں کا معائنہ کراتے ہیں۔ ابھی پتہ چل جائے گا کہ یہ سچ مچ کا اندھا ہے کہ جھوٹ بول رہا ہے۔"

انسپکٹر نے فون پر کسی ڈاکٹر شرما سے بات کی۔ اسی وقت مجھے ہتھکڑی لگادی گئی۔ باہر نکال کر ایک گاڑی میں بٹھایا اور گاڑی شاید کسی فوجی ہسپتال کی طرف روانہ ہو گئی۔

ابھی تک میری آنکھوں کی بینائی واپس نہیں آئی تھی۔

اب آنکھوں کی نظر واپس آنے کا وقفہ طویل ہونا شروع ہو گیا تھا۔ مجھے آنکھوں کے سپیشلسٹ میجر شرما کے سامنے لے جایا گیا۔ اس نے میری آنکھوں کا دس پندرہ منٹ تک اچھی طرح سے معائنہ کیا پھر انسپکٹر بدری پرشاد سے کہا۔

"انسپکٹر! یہ شخص بالکل اندھا ہے"

ایک دو سیکنڈ کے لئے وہاں پھر خاموشی چھا گئی۔ انسپکٹر نے حیرانی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

"ڈاکٹر! سر! یہ شخص کب سے اندھا ہے؟"

ڈاکٹر نے کہا۔

"مجھے تو پیدائشی اندھا لگتا ہے"

انسپکٹر بدری پرشاد کی آواز آئی۔

"کانسٹیبل کیلاش! اسے پولیس ہیڈ کوارٹر واپس لے چلو۔ وہاں اس کا سارا پتہ چلا لیں گے۔"

مجھے ایک بار پھر گاڑی میں بٹھا دیا گیا۔ انسپکٹر میرے ساتھ بیٹھا تھا۔ اس نے کہا۔

"ڈاکٹر کو بھی پتہ نہیں چل سکا یہ کمانڈو بڑے چالاک ہوتے ہیں۔ اس نے اپنی آنکھوں میں کوئی ایسی دوائی ڈال رکھی ہے جس نے وقتی طور پر اسے اندھا کر دیا ہے؟ اس کو تھرڈ ڈگری ٹارچر دیا گیا تو سب کچھ بتا دے گا۔"

ایک بار پھر مجھے کسی کمرے میں لا کر ایک سٹول پر بٹھا دیا گیا۔ اس کمرے میں سے ڈی ٹول اور دوسری دوائیوں کی بو آ رہی تھی۔ میں سمجھ گیا کہ یہاں مجھ پر آپریشن کے مختلف نشتروں اور قینچیوں سے تشدد کیا جائے گا۔ میں نے ذہنی طور پر اس تشدد کے لئے اپنے آپ کو بالکل تیار کر لیا۔ جیسے ہی میں سٹول پر بیٹھا میری آنکھوں کے آگے جو اندھیرا تھا وہ آہستہ آہستہ چھٹنے لگا۔ میری بینائی واپس آ رہی تھی۔ تین چار سیکنڈ گزرے ہوں گے کہ میں سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ آواز سے میں نے پولیس انسپکٹر بدری پرشاد کو پہچان لیا جو میرے بالکل سامنے دوسرے سٹول پر بیٹھا تھا اس کے ہاتھ میں آپریشن کرنے والا چھوٹا چاقو تھا جس کی نوک کو وہ غور سے دیکھ رہا تھا۔ اس کے پیچھے ایک کانسٹیبل کھڑا تھا۔ پولیس انسپکٹر نے کانسٹیبل سے کہا۔

"اس کی ہتھکڑی کھول کر اس کے ہاتھ پیچھے لے جا کر دوبارہ ہتھکڑی لگا دو"

میرے ہاتھ پیچھے لے جا کر دوبارہ ہتھکڑی لگا دی گئی۔ اب میں ان سب کو دیکھ رہا تھا۔ مگر انہیں یہی معلوم تھا کہ میں اندھا ہوں۔ میں نے کنکھیوں سے کمرے کا جائزہ لیا۔ یہ چھوٹی سی ڈسپنسری کا کمرہ لگتا تھا۔ دیوار کے ساتھ الماریوں میں دوائی کی شیشیاں اور بوتلیں رکھی ہوئی تھیں۔ انسپکٹر نے چاقو کی نوک میری گردن میں ذرا سی چبھوتے ہوئے کہا۔

"ابھی بھی وقت ہے اگر تم مجھے سب کچھ بتا دو تو اذیت ناک موت سے بچ سکتے ہو"

آدمی نابینا نہ ہو اور نابینا ہونے کی اداکاری کر رہا ہو تو یہ بڑا مشکل مرحلہ ہوتا ہے۔ وہ چونکہ سب کچھ دیکھ رہا ہوتا ہے اس لئے اپنے چہرے پر نابینا آدمی والے تاثرات کو زیادہ دیر تک قائم نہیں رکھ سکتا۔ کوئی زیرک آدمی کسی بھی لمحے پہچان سکتا ہے کہ یہ شخص اصل میں نابینا نہیں ہے۔ مگر میں نے بڑی تجربہ کاری سے کام لیتے ہوئے اپنے چہرے پر ایک نابینا شخص کے تاثرات کو ابھی تک قائم رکھا ہوا تھا۔ میں کسی کی طرف نظر لگا کر نہیں دیکھ رہا تھا۔ بلکہ ہوا میں دیکھ رہا تھا۔ انسپکٹر پرشاد میرے سامنے بیٹھا تھا مگر میں اس کے چہرے کو نہیں بلکہ اس کے چہرے کے اوپر پیچھے نظر آنے والی الماری کو دیکھ رہا

تھا۔ میں نے نابیناؤں کی طرح اب تھوڑی تھوڑی گردن بھی ادھرادھرہلانی شروع کردی تھی۔ میں نے کہا۔

"انسپکٹرجی! آپ خود ہی خیال کریں کیا کبھی ایک نابینا آدمی بھی کمانڈو یا جاسوس بن سکتا ہے؟"

"تو پھر تم گاڑی کیسے چلا رہے تھے؟ تم جھوٹ بولتے ہو۔ یہ بھی تمہاری ایک چال ہے۔ تم نے اپنی آنکھوں میں کوئی دوائی ڈال رکھی ہے جس نے تمہیں کچھ وقت کے لئے نابینا بنا دیا ہے۔ فکر نہ کرو میرا نام بھی انسپکٹر بدری پرشاد ہے میں ابھی سب کچھ بکوا لوں گا۔"

اس کے ساتھ ہی اس نے چاقو کی نوک میری گردن کی ایک جانب چبھو دی۔ درد سے میری ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ اگرچہ یہ درد میں برداشت کر سکتا تھا مگر اپنے آپ کو عام شہری ظاہر کرنے کے لئے میں نے ذرا سی تکلیف پر شدید ردعمل کا اظہار کیا۔ میرا خیال تھا کہ یہ شخص تھوڑا ٹارچر ہی کرے گا۔ جسے میں برداشت کرجاؤں گا۔ مگر جب میں نے اسے ایک انجکشن تیار کرتے دیکھا تو میں نے اپنا فیصلہ بدل لیا۔ وہ کہہ رہا تھا۔

"اب میں تمہارے جسم میں ایک ایسی دوائی داخل کرنے والا ہوں جس سے تم بے ہوش ہو جاؤ گے۔ لیکن تمہاری زبان چلتی رہے گی اور میں تم سے جو پوچھوں گا تم اس کا سچ سچ جواب دیتے جاؤ گے۔"

اس قسم کا انجکشن میرے مشن کی راہ میں رکاوٹ ڈالنے کا موجب بن سکتا تھا۔ ظاہر ہے اگر میں اسے انجکشن لگنے کے بعد بتا بھی دیتا کہ میں کشمیری کمانڈو ہوں اور میں نے ہی پانڈی چری کے سمندر میں بھارتی بحریہ کے جہاز ڈبوئے تھے اور میں ہی دھرم ویر بن کر میجر شرت دیوان کے ساتھ رہ رہا تھا تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ کیونکہ یہ ساری باتیں انہیں پہلے ہی سے معلوم تھیں۔ مجھے یہ بھی اچھی طرح معلوم تھا کہ یہ لوگ میرے ایسے کمانڈو کو اس وقت تک ہلاک نہیں کیا کرتے جب تک انہیں اپنے مطلب کی ساری معلومات حاصل نہیں ہوجاتیں۔ فرق صرف مجھے پڑتا تھا کہ مجھے اپنے اوپر آئی ہوئی آفت

سے نجات حاصل کرنے کے لئے قلعہ پتھرگڑھ میں رات کو جانا تھا اور وہاں سے ماضی کے زمانے میں جا کر خدا کی ایک برگزیدہ ہستی سے ملنا تھا۔ میرے پاس ان لوگوں کی انٹیروگیشن اور ٹارچر کے لئے اب کوئی وقت نہیں تھا اور میرے نزدیک ان باتوں کی کوئی وقعت بھی نہیں رہی تھی۔ کیونکہ نہ میں نے انہیں کچھ بتانا تھا اور نہ انہوں نے مجھے ہلاک کرنا تھا۔ بس ٹارچر تھا وہ جتنا ٹارچر کرتے مجھے برداشت کرتے جانا تھا۔ یہ میرے ایسے اہم ترین کمانڈو کے لئے وقت کو برباد کرنے کے برابر تھا۔ کیونکہ میرے سامنے بڑے اہم ترین مشن تھے۔ جنہیں میں نے پورا کرنا تھا۔ اور بڑے فاسٹ ایکشن اور فاسٹ کمانڈو آپریشن کے ساتھ ایک ایک کر کے پورا کرتے جانا تھا۔ اوپر سے مجھے یہ بھی علم ہو چکا تھا کہ بھارت عنقریب میرے پاک وطن پاکستان پر جارحانہ حملے کا مذموم منصوبہ بنا چکا ہے۔ مجھے اس سلسلے میں بھی اپنے وطن پاک کی سلامتی کے لئے نمایاں فرائض ادا کرنے تھے۔ دشمن سے حملے کی تاریخ اور وقت اور فوجی تیاریوں کے بارے میں مکمل معلومات حاصل کرنی تھی۔ چنانچہ جب پولیس انسپکٹر مجھے انجکشن لگانے لگا تو میں نے کہا۔

"انسپکٹر رک جاؤ"

اس نے انجکشن والا ہاتھ پیچھے ہٹالیا۔ میں نے یہی ظاہر کیا کہ میں اسے بالکل نہیں دیکھ رہا۔ وہ مسکرا رہا تھا۔

بولا۔

"شاباش! مجھے معلوم تھا تم صحیح راستہ پر آجاؤ گے۔ اب میں تمہیں کاغذ پنسل دیتا ہوں۔ اس کاغذ پر اپنے ساتھی کمانڈوز کے نام اور جہاں جہاں وہ چھپے ہوئے ہیں ان جگہوں کے نام لکھ دو۔ اگر تم خود نہیں لکھنا چاہتے تو بولتے جاؤ میں لکھتا جاؤں گا۔"

مجھے وہاں سے فرار کی منصوبہ بندی کے لئے تھوڑا وقت درکار تھا۔ میں نے نابینا بھکاریوں کی طرح گردن ذرا سی ہلاتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے میں اعتراف کرتا ہوں کہ میں کمانڈو ہوں۔ مگر میں پاکستانی کمانڈو نہیں ہوں۔ میں کشمیری کمانڈو ہوں۔ میں پیدائشی نابینا نہیں ہوں۔ مجھ پر اندھے پن کا یہاں

نجیب آباد میں آکر اچانک حملہ ہوا ہے۔ میں خود بھی نہیں جانتا کہ میری آنکھوں کی بینائی کیسے جاتی رہی ہے۔"

انسپکٹر کے چہرے پر مسرت کھل رہی تھی کہنے لگا۔

"شاباش! اب یہ بتادو کہ نجیب آباد میں تمہارا ٹارگٹ کونسا ہے اور تمہارے دوسرے ساتھی یہاں کہاں کہاں چھپے ہوئے ہیں؟"

میں نے کہا۔

"نجیب آباد میں ہمارا کوئی ٹارگٹ نہیں ہے۔ مگر ہم یہاں ایک دوسرے کمانڈو مشن کی منصوبہ بندی کے لئے ضرور آئے ہیں۔ لیکن میرے دوسرے ساتھی ابھی نجیب آباد نہیں پہنچے۔ انہیں کل شام کی گاڑی سے یہاں پہنچنا ہے اور ہمیں ریلوے سٹیشن کے عقب میں ایک جگہ ملنا ہے۔"

پولیس انسپکٹر نے کہا۔

"ٹھیک ہے۔ میں تمہارے بیان پر اعتبار کرلیتا ہوں ہم کل صبح صبح ہی ریلوے سٹیشن کے سارے علاقے کو گھیرے میں لے لیں گے۔ تم ہمارے ساتھ چلو گے اور ہمیں اپنے ساتھی کمانڈو پکڑواؤ گے۔ اگر وہاں تمہارا کوئی ساتھی نہ آیا تو تمہارے بیان کو جھوٹ تسلیم کیا جائے گا اور پھر میں خود اپنے ہاتھوں سے تمہیں ٹارچر کر کے ہلاک کروں گا۔"

میں نے کہا۔

"میں نے جو کچھ کہا ہے سچ سچ کہا ہے۔ میں آج سے کمانڈو کی زندگی سے توبہ کرتا ہوں۔ آپ لوگ کل بے شک مجھے ساتھ لے چلیں۔ میں آپ کو بتادوں گا کہ وہ ہمارے کمانڈو ساتھی آرہے ہیں۔ پھر آپ انہیں گرفتار کرلینا۔ اتنا بتادیتا ہوں کہ دونوں کمانڈو سادھوؤں کے بھیس میں ہوں گے۔"

انسپکٹر نے انجکشن واپس رکھ دیا اور کہنے لگا۔

"ابھی تمہارے ساتھ قیدیوں والا ہی سلوک کیا جائے گا۔ کل جب تم اپنے دونوں ساتھی ہمیں پکڑوا دوگے تو نہ صرف یہ کہ ہم تمہیں انعام دیں گے بلکہ تم جہاں جانا چاہو

گے تمہیں پولیس کی حفاظت میں وہاں پہنچا دیں گے۔"

میں نے فرمائشی لہجے میں کہا۔

"میں صرف ایک درخواست کرنا چاہتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ میں بالکل اندھا ہو چکا ہوں مجھے کچھ بھی دکھائی نہیں دیتا۔ پلیز مجھے کسی ایسی جگہ قید میں ڈال دیں جہاں میں بستر پر لیٹ سکوں اور ٹٹول ٹٹول کر باتھ روم کے دروازے تک جاسکوں۔ بس مجھے اس سے زیادہ کچھ نہیں چاہئے۔ مجھے ہتھکڑی لگائے رکھنے کی بھی آپ کو ضرورت نہیں ہے۔ کیونکہ ایک نابینا قیدی کہاں فرار ہو کر جائے گا۔ میں دیکھ رہا تھا کہ پولیس انسپکٹر بدری پرشاد کانسٹیبل کی طرف دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔ اس کے خیال میں اسے بہت بڑی کامیابی ملنے والی تھی۔ میری طرف دیکھ کر بولا۔

"ٹھیک ہے تمہیں یہ سہولتیں مل جائیں گی۔"

دوسرے لمحے مجھے وہاں سے نکال کر باہر لے جایا گیا۔ میں نے دیکھا کہ یہ بہت بڑا پولیس ہیڈ کوارٹر تھا۔ آمنے سامنے تین چار بلاک تھے۔ جگہ جگہ پولیس کی گاڑیاں کھڑی تھیں۔ مجھے اسی بلاک کے کونے والے ایک کمرے میں لاکر میری ہتھکڑی کھول دی گئی اور کانسٹیبل نے میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے دیوار سے لگی اس کھاٹ پر بٹھا دیا جو مجھے صاف نظر آرہی تھی مگر میں اس طرح ہاتھ آگے کر کے ہوا کو ٹٹول ٹٹول کر وہاں تک گیا جیسے مجھے چارپائی نظر نہیں آرہی۔ انسپکٹر بدری پرشاد میرے ساتھ ہی آیا تھا۔ کہنے لگا۔

"باتھ روم دیوار کے ساتھ تین چار قدموں پر ہی ہے۔"

اس کے بعد دونوں پولیس افسر چلے گئے۔ میں انہیں جاتے دیکھ رہا تھا۔ میرا خیال تھا کہ وہ جاتے ہوئے دروازہ بند کرتے جائیں گے اور دروازے کو باہر سے تالا لگا دیں گے۔ مگر انہوں نے دروازہ بند نہ کیا۔ ابھی میں کھلے دروازے کو دیکھ ہی رہا تھا کہ ایک کانسٹیبل رائفل کاندھے پر رکھے آیا اور دروازے کے باہر سٹول پر بیٹھ گیا۔ اس نے ایک نظر مجھے دیکھا اور پھر چوکس ہو کر ایک طرف دیکھنے لگا۔ مجھے اسی طرف سے لایا گیا تھا۔ میں دیکھ چکا تھا کہ دروازے کے آگے ایک تنگ راستہ ہے جس کی دونوں جانب پولیس ایڈمنسٹریشن

کے دفاتر ہیں مجھے ایک کمرے سے ٹائپ مشین کی ٹک ٹک کی آواز بھی آرہی تھی۔

میں نے چارپائی پر لیٹتے ہوئے کمرے کا جائزہ لیا۔ اس کمرے میں کوئی کھڑکی روشندان نہیں تھا۔ وہاں صرف ایک چارپائی ہی بچھی ہوئی تھی۔ دوسری کوئی شے نہیں تھی۔ میں نے سوچا کہ باتھ روم کا جائزہ لینا چاہئے۔ چنانچہ میں اندھوں کی طرح چارپائی سے اٹھ کر دیوار کو ٹٹول ٹٹول کر باتھ روم کے دروازے تک آیا جو مجھے برابر نظر آرہا تھا۔ میں نے باتھ روم میں داخل ہو کر دروازہ بند کر دیا۔ بڑا گندا چھوٹا سا باتھ روم تھا۔ میں نے ٹونٹی کھول کر پانی پیا۔ بوٹ کے اندر سے بال پوائنٹ پنسل پستول نکال کر اسے غور سے دیکھا کہ کہیں ٹوٹ تو نہیں گئی۔ بال پوائنٹ پنسل بالکل درست حالت میں تھی۔ میرے پاس صرف یہی ایک ہتھیار تھا جو مجھے وہاں سے فرار ہونے میں میری مدد کر سکتا تھا۔ باتھ روم میں بھی کوئی کھڑکی یا روشندان نہیں تھا۔ شاید یہ کمرہ پولیس نے وی آئی پی قیدیوں سے پوچھ گچھ کے لئے رکھا ہوا تھا۔ منہ دھونے والے واشنگ بیسن کے اوپر کوئی شیشہ بھی نہیں لگا ہوا تھا کہ میں اس میں اپنی شکل ہی دیکھ لیتا۔ میں نے پانی پینے کے بعد بالوں میں انگلیاں پھیریں اور باہر نکل کر چارپائی پر لیٹ گیا۔

میں وہاں سے فرار ہونے کے امکانات پر غور کرنے لگا۔ میرے پاس صرف آج کا دن اور آج کی رات تھی۔ اس کے بعد کل صبح مجھے پولیس کو لے کر نجیب آباد کے سٹیشن پر جا کر کمانڈو ساتھیوں کو پکڑوانے کا جھوٹا ڈرامہ کھیلنا تھا۔ میرا پول کھل جانے کے بعد ظاہر ہے کہ مجھ پر بے پناہ تشدد کا سلسلہ شروع ہو جانا تھا۔ مجھے جو کچھ کرنا تھا آج رات کے اندر اندر کر گزرنا تھا۔ خواہ اس کا کچھ بھی نتیجہ نکلے۔ جب آدمی زندگی کا آخری داؤ لگا رہا ہو۔ زندگی کی آخری بازی کھیل رہا ہو تو پھر وہ فتح شکست سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔ نتیجہ خواہ کچھ بھی نکلے۔ اسے پانسہ پھینکنا ہی پڑتا ہے۔ یا تخت یا تختہ۔

میرے لئے ایک ملازم کھانا لے کر آیا۔ کھانے میں دو روٹیاں اور دال تھی۔ ساتھ آم کی چٹنی بھی تھی۔ یہ اس وقت بہت بڑی نعمت تھی۔ میں نے مزے سے دونوں روٹیاں کھالیں۔ چارپائی پر لیٹ گیا دماغ بڑی تیزی سے فرار کے منصوبے پیش کرنے لگا۔

ہی خیال آتا کہ یہ کرلوں۔ کبھی خیال آتا کہ نہیں یہ ٹھیک نہیں۔ یہ کرنا چاہئے۔ سہ پہر ہوگئی۔ وہی ملازم میرے لئے چائے کا ایک گلاس لے آیا۔ چائے خوب گرم تھی۔ پھر شام ہوگئی۔ میرے کمرے کی بتی صبح ہی سے جل رہی تھی۔ دروازے میں پہرہ دینے والے سنتری کی جگہ دوسرا سنتری آگیا تھا۔ اسے رات کو پہرہ دینا تھا۔ اس وقت تک میرے ذہن نے ایک منصوبہ سوچ لیا تھا۔ یہ کوئی بڑا یقینی فرار کا منصوبہ نہیں تھا۔ بس ایک آخری ہلہ ہی تھا۔ ہلہ بولنا تھا۔ نکل گیا تو نکل گیا نہیں تو پھر جو ہو سو ہو۔

سب سے پہلے تو مجھے اللہ کی ذات پر بھروسہ تھا۔ اس کے بعد میرے پاس جو دنیاوی وسیلہ تھا وہ بال پوائنٹ پنسل کی شکل میں ہلاکت خیز پستول تھا۔ جو ابھی تک میرے ایک جوتے کے اندر موجود تھا۔ میں ابھی تک اندھے پن کی اداکاری کر رہا تھا۔ ابھی تک میری بینائی بالکل صحیح تھی۔ اور دوسری بار چندریکا کی بدروح کا حملہ نہیں ہوا تھا۔ مگر یہ حملہ کسی بھی وقت ہو سکتا تھا۔ مجھے ایک دھڑکا یہ بھی لگا ہوا تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ میں یہاں سے فرار ہو کر نکلوں اور اس کے ساتھ ہی میری آنکھوں کی بینائی غائب ہو جائے اور میں اندھا ہو جاؤں۔ ایسی صورت میں میرا دوبارہ پکڑا جانا یا کسی کھائی' کھڈ یا نالے میں یا گٹر میں گر کر ہلاک ہو جانا یقینی تھا۔ لیکن ان خدشوں پر غور کرتے ہوئے بھی میں نے انہیں پس منظر میں رکھا تھا اور فرار کے منصوبے پر اس اعتماد کے ساتھ عمل کرنے والا تھا کہ مجھے اللہ کے فضل سے کچھ نہیں ہوگا اور میں دشمن کی قید سے نکل جاؤں گا۔ میں نے دروازے کے آگے پہرہ دیتے سپاہی سے وقت پوچھا۔ اس نے بتایا کہ شام کے سات بجنے والے ہیں۔ اس اثناء میں میں نے محسوس کیا تھا کہ ہیڈ کوارٹر کے اس ونگ کے سارے دفتروں کے لوگ چھٹی کر کے جا چکے ہیں۔ وہاں خاموشی چھا گئی تھی۔ رات کے نو بجے تو میں نے دیکھا کہ پولیس انسپکٹر بدری پرشاد اور کانسٹیبل کیلاش آرہے ہیں۔

میں نے اندھے آدمی کی طرح حرکتیں کرنی شروع کر دیں۔ کبھی چارپائی کے بستر کو ہاتھ سے ٹٹولتا' کبھی سرہانے کو ٹٹولتا انسپکٹر نے قریب آکر پوچھا۔

"کیا ڈھونڈ رہے ہو؟"

میں نے سامنے والی دیوار پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔

"انسپکٹر صاحب آئے ہیں"

"ہاں۔ میں آیا ہوں۔ تمہاری کوئی چیز گم ہو گئی ہے کیا؟"

میں نے کہا۔

"چارپائی میں کھٹمل بہت ہیں"

انسپکٹر نے ترش لہجے میں کہا۔

"تو کیا تمہارے واسطے ہم یہاں پھولوں کی سیج بچھا کر رکھتے؟"

میں خاموش رہا۔ وہ کہنے لگا۔

"میں تمہیں ایک بار پھر یاد دلانے کے لئے آیا ہوں کہ کل اگر تم نے اپنے ساتھی نہ پکڑوائے تو کل کا دن تمہاری زندگی کا آخری دن ہوگا۔ یہ بات اپنے دماغ میں رکھنا کیا سمجھے؟"

میں نے کہا۔

"مگر مجھے تو کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ آپ کو کیسے پتہ چلے گا کہ میرے ساتھی کمانڈو کون ہیں"

پولیس انسپکٹر بولا۔

"تم ہمارے پاس بیٹھے ہو گے۔ تم ہمیں ان کے حلیے بتاؤ گے اور یہ بتاؤ گے کہ وہ کس طرف سے آ رہے ہیں۔ باقی ہم انہیں خود پکڑ لیں گے۔ ہم جاتے ہیں کل ہمارے ساتھ سٹیشن پر چلنے کے لئے تیار رہنا۔"

وہ چلا گیا۔ میں اندھوں کی طرح چھت کی طرف دیکھتا رہا۔ ان کے جانے کے بعد میں نے ایک بار پھر فرار کی منصوبہ بندی پر غور شروع کر دیا۔ بال پوائنٹ پستول اس وقت بھی میری پتلون کی جیب میں تھا۔ میری بینائی واپس آئے کافی دیر ہو گئی تھی۔ یہ دھڑکا الگ لگا تھا کہ مجھ پر اندھے پن کا حملہ نہ جانے کس وقت ہو جائے۔ میں اس حملے سے پہلے پہلے وہاں سے فرار ہو جانا چاہتا تھا۔ اگر باقاعدہ غور و فکر کر کے منصوبہ بنایا جائے اور اس پر

بڑے ٹھنڈے دل کے ساتھ گھبرائے بغیر عمل کیا جائے تو آدمی دشمنوں کے درمیان سے بھی فرار ہو سکتا ہے۔ لیکن اگر منصوبہ بندی اناڑی پن سے کی گئی ہو اور آدمی گھبرایا ہوا بھی ہو تو وہ محفوظ سے محفوظ مقام پر بھی پکڑا جا سکتا ہے۔

وہاں سے فرار ہونے کے لئے میرے پاس صرف ایک ہی منصوبہ تھا۔ صرف ایک ہی راستہ تھا اور مجھے اسی منصوبے پر عمل کرنا تھا۔ کمرے کی بتی جل رہی تھی۔ چھت والا پنکھا بھی آہستہ آہستہ گھوم رہا تھا۔ میں تھوڑی تھوڑی دیر بعد کھلے دروازے کے باہر سٹول پر بیٹھے ہوئے مسلح سپاہی کو دیکھ لیتا تھا۔ وہ کبھی اٹھ کر دروازے کے سامنے ٹہلنے بھی لگتا تھا۔ اس کو قابو میں کرنا میرے لئے کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ مجھے صرف یہ معلوم کرنا تھا کہ دروازے کے باہر دفاتر کے کمروں کے درمیان جو چھوٹا سا راستہ ہے وہاں بھی تو کوئی مسلح سپاہی پہرہ نہیں دے رہا۔ مجھے آدھی رات کے بعد پتھر گڑھ قلعے کی تیسری برجی والے دروازے پر بھی پہنچنا تھا۔ میں نے سپاہی سے پوچھا۔

"بھائی رات کا کیا ہوا ہو گا؟"

پہلے تو اس نے کوئی جواب نہ دیا اور سٹول پر بیٹھا بیڑی پیتا رہا۔ جب میں نے دوسری بار پوچھا تو بڑی ناگواری کے ساتھ بولا۔

"تمہیں کہاں جانا ہے جو ٹائم پوچھ رہے ہو؟"

پھر اس نے کلائی پر نظر ڈال کر کہا۔

"پونے گیارہ بجے ہیں رات کے"

میرے کمانڈو ایکشن کا ٹائم ہو گیا تھا۔ مجھے اس لئے بھی جلدی تھی کہ کوئی پتہ نہیں تھا کہ میرے نابینا ہونے کا بھی ٹائم ہو گیا ہو۔ میں چارپائی پر لیٹا ہوا تھا۔ ذرا سا کھانس کر میں چارپائی پر بیٹھ گیا اور سنتری سے کہا۔

"بھائی مجھے تھوڑا پانی پلا دو۔ گلے میں کچھ پھنس گیا ہے۔ میں تو اندھا ہوں خود اٹھ کر پانی نہیں پی سکتا۔"

سنتری کچھ بڑبڑایا۔ ضرور اس نے مجھے دو تین گالیاں دی ہوں گی۔ میں بظاہر سامنے

والی دیوار کی طرف دیکھ رہا تھا مگر میری نظریں سنتری پر لگی ہوئی تھیں۔ سب سے پہلے مجھے اسی کو قابو کرنا تھا۔ سنتری بادل نخواستہ بڑبڑاتا ہوا اٹھا۔ باتھ روم میں جا کر ٹین کے گلاس میں پانی ڈال کر لایا۔ میں نے پوزیشن سنبھال لی تھی۔ میں یہ ظاہر کرنے کے لئے ادھرادھر ہاتھ مارنے لگا کہ مجھے گلاس نظر نہیں آرہا۔ اس نے غصے میں کہا۔

"ادھر سے پکڑو۔ ادھر سے"

میں اسے بھی دیکھ رہا تھا اور گلاس کو بھی دیکھ رہا تھا۔ میں اس پر بال پوائنٹ پنسل والی سائی نائیڈ زہروالی سوئی ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا۔ جیسے ہی اس نے پانی والا گلاس میرے چہرے کے آگے کیا میں نے اس کے بازو کو پکڑ کر زور سے جھٹکا دے کر اپنی طرف کھینچا اور اس سے پہلے کہ وہ مدد کے لئے کسی کو پکارتا اس کی گردن میرے بائیں بازو کے آہنی شکنجے میں تھی۔ وہ اپنی رائفل دروازے کے باہر ہی رکھ آیا تھا۔ میرے بائیں بازو کے آہنی شکنجے سے نکلنا اس کے بس کی بات نہیں تھی۔ اور پھر میں نے اسے اتنا موقع بھی نہ دیا۔ دوسرے جھٹکے سے اس کی گردن دوسری طرف زور سے گھما دی۔ وہ مر چکا تھا۔ میں نے اسے وہیں چارپائی پر ڈالا۔ جیب سے بال پوائنٹ پنسل پستول نکال کر اپنے سیدھے ہاتھ کی ہتھیلی میں چھپایا اور دروازے میں سے باہر جھانک کر دیکھا۔ وہاں کوئی دوسرا سنتری نہیں تھا۔ میں دیوار کے ساتھ ساتھ چلتا بڑے برآمدے میں نکل آیا۔ یہاں ایک بتی جل رہی تھی۔ دور کچھ فاصلے پر مجھے گیٹ دکھائی دیا جہاں روشنی میں ایک سنتری بنچ یا سٹول پر بیٹھا پہرہ دے رہا تھا۔ میں گیٹ کی طرف جانے کی بجائے دوسری طرف مڑ گیا۔ کمروں کے باہر کونوں پر ایک ایک بلب روشن تھا۔ میں روشنی سے اپنے آپ کو بچاتا اس پولیس ہیڈ کوارٹر کی دیوار کے پاس آکر اندھیرے میں ہوگیا۔

میں دیوار پھاند کر دوسری طرف جانا چاہتا تھا۔ مگر دیوار دس بارہ فٹ اونچی تھی۔ چند قدم آگے دیوار ایک طرف گھوم گئی تھی۔ وہاں موڑ پر دیوار کے اوپر ایک بلب جل رہا تھا۔ اس کی روشنی میں مجھے دیوار کے ساتھ لگا ہوا ڈھیر سا نظر آیا۔ شاید یہ اینٹوں کا ڈھیر تھا۔ یہاں سے میں دیوار پھاند سکتا تھا۔ میں جھک کر اس ڈھیر کی طرف چلنے لگا۔ جیسے ہی

دیوار کے موڑ پر پہنچ کر روشنی میں آیا سامنے سے ایک آدمی بھی اندھیرے سے نکل کر میرے سامنے آگیا۔ اس نے کڑک کر کہا۔

"ہالٹ! ہاتھ اوپر اٹھالو"

یہ ایک پولیس والا تھا جو شاید رات کو گشت لگا رہا تھا۔ اس نے رائفل تان لی۔ رائفل کا رخ میری طرف تھا۔

"ہاتھ اوپر اٹھا کر دیوار کی طرف منہ کرلو"

صاف لگ رہا تھا کہ اس نے مجھے پہلے نہیں دیکھا تھا اور وہ مجھے کوئی چور وغیرہ سمجھ رہا تھا۔ میں نے کہا۔

"میں پولیس کوارٹروں میں رہتا ہوں"

سنتری نے چیخ کر کہا۔

"ہاتھ اوپر اٹھاؤ نہیں تو گولی ماردوں گا"

بال پوائنٹ پنسل میں نے سیدھے ہاتھ کی ہتھیلی کے ساتھ چپکا رکھی تھی۔ میں اسے مارنا نہیں چاہتا تھا مگر اس کی آواز سن کر دوسرے پولیس والے وہاں پہنچ سکتے تھے۔ اس کو ہلاک کرنا ضروری ہوگیا تھا۔ اس کی موت اسے میرے سامنے لے آئی تھی۔ میں نے وہی کیا جو مجھے کرنا چاہئے تھا۔ دونوں ہاتھ اوپر اٹھا لئے۔ لیکن سیدھا ہاتھ اوپر لے جاتے ہوئے میں نے بال پوائنٹ پنسل میں سے زہریلی سوئی فائر کر دی تھی۔ سنتری مجھ سے کوئی پانچ قدموں کے فاصلے پر رائفل میری طرف تانے کھڑا تھا۔ میں نے بال پوائنٹ میں سے زہریلی سوئی کو نکلتے نہیں دیکھا تھا۔ اس سنتری نے بھی سوئی کو نہیں دیکھا تھا۔ مگر زہریلی سوئی میرے بال پوائنٹ کا ننھا سا بٹن دباتے ہی نکل چکی تھی۔ اس کا پتہ مجھے فوراً ہی چل گیا۔ سنتری نے رائفل اپنے دونوں ہاتھوں میں پکڑی ہوئی تھی۔ میرے دیکھتے دیکھتے رائفل اس کے ہاتھوں سے گر پڑی۔ اس کے ساتھ ہی وہ بھی گر پڑا۔ بال پوائنٹ پستول کا یہ پہلا شکار تھا۔ میں لپک کر اینٹوں کے ڈھیر پر چڑھ گیا۔ بال پوائنٹ پنسل مین نے پتلون کی جیب میں رکھی۔ اچھل کر دیوار کی منڈھیر کو پکڑا۔ اور دیوار کی دوسری طرف کود گیا۔ میں

اندھیرے میں کوڑے کرکٹ کے ڈھیر پر گرا۔ گرتے ہی اٹھا۔ سامنے خالی سڑک تھی۔ جلدی سے سڑک کراس کی اور سڑک سے ہٹ کر اندھیرے میں ایک طرف کو دوڑ پڑا۔ ابھی تک مجھے کچھ معلوم نہیں تھا کہ میں کس طرف جا رہا ہوں۔ ابھی مجھے یہ پتہ کرنے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ بس میں پولیس ہیڈ کوارٹر سے جتنی دور نکل سکتا تھا نکل جانا چاہتا تھا۔ دوڑتے دوڑتے میں کھیتوں میں آگیا۔ رک کر سانس ٹھیک کیا۔ دیکھا کہ اردگرد آبادیوں کی روشنیاں تھیں۔ جس طرف روشنیاں نہیں تھیں میں نے اس طرف دوڑنا شروع کر دیا۔ دوڑ لگانے کی مجھے کافی پریکٹس تھی۔ اپنے سانس پر بھی مجھے پورا کنٹرول تھا مگر گوالیار اور پانڈی چری کے ٹارچر سنٹروں میں بے پناہ وحشیانہ تشدد برداشت کرنے کے بعد میری قوت مدافعت کافی کمزور ہو چکی تھی۔ مگر چونکہ یہ میری بھرپور جوانی کا زمانہ تھا اور میرا جسم بھی مضبوط تھا اس لئے مجھے کمزوری زیادہ محسوس نہیں ہوتی تھی۔ ایک جوہڑ کے پاس آکر میں رک گیا۔

اب میں سمت کا تعین کرنا چاہتا تھا۔ مجھے پتھر گڑھ کے قلعے میں جانا تھا۔ یہ میری خوش قسمتی تھی کہ ابھی تک مجھ پر اندھے پن کا حملہ نہیں ہوا تھا۔ میں نے اردگرد کے ماحول کا جائزہ لیا۔ ایک طرف شہر کی آبادی کی روشنیاں ہی روشنیاں تھیں۔ دوسری طرف کہیں کہیں روشنی ہو رہی تھی۔ میں نے آسمان کی طرف نگاہ اٹھائی کہ ستاروں کو دیکھ کر اندازہ لگاؤں کہ مجھے کس طرف جانا چاہئے۔ اتنا مجھے معلوم تھا کہ پتھر گڑھ کا قلعہ نجیب آباد شہر کی مغربی سمت ہے۔ میں نے سوچا کہ جس طرف روشنیاں اکا دکا ہیں اس طرف ضرور جنگل شروع ہو جاتا ہوگا اور پتھر گڑھ کا قلعہ بھی جنگل کے شروع میں ہی واقع ہے۔ چنانچہ میں اسی طرف چلنے لگا۔ میرا اندازہ درست نکلا۔ بہت جلد مجھے ایک پختہ سڑک مل گئی۔ سڑک پر کہیں اندھیرا تھا۔ کہیں روشنی تھی۔ دونوں طرف گھنے درخت تھے۔ درختوں کے نیچے اندھیرا تھا۔ میں درختوں کے اندھیرے میں تیز تیز قدم اٹھاتا چل رہا تھا۔ آگے جا کر سڑک شہر کی آبادی کی طرف مڑ جاتی تھی۔ میں سڑک سے اتر کر ویران میدان میں سے گزرنے لگا۔ کچھ فاصلے پر تین چار روشنیاں جھلملا رہی تھیں۔ لگتا تھا کہ یہ کسی ٹیلے پر بنی ہوئی کسی

عمارت کی روشنیاں ہیں۔ مجھے خیال آگیا کہ ضرور یہ قلعہ پتھر گڑھ کی روشنیاں ہیں۔ میں نے اس طرف رخ کر کے اپنی رفتار تیز کر دی۔ روشنیاں آہستہ آہستہ قریب آنے لگیں۔ میں ایک اونچے نیچے میدان میں سے گزر رہا تھا۔ جہاں اندھیرے میں کہیں جھاڑیاں آجاتیں اور کہیں کوڑے کرکٹ کے ڈھیر آجاتے۔

کافی دیر تک چلتے رہنے کے بعد تھوڑی سی چڑھائی آگئی۔ چڑھائی چڑھ کر اوپر آیا تو بائیں طرف کوئی ڈیڑھ دو سو گز کے فاصلے پر مجھے ایک قلعے کی دیو قامت دیوار اندھیرے میں آسمان کی طرف بلند ہوتی نظر پڑی۔ یہ پتھر گڑھ قلعے کی ہی دیوار ہو سکتی تھی۔ میں اوپر سے ہو کر قلعے کے بڑے گیٹ سے تھوڑے فاصلے پر آکر رک گیا۔ قلعے کے بلند و بالا پرجلال دروازے کے اوپر ایک بلب روشن تھا مگر وہاں کوئی ذی روح نظر نہیں آرہا تھا۔ یہ قلعہ بالکل ویران تھا اور یہاں دن کے وقت بھی کبھی کبھار ہی کوئی غیر ملکی سیاح آتا تھا۔ اس قلعے میں سیاحوں کی دلچسپی کے لئے کچھ بھی نہیں تھا۔ اونچی اونچی کھنڈر بنی دیواریں تھیں۔ قلعے کے اندر کشادہ صحن میں بکھرے ہوئے پتھروں کے ڈھیر تھے۔ جگہ جگہ گھاس اگ آئی تھی۔ جہاں تک میرا خیال تھا وہاں رات کو کوئی چوکیدار بھی نہیں ہوتا تھا۔ اس کے باوجود میں قلعے میں داخل ہونے سے پہلے یہ تسلی کرنا چاہتا تھا کہ مجھے اندر داخل ہوتے ہوئے کسی نے نہیں دیکھا۔ میں نے قلعے کے دروازے کے اوپر چمکتی روشنی کو غور سے دیکھا۔ میں یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ میری بینائی ختم تو نہیں ہو رہی۔ خدا کا شکر ہے کہ ابھی تک مجھ پر بدروح کے اندھے پن کا حملہ نہیں ہوا تھا اور میں پولیس ہیڈ کوارٹر سے فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

میں قلعے کے اندر داخل ہو گیا۔ قلعے کی ڈیوڑھی کی چھت اتنی اونچی تھی کہ مجھے نظر ہی نہیں آرہی تھی۔ نجیب آباد کے بہادر مجاہد اور اسلام کے شہید نواب نجیب الدولہ نے واقعی یہ ایک بہت عظیم الشان اور پرشکوہ قلعہ بنوایا تھا۔ مجھے قلعے کی تیسری برجی کے نیچے جو دروازہ تھا وہاں جانا تھا۔ میں نے یہ دروازہ پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ شہید خاتون کی روح نے کہا تھا کہ یہ دروازہ قلعے کی تیسری برجی کے سائے میں ہے اور بند ہوگا۔ وہاں

تمہیں ایک بزرگ ملے گا جو تمہارے ماضی کے سفر میں تمہاری راہنمائی کرے گا۔ میں قلعے کے وسیع وکشادہ صحن میں آکر رک گیا۔ آسمان پر بادل ہی بادل تھے۔ ان کے پیچھے ستارے تھے جن کی چمک کی وجہ سے بادلوں میں بہت دھندلی دھندلی روشنی جھلک رہی تھی۔ اس کے پس منظر میں میں نے قلعے کی دیوار کے اوپر چاروں طرف نگاہ دوڑائی۔ مجھے دائیں سے بائیں جانب دیوار کے اوپر بنی ہوئی چھتری نما چار برجیوں کے خاکے نظر آئے۔ میں تیسری برجی کی طرف بڑھا ابھی تک میری آنکھوں کی بینائی قائم تھی اور میں دیکھ سکتا تھا۔ تیسری برجی کے نیچے تاریکی چھائی ہوئی تھی۔

میں اندھیرے میں غور سے دیکھنے کی کوشش کرتے ہوئے تیسری برجی کی زیریں دیوار کے پاس آیا۔ یہاں مجھے ایک دروازے کے سیاہ نقوش سے دکھائی دیئے۔ یہی وہ دروازہ تھا جس کی نسبت کجلی بن کی شہید خاتون نے مجھے سب کچھ بتایا تھا۔ کہ وہاں جاکر ایک طرف خاموش کھڑے ہوجانا۔ میں نے بند دروازے کو ہاتھ لگا کر محسوس کیا۔ دروازہ لوہے کی طرح سخت لکڑی کا تھا جس کے تختوں میں سے کیل باہر نکلے ہوئے تھے۔ دروازہ اتنی مضبوطی سے بند تھا کہ لگتا تھا اب کبھی نہیں کھلے گا۔ میں شہید خاتون کی ہدایت کے مطابق ایک طرف ہو کر خاموش کھڑا ہوگیا۔ رات کی تاریکی اور سکوت میں ایک عجیب سی دہشت تھی۔ لگتا تھا جیسے ابھی یہ تاریکی اور خاموشی ایک عفریت بن کر مجھے نگل لے گی۔ اس سے قبل مجھے اتنی ہیبت ناک رات کا کبھی سامنا نہیں ہوا تھا۔

میں نے دل میں کلمہ پاک کا ورد شروع کر دیا۔

نہ جانے کتنی دیر تک میں ساکت کھڑا رہا ہوں گا کہ اچانک مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی میرے بالکل قریب کھڑا سانس لے رہا ہے۔ میں نے کوئی حرکت نہ کی اور اسی طرح چپ چاپ نظریں جھکائے کھڑا رہا۔ تاریکی میں ویسے بھی کچھ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ اچانک ایک چرچراہٹ کے ساتھ دروازے کا پٹ کھل گیا۔ میں نے دیکھا کہ ادھ کھلے دروازے میں سے گلابی رنگت کی ملائم روشنی باہر نکل رہی ہے۔ پھر اس روشنی میں سفید وبراق لباس والے ایک بزرگ نمودار ہوئے۔ انہوں نے بڑی شیریں آواز میں کہا۔

"اندر چلے آؤ"

اور وہ بزرگ دروازے میں سے ایک طرف ہٹ گئے۔ میں نے دل میں اللہ تعالیٰ سے اپنی عافیت کی دعا مانگی اور دروازے میں داخل ہوگیا۔ میرے داخل ہونے کے ساتھ ہی دروازہ چرچراہٹ کی آواز کے ساتھ دوبارہ بند ہوگیا۔ میں نے دیکھا کہ میں ایک کشادہ سرنگ میں ہوں جس میں گلابی روشنی ہی روشنی ہے۔ وہی بزرگ میرے دائیں جانب کھڑے میری طرف پرشفقت نظروں سے دیکھ رہے ہیں۔ میں انہیں کچھ کہنے لگا تو وہ اسی پرسکون لہجے میں بولے۔

"تم جو پوچھنا چاہتے ہو مجھے معلوم ہے۔ شہید خاتون نے مجھے تمہاری راہنمائی کے لئے یہاں بھیجا ہے۔ میرے ساتھ ساتھ چلے آؤ"

میں روشن اور کشادہ سرنگ میں بزرگ کے ساتھ چل پڑا۔ روشنی سے فضا لبریز تھی۔ مجھے سرنگ کی دیواروں کا ایک ایک پتھر صاف نظر آرہا تھا۔ چلتے چلتے میری آنکھوں پر ایک دباؤ سا پڑا اور میری آنکھوں کے آگے ایک دم اندھیرا چھا گیا۔ مجھ پر بدروح چندریکا کا حملہ ہو چکا تھا اور میری بینائی ایک بار پھر جاتی رہی تھی۔ میں آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر وہیں رک گیا۔

"بزرگ محترم! مجھ پر اس بیماری نے حملہ کر دیا ہے جس کے علاج کی خاطر مجھے آپ کے پاس بھیجا گیا ہے۔ میری بینائی جاتی رہی ہے۔ مجھے کچھ دکھائی نہیں دے رہا۔ میری آنکھوں میں اندھیرا ہی اندھیرا ہے"

مجھے اپنے کندھے پر محترم بزرگ کے شفیق ہاتھ کا لمس محسوس ہوا۔ بزرگ نے کہا۔

"اللہ کے حکم سے تمہیں بہت جلد اس بیماری سے نجات مل جائے گی۔ میرا ہاتھ پکڑ کر چلتے رہو"

میں نے بزرگ کا ہاتھ تھام لیا اور وہ مجھے اپنے ساتھ ساتھ چلانے لگے۔ میں نے ان سے پوچھا۔

"محترم بزرگ! کیا سچ مچ مجھے اس منحوس بیماری کے علاج کے لئے ماضی کے زمانے میں آج سے سینکڑوں برس پیچھے جانا ہوگا؟ کیا آج کی دنیا میں رہ کر اس کا علاج نہیں ہو سکتا؟"

محترم بزرگ نے کہا۔

"ماضی حال اور مستقبل یہ سب ہم نے وقت کو تین حصوں میں بانٹ کر ان کے نام رکھ لئے ہیں۔ حقیقت میں وقت کا نہ کوئی ماضی ہے۔ نہ کوئی حال ہے نہ کوئی مستقبل ہے"

محترم بزرگ کی یہ بات میری سمجھ میں بالکل نہ آئی۔ انہوں نے مجھے سمجھانے کی کوشش بھی نہ کی۔ جب میں نے سوال کیا کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک آدمی آج کے زمانے سے نکل کر آج سے سینکڑوں برس بلکہ ہزاروں برس پرانے ماضی کے زمانے میں پہنچ جائے تو محترم بزرگ نے جواب میں فرمایا۔

"یہ بات نہ میں تمہیں سمجھا سکوں گا۔ نہ تم سمجھ سکو گے۔ لیکن میں اتنا ضرور تمہیں بتا دینا چاہتا ہوں کہ مشیت خداوندی کے اشارے سے ماضی کے زمانے میں جا رہے ہو۔ تم اسلام کے شیر ہو۔ تم اپنی زندگی پاکستان کی سلامتی' جہاد کشمیر اور اسلام کی سربلندی کے لئے وقف کر دی ہوئی ہے۔ تم نے اس عمر میں اپنا وطن' اپنے گھر کی آسائش و آرام کو چھوڑ کر جہاد کشمیر میں کفار کے خلاف جنگ کرنے اسلام کی سربلندی اور پاکستان کو دشمنوں کے مذموم حملوں سے محفوظ رکھنے کے لئے نکلے ہو۔ جب تمہاری عمر کے نوجوان دولت' شہرت اور اپنا کیریئر بنانے کے لئے امریکہ اور یورپ کے ملکوں کے ویزے حاصل کرنے کے چکر میں پھنس جاتے ہیں۔ لیکن تمہارے دل میں اسلام کی شمع روشن تھی۔ تمہارا دل مظلوم کشمیریوں پر بھارتی فوج کے مظالم دیکھ کر خون کے آنسو روتا تھا۔ اور پھر تم نے اپنا ماضی' حال اور مستقبل اور پورا کیریئر ایک نیک اور اعلیٰ مقصد کی خاطر قربان کر دیا اور اپنے طور پر اکیلے گھر سے نکل کر دشمن کافروں کی سرزمین میں جا پہنچے۔ شب و روز کمانڈو کی سخت تربیت حاصل کی اور جان کی بازی لگا کر جہاد کشمیر میں نعرہ حق بلند کیا۔ مشیت

ایزدی تمہارے کردار کے اس پہلو پر راضی ہے اور وہ تمہیں ایک خاص طاقت عطا کرنے کے واسطے ماضی کے زمانے میں پہنچانا چاہتی ہے۔ جہاں تمہیں اپنی آنکھوں پر اچانک حملہ کرنے والی بدروح سے بھی ہمیشہ کے لئے نجات مل جائے گی اور اس کے ساتھ ہی ساتھ تمہارے اندر ایک ایسی روحانی طاقت پیدا ہو جائے گی کہ جب تم واپس اس دنیا میں آؤ گے تو تم اسلام کے سچے کمانڈو بن چکے ہوگے۔ یہی مشیت ایزدی کی مرضی ہے"

میں محترم بزرگ کی باتیں بڑے غور سے سن رہا تھا۔ ہم ساتھ ساتھ چلتے بھی جا رہے تھے۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے جس سرنگ میں ہم چلے جا رہے ہیں وہ کبھی ختم نہیں ہوگی۔ میں نے محترم بزرگ سے کہا۔

"لیکن محترم بزرگ! میرے پاس اتنا وقت نہیں ہے۔ کشمیر میں غاصب بھارتی فوجوں نے کشمیری مسلمانوں کے خلاف اپنی ظالمانہ سرگرمیاں تیز کر دی ہیں۔ بھارت نے پاکستان پر حملے کا ناپاک منصوبہ تیار کر لیا ہے۔ وہ کسی بھی وقت پاکستان پر حملہ کر سکتا ہے۔ میں اگر ماضی میں چلا گیا تو ہو سکتا ہے وہاں مجھے بہت وقت گزر جائے۔ میں کربلا کا میدان چھوڑ کر نہیں جانا چاہتا۔"

انہوں نے فرمایا۔ "اس کی تم فکر نہ کرو۔ ماضی اور مستقبل میں وقت کی رفتار وہ نہیں ہے جو حال کے زمانے میں ہے۔ اگر تم ماضی کے زمانے میں ایک سو سال بلکہ ایک ہزار برس بھی رہ کر جب واپس آؤ گے تو اس دنیا کا صرف ایک دن ہی گزرا ہوگا"

میں نے کہا۔

"مگر محترم بزرگ مجھے بتایا گیا ہے کہ مجھے چار ہزار برس ماضی میں پیچھے کی طرف جانا ہوگا جہاں اللہ کا ایک برگزیدہ پیغمبر میری بیماری کا علاج کرے گا۔ مجھے تو کچھ بھی معلوم نہیں کہ چار ہزار سال پرانے زمانے میں میں کس کے پاس جاؤں گا۔ کون مجھے اللہ کے بزرگ پیغمبر کے پاس لے جائے گا۔ ان کی زبان تو کچھ اور ہی ہوگی۔ میں ان کی زبان کیسے سمجھوں گا وہ میری زبان کیسے سمجھیں گے۔"

انہوں نے کہا۔

"آج سے چار ہزار سال پہلے کے زمانے میں پہنچتے ہی تمہیں ایک لڑکی ملے گی جو تمہاری راہنمائی کرے گی۔ اس زمانے کی فضا میں پہنچتے ہی وہاں کے لوگوں کی زبان تمہیں اپنے آپ سمجھ میں آجائے گی۔ اور تم بھی وہ زبان بولنے لگو گے۔"

میں نے کہا۔

"کیا ماضی کے زمانے میں جانے کے بعد بھی مجھ پر چندریکا کی بدروح کا حملہ ہوتا رہے گا؟ کیا وہاں بھی تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد میری آنکھوں کی بینائی جاتی رہے گی؟"

محترم بزرگ نے کہا۔

"نہیں وہاں ایسا نہیں ہوگا۔ یہ صرف تمہاری دنیا میں ہی ہوتا ہے۔ لیکن جب تم ماضی کے زمانے میں اسلام کے مجاہد محمد بن قاسم اور طارق بن زیاد اور شیر اسلام سلطان صلاح الدین ایوبی سے ملاقات کا شرف حاصل کرنے کے بعد اسلام کے شیر دل کمانڈو بن کر اور ایک نئی طاقت حاصل کر کے واپس انڈیا میں آؤ گے تم اس بیماری سے ہمیشہ کے لئے نجات حاصل کر چکے ہوگے۔ پھر چندریکا تو کیا بھارت کی کوئی طاقتور سے طاقتور بدروح بھی تمہارے نزدیک نہیں پھٹک سکے گی۔ اب ماضی کے زمانے میں جانے کے لئے تیار ہو جاؤ۔"

میں نے کہا۔

"مگر مجھے تو کچھ دکھائی نہیں دے رہا"

محترم بزرگ نے کہا۔

"جب ماضی کے زمانے کا پراسرار دروازہ کھلے گا تو تم سب کچھ دیکھ سکو گے"

بزرگ نے مجھے بازو سے تھاما ہوا تھا اور وہ مجھے بھی اپنے ساتھ ساتھ چلا رہے تھے۔ ایک جگہ وہ رک گئے میں بھی رک گیا۔ انہوں نے کہا۔

"میں دیکھ رہا ہوں کہ تمہاری آنکھوں کی بینائی واپس آرہی ہے۔"

میں نے بھی اپنی آنکھوں کے آگے ستارے سے چمکتے دیکھے۔ اس کے فوراً بعد میری بینائی معمول کے مطابق واپس آگئی۔ کیا دیکھتا ہوں کہ ہم اسی سرنگ میں ایک ایسے مقام پر

کھڑے ہیں جہاں دس فٹ کے فاصلے پر سرنگ کی دیوار ہے۔ یہاں سرنگ بند ہو گئی تھی۔ سرنگ میں اب وہ گلابی روشنی نہیں تھی جو میں نے سرنگ میں داخل ہوتے ہوئے دیکھی تھی۔ ہمارے چاروں طرف نیم اندھیرا تھا۔ اس اندھیرے میں سرنگ کی سامنے والی دیوار پر نیلے رنگ کی بڑی پھیکی سی روشنی جھلملا رہی تھی۔ اس روشنی میں ننھے ننھے لاکھوں ستارے چمک رہے تھے۔ محترم بزرگ نے کہا۔

"یہ ماضی کا دروازہ ہے۔ تم اس دروازے سے گزر کر آج سے چار ہزار سال پہلے کے زمانے میں پہنچ جاؤ گے۔"

میری عقل میں یہ بات بالکل نہیں آرہی تھی۔ کسی وقت محسوس ہوتا کہ میں کوئی خواب دیکھ رہا ہوں اور جیسے ہی میں ماضی کے دروازے کی طرف قدم بڑھاؤں گا میری آنکھ کھل جائے گی اور میں نجیب آباد کے پولیس ہیڈ کوارٹر کے ٹارچر سیل میں قید میں پڑا ہوں گا۔ اور مجھ پر یہ انکشاف ہوگا کہ میں نے ٹارچر سیل کی چارپائی پر لیٹے ہوئے ایک خواب دیکھا تھا۔ میں کوئی سائنس دان نہیں تھا۔ میں کوئی آئن سٹائن نہیں تھا کہ ماضی حال اور مستقبل کے وقت کی رفتار کو سمجھ سکتا۔ میرا ذہن اسے تسلیم کرنے کے لئے ہرگز تیار نہیں تھا کہ میں سن 1965ء کے زمانے سے نکل کر تین ہزار سال قبل مسیح کے زمانے میں داخل ہو جاؤں گا۔ بزرگ نے میرے بازو کو چھوڑ دیا میرا دل تجسس کے مارے زور سے دھڑکنے لگا۔ بزرگ نے فرمایا۔

"اپنے دل کو قابو میں رکھو۔ اپنا دھیان اللہ کی طرف لگالو۔ اور یاد رکھو اللہ ہر شے پر قادر ہے۔ وہ قادر مطلق ہے"

ایک لمحہ کے لئے وہاں گہری خاموشی چھا گئی۔ بزرگ بھی چپ تھے۔ میں بھی خاموش تھا اور سامنے دیوار پر چمکتی دھندلی دھندلی روشنی کو دیکھ رہا تھا۔ بزرگ کی آواز آئی۔

"جو لڑکی تمہیں ماضی کے دروازے میں سے گزرنے کے بعد ملے گی اور تمہاری راہ نمائی کرے گی اس کا نام سوسن ہوگا۔ اس نے اپنے سیاہ بالوں میں سوسن کے نیلے پھول لگائے ہوں گے۔ وہ تمہیں پہچان لے گی۔ وہ خود تمہارے پاس آئے گی۔ اس کے بعد وہ

تمہیں اللہ کے اس برگزیدہ بندے کے پاس لے جائے گی جو تمہارے سر پر سے بدروح کا سایہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ختم کر دے گا اور تمہیں بتائے گا کہ کفر کا مقابلہ کرنے کے لئے تمہیں کس جگہ سے اسلام کی ناقابل شکست طاقت ملے گی۔"

میں سامنے دیوار کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس وقت تک میری آنکھوں کی بینائی واپس آچکی تھی اور اب اسے معمول کے مطابق کچھ وقت کے بعد دوبارہ میری آنکھوں سے جدا ہو جانا تھا۔ دیوار پر روشنی آہستہ آہستہ بڑھنے لگی تھی۔ روشنی پہلے سلیٹی رنگ کی تھی پھر وہ سفید ہونے لگی۔ اس کے ساتھ ہی دیوار میں ایک محراب دار دروازہ نمودار ہو گیا۔ اس دروازے کے باہر میں نے دن کی روشنی میں ایک منظر دیکھا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ دور تک صحرا ہے۔ ریت کے ٹیلے پھیلتے چلے گئے ہیں۔ دروازے کے قریب ہی کھجور کے درختوں کے جھنڈ ہیں۔ ایک چشمہ بہہ رہا ہے۔ یہ کوئی نخلستان ہے۔ نیلے آسمان پر سورج چمک رہا ہے۔ کوئی انسان دکھائی نہیں دے رہا۔ محترم بزرگ نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"جاؤ تاریخ کے حیرت انگیز منظر' قوموں کے عروج وزوال کے انقلاب اور اللہ کا وہ بزرگ پیغمبر تمہارا انتظار کر رہا ہے جو اللہ کے حکم سے تمہاری بیماری کا علاج کرے گا اور جو لوگوں کو حضور پاک ﷺ سید المرسلین ﷺ کی دنیا میں تشریف آوری کی خوش خبری سنا رہا ہو گا"

یقین کریں اس وقت میرا دل ایسے دھڑک رہا تھا جیسے ابھی سینے سے باہر آجائے گا۔ آج بھی جب میں اس وقت کو یاد کرتا ہوں تو ایک لمحے کے لئے میرے دل کی دھڑکن تیز ہو جاتی ہے۔ میں دل میں کلمہ پاک کا ورد کر رہا تھا۔ میں نے قدم آگے بڑھایا۔ پھر میں دیوار میں نمودار ہونے والے محرابی دروازے میں داخل ہو گیا اس لمحے مجھے ایسے محسوس ہوا جیسے ایک گہرے سکون کی لہر میرے جسم کے اندر سے گزر گئی ہے۔ میرے دل کی دھڑکن معمول پر آگئی۔ میرے اعصاب ایک دم پر سکون ہو گئے۔ میں نے پلٹ کر محترم بزرگ کو یہ بتانا چاہا کہ میں خیریت سے ماضی کے زمانے میں داخل ہو گیا ہوں جیسے ہی میں

نے پیچھے دیکھا پیچھے نہ وہ غار تھا نہ غار کا محرابی دروازہ تھا اور نہ وہ محترم بزرگ ہی تھے۔

پیچھے جہاں غار کا دروازہ تھا وہاں دور حد نگاہ تک صحرا ہی صحرا تھا۔ آسمان پر سورج چمک رہا تھا اور گرم دھوپ کی تپش سے فضا لبریز تھی۔ یہ صحرا کی تپش تھی۔ مگر حیرت کی بات یہ تھی کہ مجھے وہ گرمی' وہ تپش محسوس نہیں ہو رہی تھی جو صحراؤں میں دن کے وقت محسوس ہوتی ہے جب سورج آگ برسا رہا ہوتا ہے۔ میں پتلون قمیض میں تھا۔ اتنا مجھے یقین ہو گیا تھا کہ میں وقت کی سرحد عبور کر کے ماضی میں پہنچ چکا ہوں۔ لیکن میں تاریخ کے کس دور میں پہنچا ہوں؟ یہ مجھے معلوم نہیں تھا۔ میں نے چاروں طرف دیکھا۔ مجھے وہ لڑکی کہیں نظر نہ آئی جس کے بارے میں محترم بزرگ نے فرمایا تھا کہ وہ میری راہ نمائی کرے گی اور اس کا نام سوسن ہو گا اور اس نے اپنے سیاہ بالوں میں سوسن کے نیلے پھول سجائے ہوں گے۔ میں نخلستان میں آکر کھجور کے درختوں کے نیچے بیٹھ گیا۔ یہاں ٹھنڈے شفاف پانی کا چشمہ بہہ رہا تھا۔ میں نے چلو میں چشمے کا پانی بھر کر پیا۔ پانی ٹھنڈا اور میٹھا تھا۔ مجھے لاہور کراچی کا پانی یاد آگیا۔ اپنے وطن پاکستان کا پانی یاد آگیا جو نہ جانے کیسی کیسی مشینوں کے ذریعے صاف کر کے پینے والوں تک پہنچایا جاتا تھا۔

کھجور کے درختوں پر کوئی پرندہ بھی نہیں تھا۔ ایک عجیب سا سکوت طاری تھا۔ ایک لمحے کے لئے میرے دل میں خیال آیا کہ میرے ساتھ کوئی کرامت ہو گئی ہے۔ میں ماضی کے زمانے میں بالکل نہیں پہنچا بلکہ یہ دوبئی یا سعودی عرب کا کوئی صحرائی علاقہ ہے۔ ابھی آسمان پر سے عرب امارات یا پی آئی اے یا برٹش ایئرویز کا کوئی جمبو جیٹ ضرور گزرے گا۔ میرے پاس کوئی گھڑی وغیرہ بھی نہیں تھی۔ صرف جیب میں زہریلی سوئیوں والی بال پوائنٹ پنسل ہی تھی۔ میں نے ایک اونٹ کو دیکھا جو ریت کے ایک ٹیلے میں سے نکل کر میری طرف بڑھ رہا تھا۔ اس پر ایک سوار بیٹھا تھا۔ میری نگاہیں اس پر جم گئیں یہ کون ہو سکتا ہے۔ ضرور صحرا کا کوئی مسافر ہو گا جو نخلستان میں تھوڑی دیر آرام کرنے آرہا ہو گا۔ جب یہ سوار قریب آیا تو میں نے دیکھا کہ اونٹ پر ایک لڑکی بیٹھی ہوئی تھی۔ تب اچانک مجھے اس لڑکی کا خیال آگیا جس نے مجھے یہاں ملنا تھا اور سفر میں میری راہ نمائی کرنی تھی۔

اونٹ جب آکر رک گیا لڑکی نے اونٹ کو بٹھایا اور خود کجاوے میں سے اتر کر میرے پاس آگئی۔ اس کے سیاہ بالوں میں سوسن کے نیلے پھول لگے تھے۔ اس نے سرخ سبز اور سیاہ دھاری دار لمبا کرتہ پہن رکھا تھا جو اس کے ٹخنوں تک پہنچا ہوا تھا۔ اس کا رنگ سانولا تھا۔ چہرے کے نقوش بڑے دلکش تھے۔ دونوں رخساروں اور ٹھوڑی کے درمیان خال کے سبز نقطے بنے ہوئے تھے۔ سیاہ بالوں کی ایک لٹ چہرے پر لٹک رہی تھی۔ اس نے میری طرف مسکرا کر دیکھتے ہوئے میرا نام لیا اور کہا۔

"میرا نام سوسن ہے۔ مجھے تمہاری راہ نمائی کے لئے بھیجا گیا ہے۔"

یہ جملہ اس نے ایک ایسی زبان میں بولا تھا جو میرے لئے بالکل اجنبی تھی۔ جسے میں نے پہلے کبھی نہیں سنا تھا۔ لیکن عجیب بات تھی کہ میں اس زبان کا ایک ایک لفظ سمجھ گیا تھا اور پھر میں نے اسی زبان میں اس سے کہا۔

"سوسن! تمہارا شکریہ کہ تم میری راہ نمائی کے لئے یہاں آئی ہو۔ لیکن یہ بتاؤ کہ کیا واقعی میں ماضی کے زمانے میں آگیا ہوں یا یہ محض نظر کا فریب ہے؟"

سوسن میرے سامنے چشمے کے پاس آکر بیٹھ گئی۔ اس نے چشمے کے پانی کا ایک گھونٹ پیا۔ سر کو ذرا سا جھٹک کر چہرے پر آئی ہوئی سیاہ بالوں کی لٹ پیچھے کی اور بولی۔

"نہیں یہ نظر کا فریب نہیں ہے۔ یہ حقیقت ہے۔ تم ماضی میں بہت پیچھے کے زمانے میں آگئے ہو"

میں اس بات پر بھی سخت حیران تھا کہ میں ایک اجنبی اور بالکل ہی غیر مانوس زبان اتنی روانی سے کیسے بول لیتا ہوں۔ میں بس اس کی طرف حیرت زدہ آنکھوں سے تک رہا تھا۔ ابھی کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ میں حقیقی دنیا میں ہوں کہ کوئی خواب دیکھ رہا ہوں۔ ابھی تک میں تذبذب اور غیر یقینی کی حالت میں تھا۔ کبھی محسوس ہوتا کہ میں سچ مچ تاریخ کے کسی پرانے دور میں آگیا ہوں۔ کبھی محسوس ہوتا کہ نہیں میں سعودی عرب یا دبئی کے کسی صحرا میں ہوں۔ میری راہ نما لڑکی سوسن شاید میری ان کیفیات کو بھانپ گئی تھی۔ کہنے لگی۔

"اگر تم وہ زبان سمجھ رہے ہو اور روانی سے بولنے بھی لگے ہو جو تم نے آج تک نہیں سنی تھی۔ آج تک نہیں بولی تھی تو پھر تمہیں یقین کیوں نہیں آتا کہ تم بیسویں صدی عیسوی سے نکل کر بہت پیچھے ماضی کے زمانے میں آگئے ہو؟"

میں سوسن کو خالی خالی نظروں سے تک رہا تھا۔ میں نے کہا۔

"تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ لیکن میں کمپیوٹر جمبو جیٹ طیاروں ایٹمی ٹیکنالوجی اور نیوکلر فزکس کے زمانے کا آدمی ہوں۔ کیسے یقین کرلوں کہ میں کوئی خواب نہیں دیکھ رہا؟"

سوسن نے کہا۔

"اپنے دل سے حیرت اور بے یقینی کی کیفیت کو نکال ڈالو۔ یہ سچ ہے کہ جو تجربہ تم اس وقت کر رہے ہو ایسا تجربہ کرنے کی کسی عام انسان کو اجازت نہیں دی جاسکتی۔ لیکن تم پر یہ خاص عنایت اس لئے کی گئی ہے کہ تمہارے دل میں ایک سچے مومن' ایک سچے مسلمان کی تڑپ موجود ہے۔ تمہاری جوانی بے داغ رہی ہے۔ تم نے قرآن پاک کی حرمت اور اسلام کی سربلندی کی خاطر صرف اپنا گھربار اور جوانی کا عیش و آرام ہی قربان نہیں کیا بلکہ مسلمانوں کے دشمن ملک میں آکر اپنی جان کو قدم قدم پر خطروں میں ڈالا ہے۔ دشمنوں کی وحشیانہ اذیتیں برداشت کی ہیں۔ ان کے جان لیوا ٹارچر برداشت کئے ہیں۔ اسی لئے قدرت نے تمہیں اسلام کی ترویج پاکستان کی سلامتی اور کشمیری مسلمانوں کے جائز حقوق کی خاطر جہاد کرنے کے لئے چنا ہے۔ تم ضرور حیران ہو رہے ہوگے کہ مجھے ان باتوں کا کیسے علم ہوگیا ہے۔ جب مجھے تمہاری راہ نمائی کے لئے منتخب کیا گیا تھا تو محترم بزرگ نے مجھے طلوع اسلام سے لے کر تشکیل پاکستان تک کی ساری تاریخ سے آگاہ کر دیا تھا۔ اب میرے سامنے اسلام کی تاریخ کے تمام درخشاں باب کھلے ہیں۔ یاد رکھو۔ پاکستان کا قیام قدرت خداوندی کے حکم سے عمل میں آیا ہے۔ ہمارا رب' رب العالمین ہے اور اسلام تمام جہانوں کا مذہب ہے۔ اس کا نور تمام جہانوں' تمام عالموں میں پھیلا ہوا ہے۔ برصغیر ہندوستان بھی ایک روز اسلام کی روشنی سے جگمگا اٹھے گا۔ پاکستان اسلام کے نور کی وہ شمع ہے جہاں سے رشد وہدایت کا یہ نور ہمالیہ کی چوٹیوں سے لے کر جنوبی ہند

کے خطوں کو ایک دن روشن کرنے والا ہے۔ پاکستان کے ہر دور میں اسلام کے مجاہدوں، غازیوں اور شہیدوں نے دین کی سربلندی کے لئے بڑی بڑی قربانیاں دی ہیں۔ ہندوستان میں سلطان ٹیپو، سراج الدولہ، شاہ ولی اللہؒ، سید احمد شہیدؒ نواب نجیب الدولہ سے لے کر قائداعظم محمد علی جناح تک یہ سب ایک ہی نصب العین کا عمل مسلسل ہے۔ تمہیں بھی اسلام کی روشنی کو پھیلانے اور اس کی عظمت رفتہ کو برصغیر میں پھر سے بحال کرنے کے مشن پر تعینات کیا گیا ہے۔ ماضی، حال اور مستقبل کے وسوسوں کو دل سے نکال کر باہر پھینک دو۔ تمہیں بہت جلد ایک ایسی طاقت عطا کی جانے والی ہے جو اس وقت مادی دنیا میں تمہاری مدد کرے گی جب تم ماضی کے زمانے سے نکل کر اپنے 1965ء عیسوی کے زمانے میں واپس جاؤ گے۔"

سوسن خاموش ہو گئی۔ اس کی گفتگو نے مجھے بے حد طاقت دی تھی۔ میرے دل سے تمام وسوسوں اور اندیشوں کو دور کر دیا تھا۔ میں نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر کلمہ پڑھا اور کہا۔

"سوسن بہن! تم نے میرے دل سے شک شبے کے اندھیروں کو بھگا دیا ہے۔ میں اپنے آپ کو دنیا کا خوش قسمت انسان سمجھتا ہوں کہ مجھے اسلام کی خدمت اور دین کی سربلندی کے کام کے لئے چنا گیا ہے۔ میں قسم کھاتا ہوں کہ اب میں کبھی اپنے دل میں بے یقینی کے خیالات کو داخل نہیں ہونے دوں گا۔ میری جان اللہ کے پاک نام پر، اس کے کلام پاک پر، اس کے رسول پاک ﷺ پر ایک بار ہی نہیں ہزار بار لاکھ بار قربان"

مجھے یاد ہے اس وقت میرے ہونٹ شدت جذبات سے کپکپا رہے تھے اور میرے سارے بدن پر رقت طاری ہو گئی تھی۔ سوسن کا چہرہ مسرت سے چمکنے لگا۔ اس نے کہا۔

"اللہ تعالیٰ تمہیں ایسی ہی توفیق عطا کرے۔ اب سنو! میں تمہیں بتاتی ہوں کہ تم تاریخ کے کون سے دور میں آ گئے ہو اور کونسی زبان میں مجھ سے باتیں کر رہے ہو۔"

سوسن نے مجھے بتایا کہ میں تین ہزار سال قبل مسیحؑ کے زمانے میں پہنچ چکا تھا۔ یعنی آج سے تقریباً پانچ ہزار سال پیچھے چلا گیا تھا اور جس زبان میں وہ مجھ سے باتیں کر رہی تھی

اور میں اس سے باتیں کر رہا تھا وہ سمیری زبان تھی اور میں بصرہ کے قریب تقریباً پچاس میل کے فاصلے پر شہر لگاش کے ایک صحرائی نخلستان میں تھا۔ اب میں حیران نہیں تھا۔ مجھے یقین ہو گیا تھا کہ میں واقعی 1965ء کے بھارت کے شہر نجیب آباد کے پتھر گڑھ قلعے سے نکل کر پانچ ہزار سال پرانے زمانے میں آ گیا ہوں۔

میں اور سوسن وہیں نخلستان میں چشمے کے پاس بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ میں نے اسے بتایا کہ مجھے اتنی زیادہ گرمی محسوس نہیں ہو رہی جتنی ایک عام آدمی کو اس تپتے صحرا میں لگنی چاہئے۔

"میں دیکھ رہا ہوں کہ تمہاری پیشانی پر بھی پسینے کے قطرے ہیں۔ لیکن مجھے اتنی گرمی نہیں لگ رہی۔ کیا ماضی کے زمانے میں آنے سے میرے جسم اور مزاج پر بھی اثر پڑا ہے؟"

سوسن نے کہا۔

"صرف اتنا فرق پڑا ہے کہ تمہیں موسم کی گرمی سردی کا شدت سے احساس نہیں ہوگا۔"

ایک سوال قدرتی طور پر میرے ذہن میں پیدا ہو چکا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا۔

"میں بہت آگے کے زمانے سے ماضی میں آیا ہوں۔ مجھے یہ بتاؤ کہ اگر یہاں حق و باطل کی کسی جنگ میں میں قتل ہو گیا تو کیا میں واقعی مر جاؤں گا؟"

سوسن مسکرائی۔ کہنے لگی۔

"تم نے بڑا اچھا سوال پوچھا ہے۔ تم مرو گے نہیں۔ کیونکہ تمہاری موت ماضی میں نہیں ہو سکتی۔ تم جب بھی مرو گے اپنے حال یعنی سن 1965ء عیسوی کے آگے کے کسی زمانے میں مرو گے۔"

میں نے سوسن کو اپنی جیب سے زہریلی سوئیوں والی بال پوائنٹ پنسل نکال کر دکھائی

اور جب اس ہلاکت خیز بال پوائنٹ کی خصوصیات بیان کرنے لگا تو وہ بولی۔

"تمہیں کچھ بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔ تمہاری ایک ایک بات، تمہارا ایک ایک راز مجھ پر کھول دیا گیا ہے۔ میں جانتی ہوں اس بال پوائنٹ پنسل میں انتہائی مہلک زہر میں بجھی ہوئی سوئیاں ہیں۔ اسے اپنے پاس ہی سنبھال کر رکھو۔ یہ ماضی کے سفر میں تمہیں تمہارے دشمنوں سے محفوظ رکھے گی۔"

میں نے سوسن سے ایک اور بڑا ضروری سوال پوچھا۔ میں نے کہا۔

"میں ایک اور بات کی بھی وضاحت چاہتا ہوں۔ مجھے یہ بتاؤ کہ اگر کسی وقت میں اپنے 1965ء عیسوی کے زمانے میں واپس جانا چاہوں تو کیا میں جا سکوں گا؟ کیونکہ پاکستان کا دشمن بھارت اس وقت پاکستان پر فوجی حملے کی تیاریاں کر رہا ہے۔ میں وہاں کے حالات سے بھی باخبر رہنا چاہتا ہوں تاکہ ضرورت کے وقت میں واپس جا کر وطن پاک پر حملہ کرنے والے دشمن کے خلاف جنگ میں حصہ لے سکوں۔"

سوسن کہنے لگی۔

"تم اگر محسوس کرو کہ تمہارا واپس اپنے زمانے میں جانا ضروری ہے تو تم اپنے دل میں پانچ بار کلمہ طیبہ پڑھ کر اپنے جسم پر پھونک مارنا۔ تم تاریخ کے قدیم دور سے غائب ہو کر اپنے زمانے میں اسی نجیب آباد والے قلعہ پتھر گڑھ کی سرنگ میں واپس پہنچ جاؤ گے۔"

میں نے دوسرا سوال کیا۔

"اور کیا میں دوبارہ ماضی کے زمانے میں واپس آسکوں گا؟"

سوسن نے کہا۔

"ماضی کے زمانے میں واپس آنے کے لئے بھی تمہیں کلمہ طیبہ والا عمل دہرانا ہوگا۔ لیکن اس میں ایک شرط ہوگی۔ شرط یہ ہوگی کہ ماضی کے زمانے میں واپس آنے کے لئے تمہیں کلمہ طیبہ کے ورد کے بعد قلعہ پتھر گڑھ کی سرنگ میں آنا ہوگا۔ اگر سرنگ کی دیوار میں محرابی دروازہ کھلا ہوا مل گیا تو تم ماضی میں واپس جا سکو گے۔ اگر محرابی دروازہ نمودار

نہ ہوا تو تم واپس نہ آسکو گے۔"

میں نے محسوس کیا کہ مجھے ماضی کے زمانے میں آئے کافی وقت گزر گیا ہے۔ لیکن مجھ پر چندریکا کی بدروح کا حملہ نہیں ہوا اور میری بینائی ابھی تک قائم ہے۔ اگرچہ محترم بزرگ نے مجھے بتا دیا تھا کہ عہد ماضی میں مجھ پر بدروح کا کوئی اثر نہیں ہوگا۔ اس کا اثر صرف میرے زمانے یعنی 1965ء کے زمانے تک ہی محدود ہے لیکن میں سوسن سے اس کی تصدیق کرنا چاہتا تھا۔ جب میں نے اس سے یہ سوال پوچھا تو وہ بولی۔

"محترم بزرگ نے تمہیں جو کچھ کہا تھا وہ سچ تھا۔ جس دور میں اس وقت تم آچکے ہو یہاں چندریکا کی بدروح کا اثر بیکار ہو چکا ہے۔ لیکن اگر تم اپنی اس ناگہانی آفت کا علاج کرائے بغیر اپنے زمانے میں واپس جاؤ گے تو پھر اسی مصیبت میں پھنس جاؤ گے اور وقفے وقفے کے بعد تمہاری بینائی معطل ہوتی رہے گی۔"

اس کے بعد سوسن نے کہا۔

"اب ہم سب سے پہلے اللہ کے اس بزرگ بندے کی خدمت میں حاضر ہوں گے جو تمہاری اس بیماری کا علاج کرے گا۔"

میں نے پوچھا۔

"اللہ کا یہ بزرگ بندہ ہمیں کہاں ملے گا؟"

سوسن بولی۔

"اس صحرا میں شہر لگاش کے جنوب میں پتھریلی ریت کا پہاڑی سلسلہ ہے۔ وہ بزرگ پیغمبر اور اللہ کا نیک بندہ ہمیں ان پہاڑیوں میں ملے گا۔ مگر سب سے پہلے تم اپنا یہ کمانڈو کا لباس بدل کر ہمارے زمانے کا لباس پہنو گے۔ جو میں تمہارے لئے اپنے ساتھ لائی ہوں۔"

سوسن اٹھ کر اونٹ کے پاس گئی اور وہاں سے چمڑے کا ایک تھیلا لے آئی۔ تھیلے کو کھول کر اس نے مجھے ایک لمبا کرتہ' سیاہ رنگ کی موٹے کپڑے کی کھلی شلوار' سر پر باندھنے کے لئے سیاہ اور نیلی دھاریوں والا پٹکا اور چمڑے کی تسموں والی چپل پہننے کو دی۔

میں یہ سب کچھ لے کر درختوں کی اوٹ میں چلا گیا۔ اپنا ماڈرن زمانے کا لباس یعنی تنگ جینز اور قمیض اتار کر سمیری عہد کے لوگوں کا لباس پہن لیا۔ میں نے زہریلی سوئیوں والی بال پوائنٹ پنسل اپنے موٹے اور لمبے سیاہ کرتے کی جیب میں سنبھال کر رکھ لی تھی۔ جب میں سوسن کے پاس آیا تو اس نے گردن ٹیڑھی کر کے مسکراتے ہوئے میرا جائزہ لیا اور بولی۔

"میرا بھائی کمانڈو سے سمیری شہزادہ بن گیا ہے۔"

میں نے سوسن کے سامنے بیٹھتے ہوئے کہا۔

"مجھے بھوک اور پیاس اسی طرح لگ رہی ہے جس طرح اپنے 1965ء کے زمانے میں لگا کرتی تھی۔"

وہ بولی۔

"اس میں کوئی تبدیلی نہیں آئے گی۔ لیکن وقت کا تم پر کوئی اثر نہیں ہوگا۔ یعنی تمہاری عمر کا ایک پل بھی نہیں بڑھے گا۔ تم جس عمر میں ماضی کے زمانے میں داخل ہوئے تھے اس عمر کے رہو گے۔ تمہاری ڈاڑھی مونچھوں کے بال اور ناخن بھی نہیں بڑھیں گے۔ ہاں جب تم اپنے زمانے میں واپس جاؤ گے تو عمر کے بڑھنے کا عمل دوبارہ شروع ہو جائے گا۔ میرا خیال ہے اب ہمیں یہاں سے اپنی منزل کی طرف روانہ ہو جانا چاہئے۔"

ہم اٹھ کر اونٹ کے پاس آگئے۔ اونٹ نے جی بھر کر چشمے کا پانی پی لیا تھا اور اب مزے سے بیٹھا جگالی کر رہا تھا۔ اس اونٹ کی کمر پر دو کوہان تھے۔ اور اس پر دو کجاوے بنے ہوئے تھے۔ اگلے کجاوے پر سوسن بیٹھ گئی۔ پچھلے کجاوے پر میں بیٹھ گیا۔ سوسن نے اونٹ کے شانے پر ہاتھ رکھ کر دبایا۔ پھر باگ اوپر کو کھینچی۔ اونٹ اٹھ کھڑا ہوا۔ سوسن نے اسے نخلستان سے نکال کر صحرائی راستے پر ڈال دیا۔ میں نے سوسن سے کہا۔

"صرف ایک سوال پوچھنا باقی رہ گیا ہے۔ مجھے یہ بتاؤ کہ جب میں ماضی کے زمانے سے نکل کر اپنے زمانے میں جاؤں گا تو کیا وہاں بہت وقت گزر چکا ہوگا۔ یا اتنا ہی وقت گزرا ہوگا جتنا وقت میں نے ماضی کے زمانے میں گزارا ہوگا؟

سوسن کہنے لگی۔

"یہ بات تمہیں محترم بزرگ نے بھی بتائی تھی۔ میں ایک بار پھر تمہیں بتائے دیتی ہوں۔ اگر تم ماضی کے زمانے میں سال دوسال یا تین سال گزارنے کے بعد اپنی دنیا میں واپس جاؤ گے تو وہاں زیادہ سے زیادہ ایک دن گزرا ہو گا۔ اگر ایک سال کے عرصے کے اندر اندر واپس جاؤ گے تو تمہاری دنیا کا صرف ایک یا زیادہ سے زیادہ ڈیڑھ منٹ گزرا ہو گا۔"

اونٹ ایک نپی تلی ست رفتار سے صحرا میں چلا جا رہا تھا۔ اس کے گلے میں بندھی ہوئی گھنٹی بڑے شیریں ترنم کے ساتھ بج رہی تھی۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے میں دن کے وقت کھلی آنکھوں سے کوئی سپنا دیکھ رہا ہوں۔ ساری دوپہر صحرا میں سفر کرتے گزر گئی۔ دن ڈھل رہا تھا۔ دھوپ کی تمازت کم ہونے لگی تھی کہ دور کسی شہر کی فصیل نظر آئی۔ سوسن نے اس طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"یہ سمیریوں کے بادشاہ الحانا کا آباد کیا ہوا شہر لگاش ہے۔ ہم رات اس شہر کی کارواں سرائے میں گزاریں گے اور صبح اپنی منزل کو روانہ ہوں گے۔"

شہر لگاش کی فصیل پختہ اینٹوں کی تھی اور بہت بلند تھی شہر کے صدر دروازے کی دونوں جانب مٹی اور پتھر کے بنے ہوئے جانوروں اور دیوی دیوتاؤں کے بت نصب تھے۔ ڈیوڑھی کی دیواروں پر چونے اور گچ سے گائے بھینسوں اور بیلوں کی رنگین تصویریں بنی ہوئی تھیں۔ لوگوں کا لباس ویسا ہی تھا جیسا میں نے اور سوسن نے پہن رکھا تھا۔ یعنی لمبے چغے۔ ہم شہر کے اندر داخل ہوئے تو میں نے اونچے اونچے مکانوں کے درمیان ایک سب سے اونچا مینار دیکھا۔ سوسن کہنے لگی۔

"یہ سمیریوں کا معبد ہے۔ یہاں دیوی دیوتاؤں کی پوجا ہوتی ہے۔ سمیری ہر شہر میں ایک اونچا مینار ضرور بناتے ہیں۔ جو ان کا معبد ہوتا ہے"

رات ہم نے ایک سرائے میں بسر کی۔ یہ سرائے ایک وسیع احاطے میں واقع تھی۔ احاطے کے تین اطراف چھوٹی کوٹھڑیاں بنی ہوئی تھیں۔ عورتوں کی رہائش کی کوٹھڑیاں

الگ تھیں۔ دوسرے دن ہم دوبارہ اپنے سفر پر روانہ ہو گئے۔ یہاں سوسن نے میرے لئے ایک دوسرا اونٹ لے لیا تھا۔ اب میں ایک الگ اونٹ پر بیٹھا سفر کر رہا تھا۔ وہ دن بھی صحرا کی ریتلی پتھریلی وادیوں اور ریت کے میدانوں میں سفر کرتے گزر گیا۔ جب سورج غروب ہو رہا تھا تو سوسن نے کہا۔

"ہم ان پہاڑیوں کے پاس آ گئے ہیں۔ جہاں ہمیں اللہ کے برگزیدہ بزرگ سے ملاقات کرنی ہے اور جس کے پاس تمہاری ناگہانی آفت اور بیماری کا علاج ہے۔ جب ہم بھوری اور سیاہ رنگ کی پہاڑیوں میں داخل ہوئے تو سورج غروب ہو گیا تھا اور صحرا میں غروب آفتاب کی نارنجی روشنی ریت کے ذروں کو چمکا رہی تھی۔ یہ عجیب منظر تھا۔ ایسا غروب آفتاب میں نے زندگی میں کبھی نہیں دیکھا تھا۔ ہم دو پہاڑیوں کے درمیان سے گزرنے کے بعد ایک چٹان کے سامنے آ کر رک گئے۔ سوسن نے کہا۔

"اللہ کا وہ نیک بندہ ہمیں یہیں ملے گا۔"

ہم اونٹوں سے اتر پڑے سوسن آگے آگے تھی۔ ایک جگہ چٹان میں قدرتی غار تھا۔ غار کے دہانے پر سرکنڈے اگے ہوئے تھے۔ سوسن نے وہاں کھڑے ہو کر بلند آواز میں کہا۔

"اے اللہ کے نیک بندے! ہماری طرف سے تمہیں سلام پہنچے۔ ہم بڑی دور سے تیری زیارت کو آئے ہیں۔ ہمیں اجازت دے کہ ہم تیری خدمت میں حاضر ہو سکیں۔"

سوسن نے تین بار یہ جملے بلند آواز سے دہرائے مگر غار میں سے کوئی جواب نہ ملا۔ وہ کہنے لگی۔

"وہ بزرگ غار میں نہیں ہے شاید"

میں نے کہا۔

"اندر چل کر دیکھتے ہیں"

وہ بولی۔

"نہیں یہ بات ادب کے خلاف ہے۔ کسی کے گھر اس کی اجازت کے بغیر داخل

نہیں ہونا چاہئے۔ ہم یہاں بیٹھ کر ان کا انتظار کریں گے۔"

ہم وہیں اپنے اونٹوں کے پاس بیٹھ گئے۔ تھوڑی دیر ہی گزری تھی کہ ایک طرف سے روشنی ہمیں اپنی طرف بڑھتی نظر آئی۔ ایک نوجوان سمیری ہاتھ میں مشعل روشن کئے ہمارے پاس آکر بولا۔

"کیا آپ لوگ روشن بزرگ سے ملنے آئے ہیں"

سوسن نے کہا۔

"ہاں بھائی۔ ہم ان روشن بزرگ ہی کی زیارت کو آئے ہیں۔"

نوجوان کہنے لگا۔

"وہ تمہیں نیپور شہر کی فصیل کے باہر ملیں گے"

یہ کہہ کر وہ جدھر سے آیا تھا اسی طرف چلا گیا۔ میں نے سوسن سے کہا۔

"یہ نیپور شہر کہاں پر ہے؟"

وہ بولی۔

"قریب ہی ہے۔ یہ سمیریوں کے بادشاہ کا پہلا پائے تخت ہے۔ یہاں بھی بادشاہ کا ایک محل ہے۔ چلو وہاں چلتے ہیں"

اس وقت رات ہو چکی تھی۔ ہم اونٹوں پر سوار ہو کر پہاڑی سلسلے سے نکل کر صحرا کی کھلی فضا میں آئے تو صحرا میں ہلکی ہلکی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ یہ روشنی آسمان پر چمکتے ستاروں کی روشنی تھی جو صحرائی ریت کے ذروں میں منعکس ہو رہی تھی۔ اس روز مجھے معلوم ہوا کہ صحرا میں رات کو کبھی اتنا اندھیرا نہیں ہوتا کہ آدمی سفر نہ کر سکے۔

ہم نے صحرا میں تھوڑی دور ہی سفر کیا تھا کہ دور سے ایک شہر کی فصیل کی روشنیاں نظر آنے لگیں۔ سوسن نے کہا۔

"یہ سمیریوں کے شہر نیپور کی روشنیاں ہیں۔"

جیسے جیسے ہم شہر کے قریب ہو رہے تھے۔ روشنیاں زیادہ صاف ہو رہی تھیں۔ شہر کی فصیل کے پاس ایک جگہ آگ کا الاؤ روشن تھا۔ وہاں کئی لوگ کھڑے تھے۔ ادھر سے کسی

انسان کے اونچی آواز میں بولنے کی بارعب آواز آرہی تھی۔ سوسن نے کہا۔

"ادھر چلو۔ روشن بزرگ لوگوں کو برائیوں سے توبہ کرنے کی تلقین کر رہے ہیں"

ہم بھی لوگوں کے ہجوم میں جا کر کھڑے ہو گئے۔

میں نے دیکھا کہ اونچے چبوترے پر ایک انتہائی خوبصورت انسان سیاہ چغہ پہنے کھڑا ہے۔ اس کا چہرہ الاؤ کی روشنی میں طلوع ہوتے سورج کی طرح چمک رہا ہے اس نے ایک ہاتھ اوپر اٹھا رکھا ہے۔ اور وہ آج سے چار ہزار برس قدیم سمیری زبان میں کہہ رہا ہے۔

"میں تمہیں ایک عظیم جلال و جمال والے پیغمبر کی دنیا میں تشریف لانے کی خوشخبری دیتا ہوں۔ وہ دنیا کا آخری نبی ﷺ ہوگا۔ اس کے بعد کوئی نبی کوئی پیغمبر نہیں آئے گا۔ اس عظیم المرتبت نبی ﷺ کی تشریف آوری کے ساتھ ہی دنیا میں نبیوں' پیغمبروں اور رسولوں کی آمد کا سلسلہ بند ہو جائے گا۔ یہ نبی آخر الزمان ہوگا۔ وہ اپنے ساتھ ایک مقدس کتاب قرآن پاک لائے گا۔ اس کتاب میں اللہ کا پاک کلام ہوگا۔ اس کتاب میں انسان کے واسطے ایک مکمل ضابطہ حیات ہوگا۔ اس روز اللہ کا دین مکمل ہو جائے گا۔ تم نہیں ہوگے مگر تمہاری اولادوں کی اولادیں اور ان کی نسلیں قرآن پاک کی تعلیمات پر عمل کر کے فلاح پائیں گی۔ یاد رکھو میں تمہیں اسی نبی آخر الزمان کی بشارت دینے آیا ہوں۔ جو سارے عالموں' ساری دنیاؤں کے لئے رحمت بن کر آئے گا۔ اے لوگو! برائیوں سے توبہ کرو۔ جو گناہ کرتا ہے اگر وہ دل سے توبہ کر لے تو اللہ اس کے گناہوں کو معاف کر دیتا ہے۔ اے اہل سمیر! میں اس نور کی روشنی دیکھ رہا ہوں جو رحمت اللعالمین بن کر ساری کائنات میں پھیلنے والی ہے۔ بتوں کی پوجا نہ کرو۔ ایک اللہ کی پرستش کرو۔ اپنے آپ کو گناہوں کی دلدل سے نکالو۔

اے سمیریوں کے بادشاہ! تو بھی سن۔ تو سب سے بڑا بت پرست ہے۔ تو نے اللہ کی توحید کو نہیں پہچانا۔ تو غریبوں پر ظلم کرتا ہے۔ بہت جلد تجھ پر اللہ کا عتاب نازل ہوگا۔

اس روشن بزرگ کی آواز میں ایسا جلال تھا کہ سننے والوں میں سے کوئی شخص ذرا سی بھی حرکت نہیں کر رہا تھا۔ جب روشن بزرگ نے اپنا وعظ ختم کیا تو اس کی نظر ہم پر

پڑی۔ اس نے میری طرف اشارہ کر کے مجھے اپنے قریب بلایا۔ میں اور سوسن اس کے قریب چلے آئے۔ روشن بزرگ کی آنکھوں میں نورانی چمک تھی۔ اس نے میری طرف غور سے دیکھا اور کہا۔

”تم مجھ سے زیادہ خوش نصیب ہو کہ تم نے اللہ کا پاک کلام پڑھا ہے۔ تم نے مسجدوں سے بلند ہونے والی اذان کی آوازیں سنی ہیں۔ اس سے زیادہ مجھے کچھ کہنے کی اجازت نہیں ہے۔ مگر تم اپنی غلطیوں کی وجہ سے ایک آفت میں پھنس چکے ہو۔ جاؤ یہاں سے جنوب میں دو پہاڑیاں ہیں۔ ان پہاڑیوں کے درمیان ایک ندی بہتی ہے۔ اس ندی کے کنارے تمہیں ایک جھونپڑے میں ایک بزرگ ملے گا۔ وہی تمہاری بیماری کا علاج کرے گا۔ اللہ تمہارا نگہبان ہو“

سوسن نے میرا بازو پکڑ کر مجھے پیچھے کر لیا۔ اتنے میں شہر کے صدر دروازے کی جانب سے گھوڑ سواروں کا ایک دستہ نمودار ہوا۔ یہ بادشاہ کے سپاہی تھے۔ ان کو دیکھ کر لوگ ادھر ادھر دوڑ پڑے مگر روشن بزرگ اپنی جگہ پر چٹان کی طرح کھڑا رہا۔ سپاہیوں نے آتے ہی روشن بزرگ کو زنجیریں ڈال دیں اور اپنے ساتھ لے کر شہر پناہ کے دروازے کی طرف چل دیئے۔ میں نے سوسن سے کہا۔

”سوسن! میں اللہ کے اس برگزیدہ بندے کو بادشاہ کے سپاہیوں سے چھڑانا چاہتا ہوں۔ میرے پاس بال پوائنٹ پنسل کا مہلک ہتھیار موجود ہے۔ میں ان سارے سپاہیوں کو ڈھیر کر سکتا ہوں“

سوسن نے مجھے آگے بڑھنے سے روک دیا۔

”تم ایسا نہیں کر سکتے۔ یہ روشن بزرگ بھی تمہیں ایسا کرنے کی اجازت نہیں دے گا۔ روشن بزرگ اگر چاہے تو ان سپاہیوں کو پتھر کے بت بنا کر فرار ہو سکتا ہے مگر اللہ کے برگزیدہ بندے اللہ کی مشیت میں کبھی دخل نہیں دیتے۔ یہ سب کچھ مشیت الٰہی کے اشارے سے ہو رہا ہے۔ اور اللہ کے نیک بندے مشیت الٰہی کے آگے سر جھکا دیتے ہیں۔ چلو ہم اس بزرگ کے پاس چلتے ہیں جس کے پاس جانے کی ہمیں ہدایت کی گئی

ہے۔“

ہم اپنے اپنے اونٹ پر سوار ہوئے اور جنوب کی طرف چل دیئے۔ ہم ویران پہاڑیوں اور صحرا میں آدھی رات تک سفر کرتے رہے۔ آخر ہمیں ایک صحرا میں دو پہاڑیاں دکھائی دیں۔ ان کے قریب جا کر دیکھا کہ ان کے درمیان ایک ندی بہہ رہی تھی۔ یہ کوئی صحرائی چشمہ تھا جو پہاڑیوں سے نکل کر ایک طرف بہہ رہا تھا۔ صحرائی رات ستاروں کی روشنی میں نیم روشن تھی۔ مجھے ندی کا شفاف پانی بہتا نظر آ رہا تھا۔ سوسن نے کہا۔

”ندی کے ساتھ ساتھ ہم آگے جائیں گے۔“

ذرا آگے گئے تو ہمیں ایک چٹان کے سائے میں جھونپڑا دکھائی دیا۔ ہم اونٹوں سے اتر پڑے۔ قریب گئے تو جھونپڑے کا دروازہ بند پایا۔ یہ جھونپڑا کھجور اور زیتون کی شاخوں کا بنا ہوا تھا۔ اس کی درزوں میں سے ہلکی ہلکی روشنی کی کرنیں باہر آ رہی تھیں۔ میں ان درزوں میں سے جھونپڑی میں جھانکنا چاہتا تھا مگر سوسن نے مجھے منع کیا۔ ہم جھونپڑی کے دروازے کے پاس ہی ایک طرف ہو کر بیٹھ گئے۔ رات پر گہرا سکوت طاری تھا۔ دونوں جانب پہاڑیاں خاموش سر اٹھائے کھڑی تھیں۔ آسمان پر لاکھوں کروڑوں ستارے جھلملا رہے تھے۔ ندی کا پانی سکون سے بہہ رہا تھا۔ کچھ دیر بعد جھونپڑی کے اندر سے بزرگ کی آواز آئی۔

”تمہیں میرے بھائی نے میرے پاس بھیجا ہے اندر آ جاؤ۔ دروازہ کھلا ہے۔“

ہم جھونپڑی میں داخل ہو گئے۔ ہم نے ایک پر سکون روشن چہرے والے بزرگ کو دیکھا جو شیر کی کھال کی چٹائی پر مراقبے کی حالت میں بیٹھے تھے۔ دیا روشن تھا۔ ہم نے اس بزرگ کی تعظیم کی اور ادب سے ایک طرف ہو کر بیٹھ گئے۔ بزرگ نے ایک لمحے کی خاموشی کے بعد میری طرف آنکھیں اٹھا کر دیکھا۔ ان کی آنکھوں سے مجھے روشنی کی کرنیں پھوٹتی معلوم ہوئیں۔ انہوں نے میرا نام لے کر کہا۔

”تم پر جو آفت نازل ہوئی ہے وہ تمہاری اپنی کوتاہیوں اور گناہ کے خیالات کی وجہ

سے نازل ہوئی ہے۔ چونکہ تم نے اللہ کے حضور سر جھکا کر اپنے گناہوں سے توبہ کرلی ہے اور آئندہ کبھی گناہ نہ کرنے کا عہد کیا ہے اس لئے اللہ نے تمہارے گناہ معاف کر دیئے ہیں۔ اور تمہیں میرے پاس بھیجا ہے کہ میں اللہ کے حکم سے تمہاری بیماری کا علاج کروں۔ میرے قریب آؤ۔"

میں اٹھ کر بزرگ کے قدموں میں سر جھکا کر بیٹھ گیا۔ بزرگ نے میرے سر پر پانچ بار ہاتھ پھیرا اور کہا۔

"شفا اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ اللہ نے تمہیں شفا عطا کر دی ہے۔ اب تم پر کسی بدروح کا اثر نہیں ہو گا۔ لیکن اگر تم اپنے دل میں گناہ کا خیال بھی لائے تو ایک بار پھر اس مصیبت میں پھنس جاؤ گے۔"

میں خاموش بیٹھا رہا۔ سوسن بھی خاموش مودب ہو کر بیٹھی تھی۔ بزرگ نے فرمایا۔

"تم اس زمانے سے نکل کر آرہے ہو۔ جہاں اسلام کا نور دنیا کے کونے کونے کو منور کر رہا ہے۔ اسلام کے دشمن بھی اپنی سازشوں میں لگے ہوئے ہیں۔ یاد رکھو پاکستان اسلام کا قلعہ ہے۔ اس قلعے کی حفاظت کرنا اور اس کو مضبوط سے مضبوط تر بنانا تم لوگوں کا فرض ہے میں دیکھ رہا ہوں کہ پاکستان کا دشمن ملک پاکستان پر حملہ کرنے کی تیاریوں میں مصروف ہے۔ تمہارا واپس جانا بہت ضروری ہے۔ اس لئے کہ تم لشکر اسلام کے مجاہد ہو۔"

ہم خاموش بیٹھے رہے۔ سوسن نے مجھے سمجھا دیا تھا کہ بزرگ کو کوئی سوال نہ کرنا۔ تمہارے دل میں جو سوال پیدا ہو گا اس کا جواب خود ہی بزرگ تمہیں دے دیں گے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ میرے دل میں ایک سوال پیدا ہو چکا تھا کہ بزرگ نے فرمایا۔

"تمہیں یہ کہا گیا تھا کہ یہاں سے واپس جاؤ گے تو تمہیں ایک زبردست طاقت مل چکی ہو گی۔ جس سے تم دشمنان اسلام کا مقابلہ کر سکو گے۔ میں وہ طاقت تمہیں دیتا ہوں۔ سنو! یہ طاقت کسی جادو یا طلسم کی طاقت نہیں ہے۔ یہ طاقت ایمان کی طاقت ہے۔ اپنے اللہ پر یقین رکھنے کی طاقت ہے۔ اپنے دل سے اللہ کے سوا سب کا خیال نکال دو تمہارا ہر کام ہر فعل اللہ اور صرف اللہ کی خوشنودی کے لئے ہونا چاہئے۔ تمہارا اٹھنا' بیٹھنا' کھانا

پینا' کاروبار کرنا' بھائی بہنوں اپنے بچوں سے محبت کرنا صرف اللہ اور اللہ کے لئے ہونا چاہئے۔ جب تم اس راستے پر چل پڑو گے اور اللہ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑ لو گے تو پھر تمہارے اندر ایک ایسی طاقت پیدا ہو جائے گی جو تمہیں ہر میدان میں دشمنوں کے مقابلے میں کامیاب و سرخ رو کرے گی۔ پھر تم اللہ کے لئے زندہ رہو گے اور اللہ کے لئے جان دو گے۔ پھر تم زندہ رہو گے تو غازی ہو گے' مرو گے تو شہادت کا رتبہ پاؤ گے اور جنت میں داخل ہو گے۔ یہی وہ طاقت ہے یہی وہ قوت ہے جو میں تمہارے اندر پیدا کرنا چاہتا ہوں۔ میں اسی طاقت کو اپنی ابتدائی شکل میں تمہارے سینے میں دیکھ رہا ہوں۔ لیکن یہ ابھی ٹمٹماتے چراغ کی روشنی کی مانند ہے۔ میں اسے کڑکتی گرجتی بجلی میں بدل دینا چاہتا ہوں تاکہ یہ بجلی دشمنان اسلام کے سروں پر خدائی قہر بن کر ٹوٹے۔"

یہ کہہ کر اس بزرگ نے میری کمر پر آہستہ سے ہاتھ پھیرا اور کہا۔

"یہ تمہاری ہی طاقت ہے جو میں تمہیں دے رہا ہوں۔ میں اپنی طرف سے تمہیں کچھ نہیں دے رہا۔ میں نے صرف اتنا کیا ہے کہ تمہارے سینے میں ایمان کی جو حرارت تھی اسے تڑپتی ہوئی کڑکتی ہوئی بجلیوں میں تبدیل کر دیا ہے۔ اب تمہیں واپس جانا ہو گا۔ یہ کڑکتی بجلیاں تمہارے جذبہ ایمانی کی صورت میں ظاہر ہو کر تمہیں دشمن کے آگے سیسہ پلائی دیوار بنا دیں گی۔ میرے پاس ایسا کوئی جادو نہیں ہے جو دشمن کی گولی کو تمہارے سینے پر لگنے سے روک دے۔ میں تمہیں وہ جذبہ ایمانی دے رہا ہوں جو تمہیں اللہ کی راہ میں اللہ کے دشمنوں سے غازی بن کر جنگ کرنا اور ان پر فتح حاصل کرنا اور اللہ کی راہ میں شہید ہو کر اسلام کے پرچم کو سربلند رکھنا سکھائے گا۔ بس یہی تمہاری سب سے بڑی طاقت سب سے بڑی قوت ہو گی۔"

بزرگ نے اپنا ہاتھ میرے کندھے پر سے اٹھا لیا اور کہا۔

"جاؤ۔ تمہارے ملک کی سرحدوں پر میدان کارزار گرم ہونے والا ہے۔ اسلام کے دشمنوں نے اسلام کے قلعے پاکستان پر حملے کی سب تیاریاں مکمل کرلی ہیں۔ جاؤ تم بھی ان غازیوں مجاہدوں کی صفوں میں جا کر شامل ہو جاؤ جو وطن پاک کی سرحدوں پر سیسہ پلائی

چٹانیں بن کر دشمن کے مذموم ارادوں کو خاک وخون میں ملانے کے لئے تیار کھڑے ہیں۔"

بزرگ نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ جیسے مراقبے میں چلے گئے ہوں۔ سوسن نے آہستہ سے مجھے پیچھے کھینچا۔ ہم دونوں بڑے ادب سے اٹھے اور بزرگ کو سلام کر کے جھونپڑی سے باہر آگئے۔ اس وقت مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میرے سینے میں ایک زبردست طاقت پیدا ہو چکی ہے۔ ایک ایسی طاقت جو پہاڑوں سے ٹکرا سکتی تھی۔ سمندروں کا سینہ چیر سکتی تھی۔ اور کفار کے ہر حملے کو تہ تیغ کر سکتی تھی۔ میں نے بلند آواز سے کلمہ شریف پڑھا اور سوسن سے کہا۔

"میری بہن! میں یہیں سے اپنے دشمنوں کے ملک میں واپس جارہا ہوں تاکہ وطن پاک پر حملے کی تیاریاں کرنے والے دشمن کی منصوبہ بندیوں پر اللہ کے شیر دل کمانڈو کی طرح حملہ آور ہو سکوں۔"

سوسن نے کہا۔

"اللہ تمہارا حامی وناصر ہو میرے بھائی"

میں نے چمڑے کے تھیلے میں سے اپنی پتلون اور قمیض اور بوٹ نکالے۔ سمیریوں کے زمانے کے کپڑے اتار کر پتلون قمیض بوٹ پہنے اور سوسن سے کہا۔

"سوسن بہن! حق وباطل کے اس معرکے میں اگر زندہ رہا تو ایک بار تمہیں ملنے ضرور آؤں گا۔"

یہ کہہ کر میں نے آسمان پر چمکتے ہوئے ستاروں کی طرف دیکھا آنکھیں بند کر کے خدا کو یاد کیا۔ اور کلمہ پاک کو پانچ مرتبہ پڑھ کر اپنے سینے پر پھونک ماری۔

مجھے ایسے محسوس ہوا جیسے میرا جسم ہوا کی طرح ہلکا ہو گیا ہے۔ یہ احساس ایک سیکنڈ سے بھی بہت کم عرصے تک رہا۔ پھر جب میں نے آنکھیں کھولیں تو میں نے اپنے آپ کو نجیب آباد کے پتھرگڑھ قلعے کی سرنگ میں پایا۔ میں سرنگ کی دیوار کے پاس کھڑا تھا میری پشت دیوار کی طرف تھی جہاں ہلکی ہلکی روشنی جھلک رہی تھی۔ اس روشنی میں اس

دروازے کی محراب نظر آرہی تھی جس میں سے گزر کر میں ماضی کے زمانے میں داخل ہوا تھا۔ میرے دیکھتے دیکھتے دروازے کی محراب غائب ہو گئی اور دیوار پر جو ہلکی روشنی نمایاں تھی وہ بھی ختم ہو گئی۔ اب سرنگ میں گھپ اندھیرا چھا گیا تھا۔ میں دیوار پر ہاتھ رکھ کر واپس چل پڑا۔ سرنگ کے راستے کا مجھے اندازہ تھا۔ میں یہیں سے محترم بزرگ کے ساتھ گزر کر محرابی دروازے تک آیا تھا۔ مگر اب محترم بزرگ وہاں پر موجود نہیں تھے۔

مجھے احساس تھا کہ اگرچہ میں ماضی کے زمانے میں دو راتیں گزار چکا ہوں لیکن ہندوستان کے شہر نجیب آباد میں وہی وقت ہو گا جس وقت میں سرنگ میں داخل ہوا تھا۔ یعنی وہاں ابھی آدھی رات ہی ہو گی۔ میں سرنگ سے باہر نکل آیا۔ اب میں نجیب الدولہ شہید کے بنائے ہوئے تاریخی پتھرگڑھ قلعے کی تیسری برجی کے نیچے بند دروازے کے پاس کھڑا تھا۔ یہ دروازہ اس وقت کھلا تھا جب میں سرنگ سے باہر نکلا تھا۔ اب یہ دوبارہ بند ہو گیا تھا۔ رات اسی طرح تاریک اور دہشت ناک تھی جس طرح میں اسے چھوڑ کر ماضی کے زمانے میں گیا تھا۔ شاید ایک سیکنڈ کا بھی فرق نہیں پڑا تھا۔ اب میرا کمانڈو مشن بھارت کی پاکستان کے خلاف جنگی تیاریوں کی سراغ رسانی کرنا اور اس کی پوری پوری رپورٹیں سری نگر کمانڈو شیروان کو پہنچانا تھا تاکہ دشمن کی تیاریوں سے پوری طرح باخبر رہا جائے۔ یہ تمام رپورٹیں حاصل کرنے کا اب میرے پاس کوئی خفیہ ذریعہ نہیں رہا تھا۔ اگر میں ملٹری انٹیلی جینس کے میجر شرت دیوان کے ساتھ ہوتا تو یہ ساری سیکرٹ رپورٹیں میں بڑی آسانی سے حاصل کر کے کمانڈو شیروان کو پہنچا سکتا تھا۔ مگر یہ ذریعہ مجھ سے چھن گیا تھا۔

میں نے پتلون کی جیب میں ہاتھ ڈال کر دیکھا۔ بال پوائنٹ پنسل والا مہلک ہتھیار میرے ساتھ ہی آیا تھا۔ اس وقت یہی ایک کام کی چیز میرے پاس تھی۔ میں وہیں قلعہ کی برجی کے نیچے اندھیرے میں بیٹھ گیا اور سوچنے لگا کہ اب مجھے کیا کرنا چاہئے۔ شہر نجیب آباد میں میرے پکڑے جانے کا شدید خطرہ تھا۔ میں ایک خطرناک کشمیری کمانڈو تھا۔ میں نہ

صرف یہ کہ نجیب آباد کے پولیس ہیڈ کوارٹر سے فرار ہی ہوا تھا بلکہ میں نے وہاں دو سپاہیوں کو ہلاک بھی کر دیا تھا۔ دن کی روشنی میں اس شہر سے نکلنا ناممکن تھا۔ اتنا بڑا شہر بھی نہیں تھا کہ میں کہیں زیادہ دیر تک چھپا رہ سکتا۔ میرے پاس ضائع کرنے کے لئے وقت بھی نہیں تھا۔ ہندوستان کسی وقت بھی پاکستان اور آزاد کشمیر پر حملہ کر سکتا تھا۔ مجھے اس حملے کے خفیہ پلان کی زیادہ سے زیادہ معلومات چاہئے تھیں۔ آخر میں نے یہی فیصلہ کیا کہ میں کمانڈو شیروان کے پاس جاتا ہوں۔ اس سے اس مسئلے پر مشورہ کرنا ضروری ہے۔ ہو سکتا ہے وہ کوئی ایسا ذریعہ بتا دے جس کی مدد سے میں بھارت کے پاکستان دشمن فوجی پلان کا کچھ سراغ لگا سکوں۔ میری جیب میں ایک پیسہ بھی نہیں تھا۔

آخر میں نے یہی فیصلہ کیا کہ مجھے نجیب آباد سے صبح کی روشنی پھیلنے سے پہلے پہلے دلی کی طرف نکل جانا چاہئے۔ اس کے دو ہی طریقے تھے۔ ایک طریقہ تو یہ تھا کہ میں ریلوے سٹیشن پر جا کر دلی کی طرف جانے والی جو بھی گاڑی ملے اس میں بیٹھ جاؤں۔ اس میں ہر لمحہ میرے پکڑے جانے کا خطرہ تھا۔ ریلوے سٹیشن کو پولیس نے ضرور محاصرے میں لے رکھا ہوگا اور زبردست چیکنگ ہو رہی ہوگی۔ نجیب آباد کی پولیس میری شکل سے واقف ہو چکی تھی۔ میں ایک سیکنڈ میں پہچانا جا سکتا تھا۔ دوسری صورت یہ تھی کہ شہر سے جو سڑک شمال کی طرف جاتی ہو اس سے کچھ فاصلے پر کھیتوں وغیرہ میں چلنا شروع کر دوں۔ دن نکلنے تک میں شہر سے کافی دور جا چکا ہوں گا۔ سڑک پر تو پولیس کے چیک پوائنٹ ضرور ہوں گے مگر سڑک کے دائیں بائیں کھیتوں میں مجھے کوئی نہیں پوچھے گا۔ میں نے دوسری تجویز پر عمل کرنے کا فیصلہ کیا اور اٹھ کر قلعے کے تاریک صحن میں سے گزرتا ہوا قلعے کے عقبی بڑے اور ویران دروازے پر سے باہر چھوٹی سڑک پر آ گیا۔

ستاروں کو دیکھ کر میں نے شمال کی سمت کا اندازہ لگایا اور چھوٹی سڑک سے اتر کر درختوں اور جھاڑیوں میں سے ہو کر چلنا شروع کر دیا۔ رات آدھی گزر چکی تھی۔ سڑکیں اور راستے خالی تھے۔ کبھی کبھی دور شہر کو جانے والی سڑک پر سے کسی تانگے یا ٹرک کے گزرنے کی آواز آ جاتی تھی۔ میں صبح ہونے تک اسی طرح ایک شہر سے دوسرے شہر کو

ملانے والی بڑی شاہراہ سے کافی ہٹ کر کھیتوں میں چلتا رہا۔ نجیب آباد سے سری نگر تک پہنچنے کی روئیداد بیان کرنے کی میں ضرورت محسوس نہیں کرتا۔ میرا حلیہ کافی بدلا ہوا تھا۔ ڈاڑھی بڑھ آئی تھی۔ یعنی میری ٹھوڑی سے دو انچ نیچے تک آ گئی ہوئی تھی۔ اس طرح مونچھیں بھی بڑھ چکی تھیں۔ گردن پر بھی بال بڑھے ہوئے تھے۔ اس زمانے میں امریکہ اور یورپ سے ہپی لوگ بہت آیا کرتے تھے۔ ان کے بال بڑھے ہوئے ہوتے تھے۔ میں بھی ایک ہپی ہی لگتا تھا۔ کسی نہ کسی طرح میں سری نگر کمانڈو شیروان کی خفیہ کمین گاہ میں پہنچ گیا۔

میں نے کمانڈو شیروان کو اپنی گزشتہ کمانڈو سرگرمیوں کے بارے میں سب کچھ تفصیل کے ساتھ بتایا مگر اپنے ماضی کے سفر کے بارے میں ایک بات بھی نہ کی۔ کیونکہ سوسن نے مجھے ہدایت کی تھی کہ میں اس سلسلے میں کسی سے کوئی ذکر نہ کروں۔ وہاں مجھے کمانڈو اورنگ زیب نہ ملا۔ شیروان نے بتایا کہ بھارت نے اپنی ایک ڈویژن فوج آزاد کشمیر کی سرحد پر ڈیپلائے کر دی ہے۔

"تمہاری جو رپورٹیں ہمیں ملی ہیں وہ صحیح ثابت ہو رہی ہیں۔ بھارت پاکستان کے علاوہ آزاد کشمیر پر بھی حملہ کرنے والا ہے۔ کمانڈو اورنگ زیب اسی محاذ پر دوسرے کشمیری مجاہدین کے ساتھ گیا ہوا ہے۔"

میں نے کمانڈو شیروان سے کہا۔

"اب میجر شرت دیوان کا ذریعہ مجھ سے چھن گیا ہے۔ میں یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ بھارت آزاد کشمیر اور پاکستان پر کس تاریخ کو اور کتنی طاقت کے ساتھ حملے کرنے والا ہے۔ کیا راجدھانی دلی یا کسی دوسرے شہر میں اپنا کوئی ایسا آدمی ہے جو یہ سیکرٹ رپورٹ حاصل کرنے میں میری مدد کر سکے؟"

کمانڈو شیروان کچھ سوچ کر بولا۔

"ہاں۔ اپنا ایک آدمی ہے۔ مگر وہ تمہیں راجدھانی دلی میں نہیں بلکہ..... میں ملے گا۔"

کمانڈو شیروان نے مجھے شہر کا جو نام بتایا تھا وہ میں یہاں نہیں لکھوں گا۔ میں اپنے اس مجاہد جاسوس کا اصلی نام نہیں لکھوں گا جس کے پاس مجھے کمانڈو شیروان نے بھیجا تھا۔ یہ کشمیری مجاہد بھارت کے جس شہر میں اپنی سراغ رسانی کی ڈیوٹی دے رہا تھا اس شہر کا نام کچھ اور تھا۔ وہاں اس آدمی کا پیشہ بھی کچھ اور تھا۔ میں اس کی بجائے امرتسر شہر کا نام لکھوں گا۔ کشمیری مجاہد کا نام بھی فرضی بتاؤں گا۔ باقی سارے واقعات سارے کمانڈو آپریشن سچے اور اصلی ہوں گے۔ یوں سمجھ لیں کہ کمانڈو شیروان نے مجھے اپنے کشمیری مجاہد کا نام جہانگیر بتایا۔ شیروان نے رات کے وقت خفیہ ٹرانسمیٹر پر اپنے کشمیری مجاہد جاسوس جہانگیر سے کوڈ الفاظ میں بات کر کے میرے بارے میں بتایا اور کہا کہ جو خفیہ فوجی معلومات ہمیں درکار ہیں وہ ہر حالت میں مہیا کی جائیں۔ ٹرانسمیٹر آف کرنے کے بعد شیروان کہنے لگا۔

"اب تمہیں جہانگیر کے پاس امرتسر جانا ہوگا۔"

یہاں اس نے امرتسر شہر کی بجائے ایک دوسرے شہر کا نام لیا تھا وہ بھی یوں سمجھ لیں کہ بھارت کا ایک سرحدی شہر ہی تھا اور اپنے کشمیری مجاہد نے پاکستان کی طرف جانے والی سڑک پر ایک لاری اڈے کے پاس سٹیشنری اور پرانی کتابوں کی دکان کھول رکھی تھی۔ میں صرف ایک دن کمانڈو شیروان کی خفیہ کمین گاہ میں رہا۔ یہاں مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ مقبوضہ کشمیر میں بھی بھارت نے اپنی فوجوں میں اضافہ کر دیا ہے آزاد کشمیر کی سرحد پر بھی بھارتی فوجوں کا اجتماع دیکھا گیا تھا۔ میں نے شیروان کی کمین گاہ میں ہی نہا دھو کر کپڑے بدلے۔ یہ اگست کے مہینے کا وسط تھا۔ کشمیر میں بارشیں ہو رہی تھیں۔ شیروان نے مجھے ہدایت کرتے ہوئے کہا۔

"بال پوائنٹ پنسل پستول کی خاص حفاظت کرنا اسے اپنی جیبوں میں ہرگز نہ رکھنا۔ بلکہ بوٹ میں جرابوں کے اندر چھپا کر رکھنا۔"

اس نے مجھے کچھ بھارتی کرنسی بھی دی۔ میرے سر اور ڈاڑھی کے بڑھے ہوئے بال دیکھ کر بولا۔

"تمہارا یہ حلیہ ٹھیک ہے۔ بال نہ ترشوانا۔ اس حلیے میں تمہیں اتنی جلدی نہیں پہچانا جا سکتا۔ باقی تم خود بھی جانتے ہو کہ تمہیں ہر حالت میں دشمن کی نظروں سے محتاط ہو کر رہنا ہوگا۔"

جب رات ذرا گہری ہوئی تو میں خفیہ کمین گاہ سے نکل کر امرتسر کی طرف روانہ ہو گیا۔ یہاں بھی میں اپنے سفر کی تفصیل میں نہیں جاؤں گا۔ میں امرتسر پہنچ گیا۔ اس وقت شام ہو چکی تھی۔ اپنا کشمیری مجاہد جہانگیر دکان پر موجود تھا۔ میری اطلاع اسے مل چکی تھی۔ شیروان نے اسے میرا حلیہ بھی بتا دیا تھا۔ اس کے باوجود ہم نے آپس میں چند ایک خفیہ جملوں کا تبادلہ کیا جب ہم دونوں کو یقین ہو گیا کہ ہم وہی آدمی ہیں جن کو ایک دوسرے سے ملنا تھا تو جہانگیر نے الماری میں سے کتابیں نکال کر مجھے دکھانی شروع کر دیں۔ اس وقت دکان میں صرف ایک ہندو یا سکھ عورت ہی موجود تھی جو اپنی بچی کو کاپیاں دکھا رہی تھی۔ جب تک وہ عورت دکان میں موجود رہی میں ایک گاہک بن کر کتابوں کو دیکھتا رہا۔ جب وہ چلی گئی تو جہانگیر نے آہستہ سے کہا۔

"اسی سڑک پر کچھ دور آگے جگت سنیما ہے۔ فلم کا شو شروع ہونے والا ہے۔ گیلری کی ٹکٹ لے کر بیٹھ جاؤ۔ میں تمہیں وہیں ملوں گا۔"

میں یہ سن کر خاموشی سے دکان سے نکل گیا۔ سڑک پر دونوں جانب کھمبوں پر بتیاں روشن تھیں۔ دکانیں کھلی تھیں۔ یہاں دو روز پہلے بارش ہوئی ہوگی۔ سڑک کے کنارے کیچڑ تھا۔ کہیں تانگے کھڑے تھے۔ سائیکل رکشا والے بھی آ جا رہے تھے۔ زیادہ تر دکانیں سکھوں کی تھیں۔ ایک گوردوارہ بھی تھا جس کے باہر ایک سکھ پھولوں کی چھابڑی لگائے بیٹھا تھا۔ گوردوارے کے اندر سے شبد کیرتن کی ہلکی آوازیں آ رہی تھیں۔ فضا میں حبس تھا۔ سڑک کی دوسری طرف جگت سنیما ہاؤس کی عمارت تھی۔ شو شروع ہونے والا تھا۔ ایک جگہ انگریزی اور گورمکھی میں گیلری لکھا تھا۔ یہ ٹکٹ والی کھڑکی تھی۔ میں بھی سکھوں ہندوؤں کی قطار میں کھڑا ہو گیا۔ ٹکٹ لیا اور اوپر گیلری میں آ کر دروازے سے ذرا ہٹ کر ایک جگہ بیٹھ گیا۔ ہال میں روشنی ہو رہی تھی۔ کافی لوگ بیٹھے تھے۔ میں دیوار

کے پاس بیٹھا تھا۔ میرے اوپر وہ چوکور سوراخ تھے جن میں سے فلم کی روشنی نے سکرین پر پڑنا تھا۔ تھوڑی دیر بعد گھنٹی بجی۔ ہال کی بتیاں بجھ گئیں اور فلم شروع ہو گئی۔ میری توجہ فلم کی طرف بالکل نہیں تھی۔ میں گیلری کے دروازے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ایک آدھ بار سکرین پر نگاہ ڈالی تو معلوم ہوا کہ ہندی کی فلم ہے اور اس میں ہیما مالنی بھی ہے۔

میں خاص طور پر ایسی جگہ بیٹھا تھا جہاں میرے آس پاس کوئی نہیں بیٹھا تھا۔ فلم شروع ہوئے آدھا گھنٹہ گزر گیا۔ تب گیلری کا پردہ ایک طرف ہٹا اور فلم کی ہلکی ہلکی سفید روشنی میں میں نے اپنے کشمیری مجاہد جہانگیر کو داخل ہوتے دیکھا۔ وہ دیوار کے ساتھ کھڑا ہو گیا اور گیلری کا جائزہ لینے لگا۔ پھر اس نے مجھے دیوار کے پاس بیٹھا دیکھ لیا اور میرے پاس آکر ساتھ والی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ اس نے آہستہ سے کہا۔

"تمہیں پورا یقین ہے کہ امرتسر میں داخل ہوتے وقت تمہارے پیچھے خفیہ پولیس والا نہیں تھا؟"

ہماری نگاہیں پردہ سکرین پر تھیں۔ میں نے کہا۔

"مجھے پورا یقین ہے"

جہانگیر نے آگے سے کوئی جواب نہ دیا۔ پھر اس نے کہا۔

"میں نے اپنے خفیہ ذریعوں سے ایک دن پہلے وہ معلومات حاصل کر لی تھیں جن کے بارے میں کمانڈو شیروان نے مجھ سے بات کی تھی۔ میں یہ تمام خفیہ فوجی معلومات لے کر خود شیروان کے پاس جانے والا تھا۔ اچھا ہوا کہ تم آگئے۔"

میں نے آہستہ سے کہا۔

"وہ معلومات کیا ہیں؟"

جہانگیر نے دھیمی آواز میں کہا۔

"بھارت نے آزاد کشمیر اور پاکستان پر حملہ کرنے کا پورا پلان بنا لیا ہے۔ سب سے پہلے آزاد کشمیر پر حملہ کیا جائے گا۔ بھارت کے ناپاک عزائم یہ ہیں کہ زبردست فوجی سازو سامان اور زیادہ نفری کے ذریعے آزاد کشمیر پر قبضہ کر لیا جائے۔ اس کے فوراً بعد پاکستان پر

واہگہ اور برکی کی جانب سے بیک وقت یلغار کر دی جائے اور لاہور قبضے میں لے لیا جائے۔"

میں نے جہانگیر سے پوچھا۔

"حملے کی تاریخ اور وقت کونسا مقرر ہوا ہے؟"

وہ بولا۔

"یہ سیکرٹ ہمارے آدمیوں کو معلوم نہیں ہو سکا۔ بھارتی فوجی ہائی کمانڈ نے حملے کی تاریخ اور وقت کو بے حد خفیہ رکھا ہوا ہے۔ اس کے متعلق جہاں تک میری اطلاعات کا تعلق ہے سوائے دو ایک بھارتی جرنیلوں کی اور کسی کو کچھ معلوم نہیں۔ اس وقت واہگہ اٹاری سیکٹر میں بھارت کی ایک ڈویژن (15 انفنٹری) پوری ٹینک رجمنٹ کے ساتھ موجود ہے۔ ایک ڈویژن فوج بمع ٹینک رجمنٹ امرتسر سے ذرا پیچھے پہنچ چکی ہے۔ ان کی مدد اور کمک کے لئے پیچھے ایک ماؤنٹین ڈویژن نمبر 23 تین ٹینک رجمنٹوں کے ساتھ امرتسر کے آس پاس ریزرو میں پابرکاب ہے۔ ان ڈویژنوں کے ساتھ توپ خانہ بھی ہے۔"

ایک آدمی ہم سے آگے تین قطاریں چھوڑ کر کرسیوں کے درمیان سے گزر رہا تھا۔ جہانگیر چپ ہو گیا۔ جب وہ آدمی چلا گیا تو جہانگیر کہنے لگا۔

"دشمن تین گنا زیادہ طاقت اور نفری سے پاکستان پر حملہ کرنے والا ہے۔ اللہ پاکستان کو اپنی حفاظت میں رکھے۔ پاکستان ہماری امیدوں کا مرکز ہی نہیں عالم اسلام کا قلعہ بھی ہے۔ اسے ہر حالت میں قائم ودائم رہنا چاہیئے۔"

میں نے کہا۔

"فکر کرنے کی ضرورت نہیں جہانگیر۔ پاکستان قائم ودائم رہنے کے لئے بنا ہے اور انشاء اللہ ہمیشہ سلامت رہے گا۔ ہماری پاک فوج کے شیر دل جوان اور افسر سیسہ پلائی دیوار بن کر دشمن کا سر توڑ دیں گے۔ یقینی طور پر یہ فوجی رپورٹیں ان تک بھی پہنچ گئی ہوں گی اور پاکستان کی ڈیفنس لائن پر ایک ایک جوان دشمن کے ناپاک عزائم خاک میں ملانے کے لئے سینہ سپر ہو کر الرٹ ہو چکا ہوگا۔ یہ کفر واسلام کا معرکہ ہے اور انشاء اللہ

فتح اسلام کی ہوگی۔"

"انشاء اللہ" جہانگیر نے میری تائید کی۔

میں نے جہانگیر سے کہا۔

"امرتسر میں بھارت جو ایک ڈویژن فوج ٹینک رجمنٹ کے ساتھ لایا ہے وہ یہاں پر کس جگہ مقیم ہے۔ کیا یہ معلوم ہو سکتا ہے؟"

جہانگیر کہنے لگا۔

"یہ کوئی ایسی چھپی ہوئی بات نہیں ہے۔ ایک ڈویژن فوج بہت بڑی فوج ہوتی ہے۔ اس فوج نے امرتسر سے ذرا پیچھے ریلوے لائن کے پاس ایک میدان میں عارضی چھاؤنی ڈال رکھی ہے۔ مگر اس طرف جانے کی کسی کو اجازت نہیں ہے۔"

میں نے کہا۔

"اس وقت ایک محب وطن کمانڈو کی حیثیت سے میرا فرض ہے کہ دشمن کی فوجی طاقت کو جتنا نقصان پہنچا سکتا ہوں پہنچاؤں۔ میں دشمن کے اس فوجی مرکز میں شب خون مار کر اس کی ٹینک فورس کو برباد کرنا چاہتا ہوں۔"

جہانگیر بولا۔

"میں تمہیں اس جگہ کا پورا نقشہ سمجھا دوں گا۔ جہاں اس وقت بھارت نے اپنی انفنٹری ڈویژن ٹینک رجمنٹ کے ساتھ رکھی ہوئی ہے۔"

فلم ابھی ختم نہیں ہوئی تھی کہ جہانگیر مجھے سینما ہال سے نکال کر اندھیرے غیر آباد علاقے میں سے گزار کر اپنے مکان پر لے گیا۔ یہ آبادی کے کونے پر ایک کوٹھڑی ایک چھوٹے سے صحن والا مکان تھا جہاں جہانگیر جموں کے ایک عام محنت کش مسلمان دکاندار کی حیثیت سے عرصہ آٹھ سال سے مقیم تھا۔ اس نے مجھے بھارتی فوجی کیمپ کا پورا محل وقوع سمجھا دیا۔ میں دوسرے دن جہانگیر کے گھر میں ہی چھپ کر کمانڈو ایکشن کی منصوبہ بندی کرتا رہا۔ اس دوران جہانگیر نے یہ بھی معلوم کر لیا تھا کہ بھارتی فوجی ڈویژن کے اس عارضی کیمپ میں ٹینک رجمنٹ کے ٹینک کس طرف کیمو فلاج کر کے رکھے گئے ہیں۔

نقشے کی مدد سے اس نے مجھے ساری لوکیشن اور جگہ سمجھا دی بال پوائنٹ پستول تو پہلے ہی سے میرے پاس تھا۔ جہانگیر کی مدد سے میں نے چاکلیٹ کی چھ ٹکیوں کی شکل میں انتہائی طاقتور اور زبردست دھماکہ خیز ٹائم بم بھی تیار کر لئے۔ یہ بم ہینڈ گرنیڈ کی طرح کے تھے مگر چھوٹی چوکور ٹکیوں کی طرح تھے۔ ان میں ایک کیل دبائی گئی تھی۔ اس کیل کو کھینچ کر ٹارگٹ پر پھینکنا تھا۔ یہ چھ کے چھ بم ٹینکوں کے جھمگھٹے میں مجھے دس پندرہ گز کے فاصلے سے پھینکنے تھے۔ اگر میں زبردست سیکورٹی میں سے نکل کر کسی طرح اس جگہ پہنچ جاتا ہوں جہاں بھارتی ٹینک رجمنٹ کے ٹینک کیمو فلاج کئے ہوئے تھے تو ان کو تباہ کرنا میرے لئے کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ سب سے مشکل مرحلہ ان ٹینکوں کے قریب پہنچنا تھا جس کے بارے میں مجھے معلوم تھا کہ وہاں اتنی زبردست سیکورٹی ہوگی کہ کوئی پرندہ بھی ادھر سے نہیں گزر سکتا ہوگا۔ لیکن مجھے بہرحال یہ ٹارگٹ مارنا تھا خواہ اس کے لئے مجھے اپنی جان کا نذرانہ کیوں نہ پیش کرنا پڑتا۔

سہ پہر کے وقت جہانگیر مجھے ٹارگٹ دکھانے کے لئے لے گیا۔ ہم ایک خاص سکیم پر عمل کرتے ہوئے ٹارگٹ تک پہنچے جو میں آپ کو نہیں بتاؤں گا۔ ریلوے لائن سے کوئی چھ سات سو گز کے فاصلے پر ایک جگہ کھیتوں میں بہت بڑا فوجی کیمپ لگا تھا۔ ہم ریلوے لائن کے اس طرف دھریک کے ایک درخت کے اوپر چڑھے ہوئے تھے۔ کیمپ کے اردگرد کانٹے دار تار کے گچھے پھیلا دیئے گئے تھے۔ چونکہ یہ عارضی کیمپ تھا اس لئے وہاں خاردار تاروں والی دیوار بنانے کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی تھی۔ ٹینک چھوٹی ٹکڑیوں کی شکل میں خاردار تاروں سے کافی پیچھے ہٹا کر درختوں کے نیچے کھڑے کئے گئے تھے۔ جہانگیر کہنے لگا۔

"تمہیں تار کاٹنے کے لئے پلاس ساتھ لے جانا ہوگا۔ اس کا انتظام ہو جائے گا"

میں نے سارا نقشہ ذہن میں اچھی طرح بٹھا لیا اور یہ بھی درخت پر اوپر کرتے ہوئے طے کر لیا کہ مجھے جنوب کی جانب کھیتوں میں سے رینگ کر خاردار تاروں تک پہنچنا ہوگا۔ اس وقت سورج ڈھلنے لگا تھا۔ ہم درخت سے اتر کر الگ الگ ہو گئے۔ اور الگ

الگ راستوں سے گھر پہنچے۔ اس رات مجھے اپنے مشن پر روانہ ہونا تھا۔ میں نے جہانگیر کو بتادیا تھا کہ اگر میں ٹارگٹ مارنے میں کامیاب ہوگیا تو واپس اس کے پاس نہیں آؤں گا بلکہ ادھر ہی سے کسی دوسرے شہر نکل جانے کی کوشش کروں گا۔ اور اگر خدانخواستہ پکڑا گیا تو میری زبان پر جہانگیر کا نام نہیں آئے گا۔

میں نے اپنے کمانڈو مشن کے لئے رات کے دو بجے کے بعد کا وقت طے کیا۔ یہ وقت ایسا ہوتا ہے کہ گارڈ ڈیوٹی پر کھڑے سپاہیوں پر بھی نیند کا غلبہ شروع ہو جاتا ہے۔ اس وقت ان سے تھوڑی بہت غفلت کی توقع کی جا سکتی تھی۔ ویسے کسی بھی ملک کا فوجی کیوں نہ ہو اس کی ٹریننگ اس طرح ہوئی ہوتی ہے کہ وہ اپنی ڈیوٹی پر کبھی غافل نہیں ہوتا۔ جہانگیر نے ایک چھوٹے سائز کا مگر بڑا مضبوط پلاس لا کر مجھے دے دیا تھا۔ میں نے دو تین لوہے کے تار کاٹ کر اس کا تجربہ بھی کر لیا تھا۔ جب رات کے ٹھیک دو بجے تو میں نے جہانگیر سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔

"دوست! اللہ کے حوالے۔ زندہ رہا تو کسی نہ کسی جگہ پھر ملاقات ہوگی۔ مرگیا تو میرا کہا سنا معاف کر دینا۔"

میں رات کی خاموشی اور تاریکی میں جہانگیر کے گھر سے نکل کر امرتسر کی اس آبادی کی طرف چل پڑا جس کا نام پہلے شریف پورہ ہوا کرتا تھا لیکن ہندوستان آزاد ہو جانے کے بعد وہاں ہندو سکھ شرنارتھی آگئے تھے اور انہوں نے اس کا نام سنگھ پورہ رکھ دیا تھا۔ راستے کا مجھے پتہ تھا۔ رات کے وقت بڑی سڑک پر چلنے کی بجائے میں ایک جگہ کھیتوں میں ہوتا ہوا ریلوے لائن پر آگیا۔ یہ ریلوے لائن امرتسر سے جالندھر انبالے دلی کی طرف جاتی تھی۔ رات تاریک تھی۔ ریلوے سٹیشن کی روشنیاں میرے پیچھے رہ گئی تھیں۔ بڑی سڑک پر جو جی ٹی روڈ تھی واہگہ بارڈر کی طرف جاتے مجھے دو تین فوجی ٹرک ملے تھے مگر ریلوے لائن پر کسی قسم کی ٹریفک نہیں تھی۔ آس پاس کوئی انسان نہیں تھا۔ کھیتوں پر اندھیرا اور رات کی خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ مجھے اس بات کی بڑی خوشی اور اطمینان تھا کہ جب سے میں ماضی کے زمانے میں روشن بزرگ کی زیارت کر کے آیا تھا میرے سر پر

سے چندریکا کی بدروح کا سایہ دور ہو چکا تھا۔ اس دوران کئی راتیں اور دن گزر گئے تھے مگر مجھ پر اندھے پن کا حملہ نہیں ہوا تھا۔ ایک لمحے کے لئے بھی میری آنکھوں کی بینائی نہیں گئی تھی۔ ایسی خطرناک اور ناگہانی بیماری سے نجات حاصل کر لینے کے بعد میرے حوصلے مزید بلند ہو گئے تھے۔

میں ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ چلتا گیا۔ راستے میں سگنل کے کھمبوں کے نیچے سے بھی گزرا جن کی سرخ بتیاں روشن تھیں۔ دو ریلوے پھاٹک عبور کئے راستے میں مجھے کوئی چوکیدار یا پولیس کا آدمی نہ ملا۔ آخر میں اس مقام کے قریب آگیا جہاں ریلوے لائن کی ایک جانب کچھ فاصلے پر پاکستان پر حملہ کرنے والی بھارتی انفنٹری ڈویژن پڑاؤ ڈالے ہوئے تھی۔ جیسا کہ میں بیان کر چکا ہوں۔ یہ بہت بڑا عارضی فوجی کیمپ تھا جہاں اتنی زیادہ نہیں لیکن کافی روشنی تھی۔ خاص طور پر کیمپ کے اردگرد جو کانٹے دار تار لگی تھی وہاں تھوڑا تھوڑا فاصلہ چھوڑ کر لکڑی کے کھمبوں پر بلب روشن تھے۔ میں کیمپ کے پہلو سے ہوتا ہوا ریلوے لائن پر آگے نکل گیا۔ کافی دور آگے جا کر میں ریلوے لائن سے اتر آیا۔ اب میں کھیتوں میں گھس گیا۔ جہاں سے مجھے فوجی کیمپ کی خاردار تاروں کے پاس جانا تھا۔ اس راستے کا تعین میں دن کے وقت کر چکا تھا۔ میں کوئی اناڑی آدمی نہیں تھا۔ ایک تربیت یافتہ کمانڈو تھا۔ اس سے پہلے کمانڈو ایکشن کر کے ایسے کئی ٹارگٹ اڑا چکا تھا۔ کھیت میں فصل زیادہ اونچی نہیں تھی میں جھک کر چل رہا تھا۔ ٹارگٹ کے قریب پہنچ کر میں بیٹھ گیا میں ایسی جگہ پر آیا تھا جو روشنی کے دو کھمبوں کے درمیان تھی۔ لیکن یہاں زیادہ اندھیرا نہیں تھا۔ تاروں کے گچھے صاف نظر آ رہے تھے اور اگر کسی گشتی پارٹی کے سپاہی ادھر آگئے تو میں انہیں دکھائی دے سکتا تھا۔ یہ ساری باتیں میرے ذہن میں تھیں۔ تار کاٹنے والا پلاس میرے ہاتھ میں تھا۔ خاردار باڑھ سے کچھ فاصلے پر مجھے درختوں کے نیچے چھ سات ٹینک بھی کیمو فلاج کی حالت میں نظر آ رہے تھے۔ میرا اور میرے ٹارگٹ یعنی بھارتی ٹینکوں کا فاصلہ میرے حساب سے زیادہ تھا اور اس بات کا کافی امکان تھا کہ اگر میں نے کیل کھینچ کر باری باری ان پر چاکلیٹ سائز کے گرنیڈ پھینکے تو وہ

راستے میں ہی پھٹ جائیں گے۔ چنانچہ مجھے تار کاٹ کر کم از کم پندرہ بیس قدم اندر کیمپ کے احاطے میں جانا تھا۔ میں کھیت کی مینڈھ کے پاس فصل میں چھپ کر کچھ دیر بیٹھا رہا۔ میں اس انتظار میں تھا کہ اگر کوئی فوجی پٹرول پارٹی یا کوئی گشت کرتا فوجی وہاں پر تعینات ہے تو وہ گزر جائے۔ جب مجھے وہاں بیٹھے چھ سات منٹ گزر گئے اور کوئی فوجی گشت لگاتا وہاں نہ آیا تو میں نے خاردار باڑھ کی طرف رینگنا شروع کر دیا۔ پلاس میرے سیدھے ہاتھ میں تھا۔ آہستہ آہستہ زمین پر رینگتا میں خاردار تاروں کے گچھے کے پاس پہنچ گیا۔ اب مجھے دیر نہیں کرنی تھی۔ میں لیٹے لیٹے تار کاٹنے لگا۔ میں تیسرا تار کاٹ رہا تھا کہ اچانک مجھے رائفل کا سیفٹی کیچ آگے کرنے کی آواز آئی۔ میں نے گردن اٹھا کر دیکھا ایک سکھ فوجی رائفل کی نالی کا رخ میرے سر کی طرف کئے فائر کرنے کی پوزیشن میں کھڑا تھا۔ اس نے مجھے زور سے ٹھڈا مار کر کہا۔

"ہاتھ اوپر اٹھالو اوئے"

خدا جانے یہ سکھ فوجی کب وہاں پہنچ گیا تھا۔ مجھے اس کی آہٹ تک نہیں آئی تھی۔ میں نے پلاس پھینک کر ہاتھ اوپر اٹھا لئے۔

اس کے بعد سنسنی خیز واقعات بھارت کے فرعون حصہ ہفتم

"کمانڈو اٹیک" میں پڑھیئے